قوتِ تعلیم

افکار و نظریات

مرتب:

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

©جملہ حقوق بحقِ مرتب محفوظ

یہ کتاب اردو اکیڈمی تلنگانہ اسٹیٹ کے جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی

QUWAT-E-TALEEM: AFKAR-O-NAZARYAT

Edited by

Maulana Dr. Md. Muhamid Hilal Azmi

Year of Edition 2019 **ISBN 00000000000**

499/-

☆ نام کتاب : قوت تعلیم۔افکارونظریات

☆ مرتب : مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

☆ صفحات : ۴۱۶

☆ طبع اول : ۲۰۱۹ء

☆ زیر اہتمام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

☆ طباعت : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

☆ قیمت : ۴۹۹ روپے

☆ رابطہ نمبر : 9392533661

☆ ای میل : muhamidhilal@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ ہدیٰ پبلیکیشن''، سول کورٹ، پرانی حویلی حیدرآباد

☆ دکن ٹریڈرس چارمینار حیدرآباد

☆ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ، حیدرآباد، تلنگانہ

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

ان علمی ادارے اور لوگوں کے نام
جو علمی نشر و اشاعت میں
سرگرداں ہیں

فہرست مقالات

نمبر شمار	عناوین	مقالہ نگار	صفحہ
۱	مقدمہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۸
۲	قوت تعلیم قرآن وسنت کی روشنی میں	مولانا ارشاد الحق مدنی	۳۲
۳	حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اوران کا نظریۂ تعلیم (۱۲۴۸ھ/ ۱۲۹۷ھ)	مفتی امانت علی قاسمی	۳۸
۴	مدارس کے نصاب تعلیم میں تجدید وتوسیع کی ضرورت	مولانا انصار احمد معروفی	۵۲
۵	اکابر دیوبند کا نظریۂ تعلیم	مولانا مفتی جمیل احمد نذیری	۶۲
۶	تعلیم کی ایک عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند	مولانا ڈاکٹر حمران احمد معروفی	۶۹
۷	تعلیم رسول اللہ کا فرض منصبی	مولانا ڈاکٹر رفیق احمد قاسمی	۷۴
۸	تعلیم برائے معاش یا تعلیم برائے تزکیہ	مولانا عبدالحنان مظہر قاسمی	۸۵
۹	مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات	مولانا محمد صادق مبارکپوری	۹۸

۱۰	مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نظریہ تعلیم	مولانا نسیم ظہیر اصلاحی	۱۰۴
۱۱	تعلیم کے بنیادی مقاصد	مولانا ولی اللہ مجیدی قاسمی	۱۱۸
۱۲	چیریا کوٹ کے علماء، ادبا اور محققین	پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی	۱۳۶
۱۳	قوت تعلیم اور طب یونانی	پروفیسر شہباز احمد	۱۶۵
۱۴	اللہ کا وجود الکمیا کی نظر میں	پروفیسر عبد الوہاب	۱۷۰
۱۵	فلسفہ تعلیم اور اسلام	ڈاکٹر ارشد جمیل	۱۷۴
۱۶	علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۱۷۹
۱۷	فاصلاتی طرز تعلیم اور طلباء مدارس	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	۱۹۲
۱۸	اصلاح معاشرہ اور ہومیوپیتھی	ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی	۲۰۱
۱۹	تعلیم مغربی مفکرین کی آراء کی روشنی میں	ڈاکٹر سراج احمد انصاری	۲۰۴
۲۰	قوت تعلیم ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر سمیہ تمکین	۲۰۹
۲۱	فارسی کی اخلاقی مثنویوں میں علم کی اہمیت وافادیت	ڈاکٹر عصمت جہاں	۲۱۳
۲۲	آزاد ہند میں طب یونانی کا تعلیمی منظر نامہ	حکیم شمیم ارشاد احمد اعظمی	۲۱۷
۲۳	ڈپٹی نذیر احمد کی نظر میں تعلیم نسواں	ڈاکٹر عرشیہ جبین	۲۲۴
۲۴	تعلیم اور خواتین پر سماجی موقف	ڈاکٹر غوثیہ بانو	۲۳۹
۲۵	جدید نظام تعلیم پر اقبال کے اعتراضات	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	۲۵۰
۲۶	جدید تعلیم اور مسلمان	ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ	۲۵۷
۲۷	تعلیم کی اہمیت حالی کی نظر میں	ڈاکٹر فریدہ تبسم	۲۶۴
۲۸	علم وحکمت مسلمانوں کی گم شدہ میراث، ایک لمحہ فکریہ	ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا	۲۷۰
۲۹	سرسید کا تعلیمی تصور	ڈاکٹر ناظر حسین خان علیگ	۲۷۶

۳۰	**Education is power.**	ثمینہ یاسمین	۲۸۳
۳۱	عہدوسطی میں تعلیمی سرگرمیاں، سرسید کی روشنی میں	آفرین بانو	۲۹۱
۳۲	ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت	ابوہریرہ یوسفی	۲۹۹
۳۳	جدید طریقہ تعلیم اور نبوی طریقہ تعلیم، ایک تقابلی مطالعہ	مولانا احمد نور عینی	۳۰۵
۳۴	امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات	انصار احمد	۳۱۰
۳۵	قوت تعلیم اور نسوانی تعلیم کی اہمیت	بشیر النساء	۳۱۶
۳۶	دل طبقات میں تعلیم کی صورت حال	پنکج کمار	۳۲۲
۳۷	تعلیم نسواں	ترنم شاہی	۳۲۹
۳۸	تعلیم وتعلم کے رہنما اصول سفرنامہ موسیٰؑ کے تناظر میں	جاوید اختر عمری	۳۳۳
۳۹	مدارس کے اساتذہ کی تربیت میں ہی ہماری ترقی اور بقا کا راز پنہاں	جرار احمد وافروز ظہیر	۳۳۹
۴۰	مسعود حسین خان کی علمی خدمات	رشدہ شاہین	۳۴۶
۴۱	ربندرناتھ ٹیگور کا نظریہ تعلیم بطور عالمی اخوات	شائستہ پروین وجرار احمد	۳۵۳
۴۲	رہبران قوم مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور تعلیم کے جہات	شبنم شمشاد	۳۵٦
۴۳	تعلیم کا اصل مقصد قرآن کی روشنی میں	محمد اعجاز احمد	۳٦۲
۴۴	سائنسی علوم کی ترقی میں ترجمے کا کردار	محمد طارق	۳٦٦
۴۵	احمد عبدالغفور عطار کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات	محمد عابد	۳۷۱

۴۶	علوم کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت میں ترجمے کا کردار	محمد عدنان	۳۷۶
۴۷	سرسید احمد خان کا نظریۂ تعلیم اور اس کی عصری معنویت	محمد فیروز خاں	۳۸۲
۴۸	امام احمد رضا خاں کی علمی خدمات ایک سرسری جائزہ	محمد منتظم	۳۹۱
۴۹	مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی	مہتاب عالم فیضانی	۳۹۸
۵۰	ہندستان میں تعلیم نسواں ایک جائزہ	نغمہ تبسم	۴۰۵
۵۱	فروغ تعلیم میں مدارس کا کردار	نور افشاں پروین	۴۱۴

مقدمہ

تمام تعریفیں اس اللہ رب العزت کے لیے ہیں کہ جس نے لفظ 'کُن' سے اس کائنات کی تخلیق کی ہے، وہی مالک الملک ہے توتی الملک ہے، تنزع الملک ہے، وہ ایسی ذات اقدس ہے کہ جس نے انسان کو سوچنے، سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے کی طاقت وصلاحیت دی ہے۔ انہیں صلاحیتوں کی بدولت انسان اس کائنات کا خلیفہ ہے اور ساری کائنات اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ سورۃ بقرہ آیت نمبر ۲۹ر میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَافِیْ الاَرْضِ جَمِیْعاً، ثُمَّ اسْتَوٰیٓ اِلَی السَّمَاءِ فَسَوّٰا هُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (ط)

وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے پیدا کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ان کو سات آسمانوں کی شکل میں ٹھیک ٹھیک بنا دیا۔ یعنی انسان کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ وہ کائنات کی جتنی چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، سب اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے۔

اس کائنات کو کس طرح استعمال کیا جائے اور کس طرح استعمال کرنے سے اس کائنات کا خالق و مالک خوش ہوگا۔ اس کے لیے اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے تین

چیزیں ایسی پیدا کی ہیں کہ جن سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ان میں سے ایک انسان کے حواس ہیں۔یعنی آنکھ، کان، ناک، منہ، زبان، ہاتھ، پاؤں اور دوسرے عقل ہیں۔

سورۃ نحل آیت نمبر ۷۸ رمیں باری تعالیٰ نے علم کے بالا ذرائع کو کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا، وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

اور اللہ نے تم کو نکالا تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور اسی نے دیئے تم کو کان اور آنکھیں اور دل تاکہ تم احسان مانو (ترجمہ شیخ الہند، ص: ۳۶۴ر۳۶۵)

جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ نے علم کے ذرائع کان، آنکھ، دل اور عقل وغیرہ دے کر انسان کو سمجھ بوجھ عطا فرمائی اور اسی کے ذریعہ وہ علمی ترقی کے زینے پر یکے بعد دیگرے چڑھتا جاتا ہے۔اب جتنی انسان کوشش کرتا ہے، اسے اتنا ہی مل جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لاکھوں نعمتوں کو اس کے تابع کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ عملی قوتوں میں ترقیات کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔اب یہ اس انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے منعم وخالق کا کس قدر شکر یہ ادا کرتا ہے اور اس کا احسان کتنا مانتا ہے۔وہ اپنی آنکھوں سے خدا کی قدرت صناعی دیکھتا ہے تو اسے دیکھنے میں بصیر یاد آجانا چاہئے، اسی طرح سننے اور جاننے میں علیم وخبیر وسمیع تک اسے پہنچنا چاہئے۔

علم کا تیسرا سب سے اہم ذریعہ وحی الٰہی ہے، اس وحی الٰہی سے پتہ چلتا ہے کہ علم انسان کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔بالا آیت میں پتہ چلتا ہے کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے اور جب جاتا ہے تو بھی وہ کچھ علم لے کر نہیں جاتا ہے، اس کی زندگی کے درمیانی حصے میں علم آیا اور چلا گیا۔

وحی الٰہی سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العزت کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ اللہ کی ہر صفات بے مثل ہے، ان صفات میں اللہ کی علمی صفات، جیسا کہ قرآن مقدس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے علم سے کائنات کی ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ آیتیں ملاحظہ فرمائیں کہ جس میں اللہ کی علمی طاقت وقدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

وهو بكل شيء عليم۔

اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (سورۃ بقرۃ، آیت: ۲۹۰، پارہ: ۱۰)

قال انی اعلم مالا تعلمون۔

اللہ نے فرمایا: کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ (۳۰)

والله عليم بالظالمين۔

اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۹۵۔ بقرۃ، پ:۱)

ان الله واسع عليم۔

بیشک اللہ وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔ (۱۱۵۔ بقرۃ، پ:۱)

انک انت السميع العليم۔

اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔ (۱۲۷۔ بقرۃ، پ:۱)

فان الله شاكر عليم۔

بھلائی کرنے والوں کا اللہ قدردان ہے اور خوب جاننے والا ہے۔ ۱۵۸۔ بقرۃ، پ:۲)

وماتفعلوا من خير فان الله به عليم۔

اور جو کچھ تم بھلائی کروگے اللہ کو اس کا علم ہے۔ (۲۱۵۔ بقرۃ، پ:۲)

والله يعلم وانتم لا تعلمون۔

حقیقی علم اللہ ہی کو ہے تم محض بے خبر ہو۔ (۲۱۶۔ بقرۃ، پ:۲)

فان اللہ علیم بالمفسدین۔

تو اللہ صحیح طور پر فسادیوں کو جاننے والا ہے۔(۶۳۔آل عمران،پ:۳)

وما اللہ بغافل عما تعلمون۔

اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔(۹۹۔آل عمران،پ:۴)

واللہ خبیر بما تعلمون۔

اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔(۱۵۳۔آل عمران،پ:۴)

واللہ علیم بذات الصدور۔

اور اللہ سینوں کے بھید سے آگاہ ہے۔(۱۵۴۔آل عمران،پ:۴)

ان اللہ کان علیما حکیما۔

بیشک اللہ علم والا حکمت والا ہے۔(۲۴۔سورۃ نساء،پ:۵)

ان اللہ کان بکل شئی علیما۔

یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔(۳۲۔سورۃ نساء،پ:۵)

ان اللہ کان علیما خبیرا۔

یقیناً اللہ تعالیٰ پورے علم والا اور پوری خبر رکھنے والا ہے۔(۳۵۔سورۃ نساء پ:۵)

وکفیٰ باللہ علیما۔

اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے۔(۷۰۔سورۃ نساء،پ:۵)

وکان اللہ علیما حکیما۔

اور اللہ بخوبی جاننے والا اور پوری حکمت والا ہے۔(۱۱۱۔سورۃ نساء،پ:۵)

فان اللہ کان بہ علیما۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ پوری طرح جاننے والا ہے۔(۱۲۷۔سورۃ نساء،پ:۵)

ان اللہ بکل شیء علیم۔

بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔(۱۱۵۔سورۃ

ان اللہ علیم خبیر۔

بیشک اللہ ہی پورے علم والا اور صحیح خبر رکھنے والا ہے۔(۳۴۔سورۃ

قل اللھم فاطر السمٰوٰت والارض علم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک فی ما کانوا فیہ یختلفون۔

آپ کہہ دیجیے کہ اے اللہ! آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے، چھپے کھلے کو جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان امور کا فیصلہ فرمائے گا، جن میں وہ الجھ رہے تھے۔(آیت:۴۶۔سورۃ:۳۹)

وان اللہ قد احاط بکل شیء علما۔

اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہ اعتبار علم گھیر رکھا ہے۔(آیت:۱۲۔سورۃ:۶۵)

مذکورہ بالا آیتوں کے حوالے اور معانی سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العزت ہی کو کامل علم ہے اور اسی علم وقدرت سے اللہ نے سبھی مخلوقات کو ہر اعتبار سے گھیر رکھا ہے، چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے میں اللہ کی علمی صفات کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے کیونکہ انسان کو اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، اب جس بھی انسان کو جس طرح کا بھی علم حاصل ہوگا اس سے اس کی دنیا اور آخرت میں سرفرازی ہوگی۔

سارے انسانوں کا سلسلہ نسب آدم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ اللہ رب العزت نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا اور فرشتوں سے یہ بات کہی کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتے کہنے لگے کہ ایسے شخص کو زمین میں خلیفہ کیوں بنا رہے ہیں جو زمین پر فساد مچائے اور خون بہائے؟ کیا ہم تیری تسبیح اور پاکیزگی بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ اللہ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ رب العزت

نے آدم علیہ السلام کو کچھ چیزوں کے اسماء سکھا کر فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ تم اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ فرشتے کہنے لگے اللہ تیری ذات پاک ہے، ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے۔ پورے علم وحکمت والا تو تو ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ بتائیں، جب انہوں نے بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں (پہلے ہی) نہیں کہا تھا کہ زمین اور آسمان کی غیبی باتوں کو میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

(سورۃ بقرۃ، آیت: ۳۳/۳۲/۳۱/۳۰)

اللہ نے انسان کو ابتدائی مرحلے ہی میں علمی طاقت کو سکھا کر اس کی عظمت وقوت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا اور بالا آیتوں کے ترجمے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فرشتوں کو قربت الٰہی اور ذکر الٰہی ہونے کے باوجود آدم علیہ السلام سے علمی مقابلہ آرائی میں اللہ رب العزت کی علمی قوت کا اظہار کرنا پڑا اور یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ جس کو چاہے اپنے خزانہ علم سے علمی قوت دے دے اور یہی عطائے خداوندی نے ابوالبشر آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر افضلیت کا درجہ دیا۔

کم وبیش اللہ رب العزت نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کو اس دنیا میں معبوث فرمایا، سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ لوگ اللہ کو پہچانیں، جانیں، مانیں اسی تعارف کے لیے اللہ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو وحی الٰہی اور دنیا کے بیشتر علوم وفنون سے انبیاء علیہم السلام کو آراستہ وپیراستہ کیا، کیونکہ انسانوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کمالات سے متاثر ہوتا ہے، جس میں علمی اور فنی کمالات ہوں اس سے انسان کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت لقمان علیہ السلام، حضرت عیسیٰ

علیہ السلام، وغیرہ کے علوم اور واقعات کو قرآن وحدیث میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مذہب کی بنیاد ایمان وعمل ہے اور ان دونوں کی بنا علم ہے۔ علم حاصل کرنے میں، پڑھنے اور لکھنے کا زیادہ عمل دخل ہے۔ البتہ سبحانہ وتعالیٰ نے کائنات کے اولین مرحلے میں قلم سے نوشتہ تقدیر کرائی جو لوح محفوظ پر محفوظ ہے۔ (الحدیث)

آخری امت اور آخری رسالت کی ابتداء پڑھنے لکھنے کے بارے میں ہوتی ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں غور وفکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی الٰہی لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ عرض کرتے ہیں۔ پڑھئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یہ تین مرتبہ ہوا، پھر جبرئیل علیہ السلام نے پڑھنا شروع کیا۔

اقرا باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم (العلق ۵۔۱)

ترجمہ: پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے، انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہیں تھا۔

قرآن مجید کے نزول ہونے سے قبل اس زمانے کو زمانہ جاہلیت کہا جاتا تھا کیونکہ بت پرستی، تعصب، اونچ نیچ، ذات پات، قتل وزنا، رشوت، شراب خوری، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا لوٹ مار وغیرہ جیسی خرابیاں معاشرہ کو پراگندہ کر رہی تھیں اور سماجی فضا میں تعفن پھیلا رہی تھیں، جس کی وجہ سے انسانیت دم توڑ رہی تھی، ایسے ماحول میں اولین مرحلے میں قرآن مجید نے گناہوں حتی کہ کفر وشرک کے چھوڑنے کی بھی بات نہیں کی، بلکہ پہلا جو حکم نازل ہوا اس میں دو مرتبہ پڑھنے اور ایک مرتبہ لکھنے کے بارے میں تھا اور یہ بھی کہا گیا کہ اللہ کے نام سے پڑھنا کیونکہ اس نے تمہیں جمے ہوئے لہو سے وجود دیا اور انسانوں کو وہ علم سکھایا کہ جس کو

انسان جانتا بھی نہیں تھا۔

اللہ سبحان وتعالیٰ نے قرآن مقدس کے ذریعہ اس امت کو دو بنیادی نظریے عطا کیے، جیسا کہ اللہ رب العزت سورہ مجادلہ آیت نمبر ۱۱ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتو العلم درجت واللہ بما تعملون خبیر (۱۱۔پ:۲۸)

تم میں جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ رب العزت نے بالا آیت میں عالم یا سعادت دارین میں فوز وفلاح پانے کے دو اہم اصول بیان فرمائے ہیں ان اصولوں سے پرے کوئی اور دوسرا راستہ نظر نہیں آتا بلکہ یہ ہے کہ جتنے اور بھی راستے ہیں وہ ظلم وظلمات کے راستے ہیں۔ ایمان اور علم پر جب تک کہ دنیا کے انسان اور مسلمان اس پر قائم ودائم رہیں گے تو دنیا کی امامت کا تاج انہیں کے سروں پر رکھا جائے گا، کوئی بھی قوم ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی، جیسا کہ مسلمانوں کا ماضی اس کی شہادت دیتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی مثنوی ''صبح امید'' میں مسلمانوں کی عظمت اور ان کی زبوں حالی کا قصہ بیان کیا ااور ان سے امید لگائی ہے۔ وہ کچھ اس طرح کہتے ہیں۔

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام!
جو قوم تھی مبتلائے آرام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح واقبال
کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کردیئے تھے چراغ جس نے

قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ خون فشاں کہ چل کر
ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیئے تھے
اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیئے تھے
با ایں ہمہ جاہ وشوکت وفر
اقلیم ہنر بھی تھے مسخر
ہیئت میں بلند پایہ اس کا
تھا فلسفہ زیر سایہ اس کا
منطق میں ہوا جو گرم جولاں
تھامے تھے رکاب مصرو یونان
میدان سخن جو روبرو تھا
فارس کی زبان پہ طرقوا تھا
جو فلسفیان ہندو چیں تھے
خرمن سے اسی کے خوشہ چیں تھے

(کلیات شبلی، ص:۲)

ان اشعار میں مسلمانوں کی عسکری اور علمی فتوحات کی شاندار داستان ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں ہی کے خرمن سے دیگر اقوام خوشہ چیں کررہے تھے اور ان کے چراغ سے دوسرے لوگوں کا علمی چراغ جل رہا تھا مگر گردش ایام نے انہیں کی علمی بے اعتنائی سے پستی میں ڈال دیا۔ آج پوری دنیا میں ہائے ہائے کا غل ہے کہ مسلمان پسماندہ ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں نے اپنے آباؤاجداد کی علمی میراث کو گنوادی ہے مگر ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت

نہیں کیونکہ خدانے اس قوم کی مٹی میں بڑی زرخیزی رکھی ہے۔بس احساس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے علمی وعملی حالات کو بدل لے ؎

اسلاف کہ وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
گو خوار ہیں طرز وخو وہی ہے
مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

(ایضاً،ص:۳۶)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے۔ارشاد فرماتے ہیں:

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة"۔(الحدیث)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔

دوسری حدیث میں کچھ یوں بیان فرمایا ہے:

لاخیر فی من کان من امتی لیس بعالم ولا متعلم۔(الحدیث)

میری امت کے اس شخص سے خیر کی کوئی توقع نہیں جو عالم اور طالب علم نہ ہو۔

(یعنی یا تو خود سیکھے یا دوسروں کو سکھائے)

علم سیکھنے کی اہمیت وعظمت کو بتائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اطلبو العلم من المهد الی اللحد۔(الحدیث)

علم حاصل کرو ماں کے گہوارے سے قبر تک

بالا کی پہلی حدیث میں رسول اکرام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے اور فرض کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔چنانچہ اپنی اولاد کو اور سماج کو علم سے دور رکھنے پر اللہ کے یہاں مواخذہ ہوگا اور اس پر سزا دی جائے گی،

حدیث نمبر دو سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی حالتیں دو حالتوں سے خالی نہیں ہونی چاہئے یا تو وہ سیکھانے والے ہوں یا سیکھنے والے ہوں اور یہ سیکھنے اور سیکھانے کا سلسلہ ماں کے گھوارہ سے شروع ہو کر مرتے دم تک جاری رہنا چاہئے۔

علامہ شیخ سعدی شیرازی اپنی مشہور کتاب ''کریما'' (جو کہ مدارس کے درس نظامیہ میں شامل ہے) میں فرماتے ہیں:

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

کسی نے اس فارسی شعر کی کیا خوب ترجمانی کی ہے ۔

پگھلنا علم خاطر مثالِ شمع زیبا ہے
بغیر اس کے نہیں پہچان سکتے ہم خدا کیا ہے

علم کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ بندہ اللہ رب العزت کو پہچان جائے، چاہے وہ وحی الہی کے علم سے پہچانے یا مشاہدے سے، خالق صناعی سے متاثر ہو کر اللہ کے احکام پر اپنی خواہشات کو قربان کر دے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے والوں کی کیا حیثیت ہوتی ہے، اس کا کچھ اس طرح سے تذکرہ کیا ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں علم کے حصول کی تمنا جاگ جائے گی۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

''جو علم حاصل کرنے کے لیے راہ طے کرتا ہے، اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے، فرشتے طالب علم کے لیے پر بچھاتے ہیں، عالم کے لیے آسمان و زمین کی ہر چیز مغفرت طلب کرتی ہے، یہاں تک کہ پانی مچھلیاں بھی۔ عالم کی فضیلت عبادت گزار پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر۔ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں، بے شک انبیاء دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں۔ جس نے علم حاصل

کیااس نے پورا حصہ حاصل کرلیا (ترمذی) ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ۔

اس حدیث سے علم وعلماء کی کس قدر فضیلت وعظمت ثابت ہوتی ہے۔علم کو اللہ نے مقید نہیں کیا ہے بلکہ مطلق اور اتھاہ سمندر بنایا ہے، جو شخص جتنا چاہے علم کے دریا سے سیرابی حاصل کرلے اور یہ بھی ہے کہ مذہب اسلام نے علم کو دو خانوں میں نہیں بانٹا ہے بلکہ علم کو اکائی قرار دیا ہے ہر وہ علم جو انسان کو اللہ، کائنات اور اپنی ذات کو معرفت عطا کرے اسے دین کا علم سمجھا جائے گا اور ہر وہ علم چاہے وہ وحی الہی کیوں نہ ہو اگر کوئی دنیا کی خاطر اسے غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ اللہ کی معرفت اور انسانیت سے پرے ہو جاتا ہے تو وہ علم کی تعریف میں داخل ہی نہیں ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تھے تو یہی دعا کرتے تھے کہ اے اللہ (ہم کو) علم نافع عطا فرما اور اللہ رب العزت سے زیادتی علم کے لیے دعا کی تاکید فرمائی ہے۔

وقل رب زدنی علما۔

آپ کہئے اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔

رب العلمین کو جس کے پاس علمی قدرت کے سارے خزانے موجود ہیں جس کی وجہ سے دنیا کا پورا نظام سسٹم رواں دواں ہے وہی ذات رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دے رہی ہے کہ اپنے رب سے علم کی زیادتی کی دعا فرمائیں، اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم اول وآخر عطا فرمایا، اگر غور سے دیکھا جائے تو اسی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کمالات میں علمی کمال کو تفوق حاصل ہے ۔

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دادند کہ تو تنہا داری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ اس کے حاصل کرنے کی بھی تاکید آئی ہے اور اس کے لیے اسفار ومحنت جد وجہد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص کے ساتھ اللہ خیر کا معاملہ فرماتے ہیں تو اسے دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں اور علم تعلم یعنی سیکھنے سے آتا ہے۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ علم حاصل کرو اگرچہ چین بھی جانا پڑے، جنگ بدر ہوئی، کفار کو شکست ہوئی۔ قیدیوں کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے باہم مشورہ طے کر کے یہ حکم جاری کیا کہ ان قیدیوں کو تاوان اور فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا۔ اس میں ایک اہم بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمائی کہ قیدیوں میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتا ہے ان کا فدیہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اسے بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا جائے گا۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کو مسلمان بچوں کا معلم بنا دیا اور ان سے وہ تعلیم دلوائی جو ان کے پاس تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دانائی کی بات مومن کا گم شدہ سامان ہے، وہ جہاں اسے پائے اس کو حاصل کرنے کا وہ زیادہ حقدار ہے۔ (ترمذی)

اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے علماء متقدمین و متاخرین نے بھرپور غیر مسلم اہل علم و دانش سے فائدہ اٹھایا۔ یونان، ہند، روم وغیرہ کے اہل علم سے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے خوب سے خوب اکتساب کیا، نئی نئی چیزوں کے وہ موجد اور دنیا کی ترقی کا ذریعہ بنے۔ علم حساب، علم سائنس، علم نباتات، علم حیوانات، علم جغرافیہ، علم تاریخ، علم سماجیات، علم ہیئت، علم فلکیات قورنیہ (علم چشم) وغیرہ میں مہارت حاصل کی اور ان علوم کے ماہرین کو قرآن وسنت پر صرف عبور ہی حاصل نہیں تھا بلکہ اجتہادانہ صفات بھی رکھتے تھے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

دنیاوآخرت دونوں جہاں مومن کے لیے ہےاور دونوں جہاں کو پہچاننے کے لیے علم کا حاصل کرنا ضروری ہے،قرآن مجید میں اللہ نے ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی مانگنے کی تاکید فرمائی ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة

یہ دعا جامع اورمشہور بھی ہے

عصر حاضر میں تعلیم کو دودھارے میں تقسیم کردیا گیا ایک تعلیم کو مذہبی تعلیم قرار دیا گیا ہے جس میں قرآن،حدیث،فقہ،اصول فقہ،منطق،فلسفہ،علم نحو،علم صرف،عربی ادب وانشاء،سیرت،تاریخ وغیرہ شامل ہیں،ان کی تعلیم مکاتب و مدارس میں ہوتی ہے،اس میں تقریباً آٹھ سے دس سال تک کا وقت صرف ہوتاہے،مدارس کے فارغ التحصیل سے سماج ومعاشرہ میں خداترسی،ادب واخلاق وغیرہ کا فروغ ہوتاہے۔ان کی شناخت حافظ،قاری، عالم،فاضل،کامل،مفتی وغیرہ سےعوام الناس میں ہوتی ہے۔ان کو گورنمنٹ سے مراعات نہ کے برابر ملتی ہے اورعوام الناس زکوٰۃ،خیرات،صدقات وغیرہ سے تعاون کرتے ہیں۔ مدارس کے فارغ التحصیل کو ناہی گورنمنٹ ملازمت دیتی ہے اور ناہی عوام الناس ان کو خاطرخواہ مشاہرہ دیتے ہیں،ان سب حالات کے باوجود مدارس کےطلبا اور اساتذہ کے پیشانی پراطمینان وسکون کا نوردورہی سےصاف دیکھائی دیتاہے،شکایتیں کم شکرزیادہ کرتے ہیں،سماج کے لیے بلالحاظ مذہب وملت کے یہ طبقہ ہروقت خدمت کے لیے تیار رہتاہے، منبرومصلیٰ سےصراط مستقیم کی طرف بلانا اوروہیں سے پورے عالم کے لیےامن وسلامتی کے لیے دعا کرنا،اس طبقے کا خاص وطیرہ ہے،آفات سماوی،فسادات اور ناگفتہ بہ حالات کے موقع پر یہ طبقہ ہرطرح سے سماج پرقربان ہوجاتا ہے،ملک کے حالیہ اور ماضی کے کئی اہم واقعات وسانحات میں ان کی خدمات کے بین ثبوت ہیں۔

دوسرا دھارا عصری تعلیم کا ہے،ان کے لیے اسکول،کالج اور یونیورسٹی وغیرہ

ہیں۔ان کو میٹرک، ہائی اسکول،انٹرمیڈیٹ، گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، ایم فل، پی ایچ ڈی وغیرہ کی سندیں دی جاتی ہیں۔اس میں گورنمنٹ کا کلی تعاون ہوتا ہےاور حسب لیاقت ملازمت کا بھرپور موقع رہتا ہے۔غرض کہ حکومت کی نااہلی کی وجہ سے،جس کو جہاں پر ہونا چاہئے تھا،وہ ہاں پر نہیں ہےاور جس کو جہاں پر نہیں ہونا تھا،وہ اس پر براجمان ہے۔جب نااہل کو بالخصوص تعلیم کے میدان میں اہل بنادیا جائے تو ملک کا بنیادی ڈھانچہ متزلزل ہوجاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ملک کا تعلیمی نظام مضبوط کریں،جس سے معلم متعلم اورعوام کوانصاف مل سکے۔

راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اگر مذہبی اور عصری دونوں دھاروں کو یکجا کردیا جائے ،کچھ عصری میں اہم کتابیں مذہبی کی داخل کردیں جیسے قرآن اور مذہبی میں کچھ عصری اہم کتابیں داخل کردیں جیسے علم سائنس اور ریاضی اوران میں توازن پیدا کرتے ہوئے کچھ ایسی راہیں نکالی جائیں کہ جس میں ایک شخص گریجویٹ بھی ہواور عالم بھی ہو۔جیسا کہ آزادی سے قبل اس طرح کا نظام تھا۔اس دور کو ہندستان میں تعلیم وتربیت اورایجاد کا سنہرادور مانا جاتا ہے۔لارڈ میکالے اور انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اس ملک میں ہندواور مسلمان دونوں اپنے اپنے اقدار سے دور ہوتے گئے۔وہ سنسکرت سے دور ہوگئے اور مسلمانوں کی بیشتر آبادی قرآن سے دور ہوگئی۔

زیر نظر کتاب کا نام ’’قوت تعلیم،افکارونظریات‘‘ ہےاس میں مختلف فکرونظر رکھنے والے باصلاحیت عالموں، پروفیسروں،ڈاکٹروں اور ریسرچ اسکالروں کے مقالات ہیں۔ یہ سارے مقالات قوت تعلیم انٹرنیشنل کانفرنس کے لیے لکھے گئے۔ان کے مطالعے کے بعد قارئین کوکئی جہتوں سے یہ اندازہ ہوگا کہ علم میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔اس سیمینار کے مہمانِ خصوصی پروفیسر مظفرعلی شہہ میری وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول آندھرا

پردیش، نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ استاد اور طالب علم علمی قوت کے دو سرچشمے ہیں، ان میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط ہونا چاہئے، جس میں محبت اور اخلاص شامل ہو اور مہمانِ اعزازی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنے تاثراتی خطاب میں فرمایا کہ علمی قوت کی سب سے اہم قوت کثرتِ مطالعہ ہے۔ اس سیمینار میں شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل کی طرف سے پانچ معزز اشخاص کو ان کی علمی وادبی سماجی خدمات کی وجہ سے تہنیت وایوارڈ سے نوازا گیا، ان میں قابل قدر افتخار اردو ایوارڈ پروفیسر مظفر علی شہ میری۔ سید سلیمان ایوارڈ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ان کی عدم موجودگی میں ڈائرکٹر دارالمصنفین اعظم گڑھ (یہ ایوارڈ دارالمصنفین کے رفیق مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ افتخارِ شبلی ایوارڈ ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اعزازی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ افتخار اعظم گڑھ ایوارڈ مولانا قمر الزماں مبارک پوری کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ افتخارِ علماء ایوارڈ مولانا ابصار الحق قاسمی ناظم اعلیٰ المعہد الاسلامی مئو ناتھ بھنجن کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

اس سمینار میں نو (۹) مقالے ایسے تھے کہ جن کو مدارس سے فارغ التحصیل علماء نے لکھے، ان کے عنوانات یہ ہیں۔

قوت تعلیم قرآن وسنت کی روشنی میں

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کا نظریۂ تعلیم (۱۲۴۸ھ/ ۱۲۹۷ھ)

مدارس کے نصاب تعلیم میں تجدید وتوسیع کی ضرورت

اکابر دیوبند کا نظریۂ تعلیم

تعلیم کی ایک عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند

تعلیم رسول اللہؐ کا فرض منصبی

تعلیم برائے معاش یا تعلیم برائے تزکیہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات

مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نظریہ تعلیم

ان مقالوں کے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن وسنت میں تعلیم کا کیا مقام ہے اور مدارس میں کیا تعلیم دی جاتی ہے ۔کبار علماء کی تعلیم وتعلم کے بارے میں کیا نظریات ہیں، اس کے نصاب یا طریقۂ تعلیم میں اصلاح ضروری ہے یا نہیں ۔ان سارے سوالوں کے جوابات بالا مقالات میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

انیس (۱۹) مقالات ایسے ہیں، جس کو ہندستان بھر کے پروفیسروں اور ڈاکٹروں نے لکھا ہے ۔ان کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں ۔

چیریا کوٹ کے علماء، ادبا اور محققین

قوت تعلیم اور طب یونانی

اللہ کا وجود الکمیا کی نظر میں

فلسفہ تعلیم اور اسلام

علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم

فاصلاتی طرز تعلیم اور طلباء مدارس

اصلاح معاشرہ اور ہومیو پیتھی

تعلیم مغربی مفکرین کی آراء کی روشنی میں

قوت تعلیم ایک مختصر جائزہ

فارسی کی اخلاقی مثنویوں میں علم کی اہمیت وافادیت

آزاد ہند میں طب یونانی کا تعلیمی منظر نامہ

تعلیم اور خواتین پر سماجی موقف

جدید نظام تعلیم پر اقبال کے اعتراضات

جدید تعلیم اور مسلمان

تعلیم کی اہمیت حالی کی نظر میں

علم وحکمت مسلمانوں کی گم شدہ میراث، ایک لمحہ فکریہ

سرسید کا تعلیمی تصور

ان مقالات میں تعلیم کی قوت کو مختلف فکر ونظریات بالخصوص اردو زبان وادب کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس انٹرنیشنل کانفرنس میں ملک کے طول وعرض سے انیس (۱۹) ریسرچ اسکالرس شریک ہوئے، ان لوگوں نے حتی المقدور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور مختلف جہتوں اور دلائل سے اپنے خیالات کو زیب قرطاس کیا ہے۔ان کے عنوانات یہ ہیں۔

عہد وسطی میں تعلیمی سرگرمیاں، سرسید کی روشنی میں

ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت

جدید طریقہ تعلیم اور نبوی طریقہ تعلیم، ایک تقابلی مطالعہ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات

قوت تعلیم اور نسوانی تعلیم کی اہمیت

دلت طبقات میں تعلیم کی صورت حال

تعلیم نسواں

تعلیم وتعلم کے رہنما اصول سفر نامہ موسیؑ کے تناظر میں

مدارس کے اساتذہ کی تربیت میں ہی ہماری ترقی اور بقا کا راز پنہاں

مسعود حسین خان کی علمی خدمات

رابندر ناتھ ٹیگور کا نظریہ تعلیم بطور عالمی اخوات
رہبران قوم مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور تعلیم کے جہات
تعلیم کا اصل مقصد قرآن کی روشنی میں
سائنسی علوم کی ترقی میں ترجمے کا کردار
احمد عبدالغفور عطار کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات
علوم کے فروغ اور اس کی ترویج واشاعت میں ترجمے کا کردار
سرسید احمد خان کا نظریۂ تعلیم اور اس کی عصری معنویت
امام احمد رضا خاں کی علمی خدمات ایک سرسری جائزہ
مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی
ہندستان میں تعلیم نسواں ایک جائزہ
فروغ تعلیم میں مدارس کا کردار

ہندستان میں مسلمان تقریباً بیس کروڑ ہیں، ان کی تعلیمی فیصد کا جب جائزہ لیا جاتا ہے، ان کے بارے میں جو سروے رپورٹ ہے، اس میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دینی مدارس اور مکاتب میں دو فیصد مسلمانوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اٹھانوے فیصد اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں۔ عصری تعلیم کا آغاز تو ہوتا ہے مگر انجام تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں کا تعلیمی فیصد نہ کے برابر ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں یہ رائے دی جاتی ہے کہ مسلمان تعلیمی میدان میں پسماندہ ہیں ۔

ارتقاء کے سبھی راستے پہلے بند کیے جائیں گے
بعد میں ساری پسماندگی ہم سے منسوب کی جائے گی

ماضی پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات حاصل کرنے والوں کے درمیان کچھ ایسا حصول علم اور ریسرچ کا جزبہ نظر آتا ہے

کہ ان کے نام کے بغیر علمی تاریخ ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کہ جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ الخوارزمی، ابن الھیثم، ابوالعباس الغرغانی، محمد جابر البتانی، محمد بن زکریا رازی ابن سینا، ابوریحان البیرونی، ابن نفیس، ابوحنیفہ الدینیوری، عمر خیام ابن البطار اور ابوالقاسم الزہراوی وغیرہ جیسے سائنسدان محققین اور موجدین موجود ہیں۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، علامہ ابن تیمیہ، امام غزالی، علامہ رومی، شاہ ولی اللہ وغیرہ جیسے ہزاروں کی تعداد میں ایسے ذی علم گزرے ہیں کہ ان کے علمی کارنامے سے پوری دنیا سیراب ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال نے جب یورپ میں مسلمانوں کی تعلیمی عظمت رفتہ کا حال دیکھا تو تڑپ اٹھے اور اس پر ایک نظم بہ عنوان خطاب بہ جوانانِ اسلام لکھی اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں عظمت رفتہ کا درد بھی ہے اور دوا بھی۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تونے؟
وہ کیا گردوں تھا؟ تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سرِ دارا
گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئے ہے
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

کسی بھی عزائم ومقاصد کی تکمیل میں بہت سارے لوگوں کا تعاون شامل حال رہتا

ہے۔راقم الحروف ان تمام لوگوں کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ان میں بالخصوص شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے ٹرسٹیان، ڈاکٹر عبدالقدوس،ڈاکٹر محمد رفیق،ڈاکٹرغوثیہ بانو،ڈاکٹرحمران احمد،ڈاکٹرسراج احمدانصاری، ابوہریرہ ایوبی ،مولانا مساعدہلال احیائی، ابوہریرہ یوسفی،مولانا حافظ وقاراحمد نیز باشندگان بمہور بالخصوص حافظ رضوان پردھان،ابوسفیان اعظمی،حاجی ابراہیم،شکیل احمد (عرف لاڈل)،مولانامفتی عبدالرشید،حافظ خورشیداحمد وغیرہ کا تعاون شامل رہا ہے۔دعا گوہوں کہ اللہ ان حضرات کو ثواب دارین عطافرمائے۔آمین

اس سیمینار میں شبلی اکیڈمی دارالمصنفین اعظم گڑھ کا تعاون شامل حال رہا۔بندہ ناچیز دارالمصنفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ،مولانا عمیرالصدیق ندوی ، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور دیگر کارکنانِ دارالمصنفین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ ان لوگوں نے حوصلے کے ساتھ ہر ممکنہ سہولت فراہم کی۔

راقم الحروف اپنے استاذ محترم پروفیسر مظفرعلی شہہ میری وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول آندھراپردیش کا صمیم قلب سے ممنون ہے کہ انہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجوداس سیمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔

میں اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد رضوان صاحب قاسمی صدر مدرس جامعہ رشیدیہ بمہوراعظم گڑھ کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس انٹرنیشنل سیمینار کی صدارت کی اور دعا فرمائی۔اللہ ان کا سایہ صحت وتندرستی کے ساتھ تادیر باقی رکھے۔آمین

میں اپنی والدہ محترمہ، برادرمحمد مجاہد ہلال اعظمی اور میری بہنیں شہناز فاطمہ، تسنیم کوثر اور ممتاز فاطمہ اور دیگر رشتہ داروں کا شکر گزار ہوں کہ ان لوگوں نے دعا کے ساتھ ہر ممکنہ مدد فرمائی۔اللہ اجرعطافرمائے۔آمین

صبروشکر کی پیکر میری اہلیہ محترمہ زینب خاتون کا شکریہ ادا کرنا فرض عین سمجھتا ہوں،

کیوں کہ انہوں نے ہر گھڑی میری مدد فرمائی اور اس کسی ہستی کی کمی محسوس کر رہا ہوں، وہ ہیں میرے والد محترم حضرت مولانا نجم الدین احیائی نور اللہ مرقدہ مشیت الٰہی کے آگے سربسجود ہوں۔ کاش کہ وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ ان کی روح کو ضرور تسکین حاصل ہو رہی ہوگی۔

بندہ ناچیز کو اپنی کم علمی وفہمی کا پورا اعتراف ہے، اس وجہ سے قارئین سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ ترتیب دینے میں یا مقدمے میں غلطیاں ہوں تو معذور سمجھیں گے اور مناسب مشورے سے نوازیں گے۔ ان شاء اللہ۔ آپ کے مشورے کی قدر کی جائے گی۔

ابو ہریرہ یوسفی نے اس کتاب کی ترتیب وتزئین میں معاونت کی، جس کی وجہ سے وہ تمام دشوار مرحلے آسان ہوگئے۔ اللہ ان کو بہترین بدلہ دے۔ آمین

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

ایڈیٹر: ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد

چیرمین: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

مولانا ارشادالحق قاسمی مدنی۔ امام گنج، مئو

قوت تعلیم قرآن وسنت کی روشنی میں

علم کی قوت اوراس کی بالا دستی روز اول سے قائم ہے، علم کی ہی بنیاد پر حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ ہونے کا شرف حاصل ہوا اور فرشتے جنہیں بارگاہ علیم وخبیر سے یہ تمغۂ امتیاز ملا لا یعصو ن اللہ ما أمرھم و یفعلون ما یو مرون. نہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں نہ اس کے احکام بجالانے میں سستی اور دیر ہوتی ہے نہ امثال کی حکم سے عاجز ہیں التحریم ٦۔٥ حاشیہ ترجمہ شیخ الہند۔ یہ کہنے پر مجبور ہوئے سبحا نک لا علم لنا اِلاما علمتنا اِنک أنت العلیم الحکیم البقرۃ:۳۲

اور علم نہ ہونے کی وجہ سے آدم علیہ السلام کی اولاد ہابیل کو جو شرمندگی ہوئی قرآن کریم نے یوں بیان فرمایا: یویلتی أعجزت أن أکون مثل ھذاالعزاب فا ؤاری سوأۃ أخی فأ صبح من الند مین المائدۃ:۳۱

چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ تھا اس لئے قتل کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بھائی کی لاش کو کیا کرے آخر ایک کوے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے یا دوسرے مردہ کوئے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے، اسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش کو دفن کردوں اور افسوس بھی ہوا کہ میں عقل وفہم اور بھائی کی ہمدردی میں اس جانور سے بھی گیا گذرا ہوں۔ اس آیت کریمہ کے اندر جہاں ہابیل کی جہالت اور شرمندگی کا ذکر ہے وہیں قیامت تک آنے والے انسانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ مردار کو یوں ہی نہ چھوڑا جائے بلکہ ان کو بھی مٹی کے نیچے دبا دیا جائے گویا کہ اشارہ نظام تدفین کی تعلیم دی گئی ہے جو حیوانی مردہ اجسام سے پیدا ہونے والی آلودگیوں سے حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ ہے چنانچہ رسول رحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جسم کے ان اجزاء کو جن سے تعفن پھیل سکتا ہے ہوا اور آلودگی پیدا ہو، ان کو

بھی دفن کرنے کا حکم دیا۔حضرت آدم سعد سے مروی ہے کہ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کو دفن کرنے کا حکم دیا فرمایا: مجمع الزوائد ۹۲/۵ کو آلہ طبرانی اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناک سے نکلنے والی آلائش کو دفن کرنے کا حکم فرمایا مسند بزار مجمع الزوائد ۱۱۴/۸۔اسی لئے فقہا نے خواتین کو ماہواری کے زمانہ کے آلودہ کپڑوں کو دفن کرنے کا حکم دیا، معلوم ہوا کی علم کی وجہ سے انسان کو عزت وعظمت اور کامیابی حاصل ہوتی ہے اور جبکہ جہالت سے ذلت ورسوائی اور ناکامی ہاتھ آتی ہے۔

علم وحکمت کو اللہ رب العزت نے فضل عظیم سے تعبیر کیا ہے **و أنــزل الـلــه عـلیک الـکـتـاب و الـحـکـمة و عـلـمک ما لم تکن تعلم و کان فضل الله عـلیک عـظـیما** النساء:۱۱۳۔اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی اور تجھ کو وہ باتیں سکھلائیں جسے تو نہ جانتا تھا اور آپ تجھ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔

۱۔جب کسی کو یہ نعمت ملے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے **یـر فـع الـلـه الـذیـن آمـنـوامـنـکـم و الـذین أوتو ا العلم درجات** ۔اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور اہل علم کے درجات کو بلند کرے گا۔المجادلۃ:۱۱

علم کی ہی وجہ سے حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام قید و بند کی مذموم زندگی سے نکل کر عزیز مصر کے مقام بلند و برتر پر فائز ہو گئے اور یہ اعلان بھی فرمایا یہ جو کچھ میں بتلاؤں گا وہ سب رب کریم کا ہی سکھلایا ہوا ہے **قـال لا یـا تیـکـمـا طـعام ترز قٰنه اِلا نبآتکما بتـأویـلـه قبـل أن یـا تیکما ذلکما مما علمنی ربی.** حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا جو کھانا تم کو ہر روز ملتا ہے وہ تمہارے پاس نہ آنے پائے گا اس کے آنے سے پہلے میں تم کو (تمہارے خوابوں کی) تعبیر بتلا دونگا اور جان لو کہ یہ علم مجھ کو میرے رب نے سکھلا یا ہے۔ یوسف:۳۷ اس لئے انسان کو چاہیے کی وہ علم وحکمت اور فہم وفراست کے چاہے جتنے اعلی وارفع مقام پر پہونچ جائے نفس کے دھوکے میں نہ آئے اور ہمیشہ اس سے پناہ مانگتا رہے جیسا کہ خود حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے نفس سے پناہ مانگی ہے **و مـا أبـرئ نـفسی**

اِن النفس لأمارة با لسوء میں اپنے نفس کی پا کی اور براءت نہیں بیان کرتا بیشک نفس تو برائی کا حکم دیتا ہے۔ یوسف:۵۳

بلکہ جب کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہ السلام نے بیک زبان اللہ کی حمد وثنا کی ہے۔ ولقد آتینا داؤد و سلیمان علما و قا لا الحمد الله الذی فضلنا علی کثیر من عباده المؤ منین (النمل:۱۵) اور ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو ایک علم دیا اور ان دونوں نے کہا تمام تعریف اس اللہ کی جس نے اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر ہم کو فضیلت اور بزرگی عطا فرمائی ہے۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو جو قوت فیصلہ اور علم و دانائی ملی تھی وہ اللہ کا عطیہ تھا و کلاّ آتینا ہ حکما و علما. اور ہم نے پہاڑ اور پرندوں کو داؤد کے تابع کر دیا اور ان کے ساتھ تسبیح پڑھا کرتے ہیں اور یہ سب کچھ ہم نے کیا ہے اور ہم نے ہی داؤد کو تمہارے لئے لڑائی سے حفاظت کیلئے ایک لباس (زرہ میں) بہانا سکھلایا ہے و علمنه صنعته لبوس لکم لتحصنکم من بأسکم (انبیاء:۷۹-۸۰) اور حضرت سلیمان کیلئے ہوا کو تابع کر دیا۔ حضرت سلیمان نے اللہ سے دعاء کی تھی رب اغفرلی وهب لی ملکا لا ینبغی لأ حدمن بعدی ص:۳۵۔ اس دعاء کے طفیل اللہ نے ہوا اور جن کو ان کے لئے مسخر کر دیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک تخت تیار کرایا تھا جس پر مع اعیان دولت بیٹھ جاتے تھے اور ضروری سامان بھی یاد کر لیا جاتا تھا پھر ہوا آتی اور زور سے اس کو زمین سے اٹھاتی پھر اوپر جا کر نرم ہوا ان کی ضرورت کے مناسب چلتی فسخر نا له الريح تجری بأمره رخاء حیث أصاب ص:۳۶ یمن سے شام اور شام سے یمن کو مہینہ کی راہ دو پہر میں پہنچا دیتی۔ علم کی شان اور حقیقت یہی ہے کہ اس سے اللہ کی معرفت ہو اہل علم اور بندگان خدا کی یہی پہچان ہے کہ وہ کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی اللہ رب العزت کی بے شمار نعمتوں آیتوں اور نشانیوں کا عبرت مشاہدہ کرتے ہیں اور اس میں اور زمین و آسمان کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ رب کائنات آپ نے ان کی تخلیق یونہی نہیں فرمائی۔ ربنا ما

خلقت هذا با طلا سبحٰنک فقنا عذاب النار۔

معلوم ہوا کہ حقیقی علم وہی ہے جس سے اللہ کی مغفرت حاصل ہو اور ساتھ ہی عذاب سے حفاظت کا ذریعہ بھی ہو جس علم سے تواضع او انکساری کے بجائے کبر وغرور کی بو آتی ہو وہ علم اللہ کے نزدیک لائق ستائش نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابلیس جس نے صریح حکم الٰہی کے مقابلہ **انا خیر منه خلقتنی من نارو خلقته من طین** کا دعوی کرنے لگا۔ آخر اسی اباء ورستکبار اور نص صریح قاطع کو محض رائے وہوی سے ادا کردینے اور خدا سے بحث ومناظرہ ٹھان لینے کی پاداش میں ہمیشہ کیلئے مرتبہ قرب سے نیچے گرادیا گیا اور رحمت البتہ سے بہت دور پھینک دیا گیا فی الحقیقت جس چیز پر اسے فخر تھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے وہ ہی اس کی ہلاکت ابدی کا سبب ہوئی، آگ کا خاصہ خفت وحدّت سرعت وطیش اور علوء افادہے بخلاف مٹی کے کہ اس میں مستقل مزاجی، متانت اور متواصغانہ حلم وتثبیت پایا جاتا ہے، ابلیس جوناری الذصل تھا سجدہ کا حکم سنکر آگ بگولہ ہوگیا اور رائے قائم کرنے میں تیزی اور جلد بازی دکھلائی آخر تکبر وتعلّی کی راہ سے آتش حسد میں گر کر دوزخ کی آگ میں جاپڑا، برخلاف اس کے آدم علیہ السلام سے جب غلطی ہوتی تو عنصر خاکی نے خدا کے آگے فروتنی، خاکساری، اور انقیادواستکانت کی راہ دکھلائی چنانچہ ان کی استقامت وانابت نے ثم اجتبہ ربہ فتاب علیہ وہدی کا نتیجہ پیدا کیا ترجمہ شیخ الہند۔ علم کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ انسان کو عزت ملتی ہے بلکہ اس کی جان کی حفاظت بھی ہوتی ہے غزوہ بدر کے موقع پر جب کفار قریش قید کئے گئے تھے اور مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ ان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ ان سے ندیہ لیکر ان کی جان بخشی جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام لوگوں کا غدیہ جولکھنا پڑھنا جانتے تھے یہ طے کیا کہ وہ ہمارے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کے کے غائب ہونے پر سخت سزا دینے کی دھمکی دی تھی **و تفقد الطیر فقال مالی لأری الهدهد أم کان من الغائبین لأعذ بنه عذابا شدیدا أو لیا تینی بسلطٰن مبین** (النمل:۲۱) اور پرندوں کی خبر گیری اور کیا کیا بات ہے کہ ہدہد نظر نہیں آرہا ہے یا وہ غیر حاضر ہے میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کرڈالوں گا یا

وہ (اپنی غیر حاضری پر) مضبوط دلیل پیش کرے۔

لیکن جب ہد ہد نے اپنے غائب ہونے پر پختہ دلیل اور معقول عذر پیش کیا

فمکث غير بعيد فقال أحطّت بما لم تحط به و جيتکٔ من سبأ بنبيا يقين ۔

پھر بہت دیر نہ کی اور آ کر کہا میں ایک چیز کی خبر لیکر آیا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی میں (قوم) سبا کے پاس سے ایک تحقیقی خبر لیکر آیا ہوں۔

اِنی و جدت مرأة تملکهم و اُوتيت من کل شئی و لها عرش عظيم

میں نے ایک ایسی عورت کو پایا جوان پر بادشاہی کرتی ہے اور اس کو ہر ایک چیز ملی ہوئی ہے اور اس کے پاس ایک بڑا سا تخت بھی ہے (نمل:۲۲،۲۳)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہد ہد کی اس تحقیقی خبر اور علم کی وجہ سے اس کے جرم کو معاف فرما دیا اور اس کی جان بخشی کر دی۔

اس واقع میں ایک بات قابل غور یہ بھی ہے کہ کوئی بھی انسان چاہے جتنا بڑا عالم و دانا ہو جائے اس کا علم محیط نہیں ہوسکتا خود احکم الحاکمین نے جن کے بارے میں فرمایا کہ ولقد أتینا داؤد وسلیمان علما ہم ،ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا ہے ان کا حال یہ ہے کہ ایک پرندہ کے ذریعہ انہیں قوم سبا اور ان کے ہدت کا علم ہو رہا ہے۔ یہ اسبات پر متنبہ کرتا ہے کہ فہم و فراست حکمت و دانائی اور علم و دانش جسقدر بھی کسی کو ملجائے وہ کسی کو مل جائے وہ کبھی کامل وہ کبھی کامل نہیں ہوسکتا کامل اور مکمل اللہ کی ذات ہے اس کا علم محیط ہے ہر چیز کو جانتا ہے۔

اور یہی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ کارخانہ عالم میں قانون سازی کا حق صرف اور صرف اللہ ہی کو ہونا چاہئے نظام زندگی کو مرتب کرنے کیلئے علم کی ضرورت ہے اور خدا اسے بڑھ کر کوئی علم نہیں اور اس کے لئے قوت فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اللہ سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں اسی لئے قرأن مجید نے یہ اعلان کر دیا الا لہ الحکم ۔انعام:۶۲ فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے۔ چونکہ دنیا کا نظام علم کے بغیر نہیں چلایا جاسکتا اس لئے اس بات کی بھی تعلیم دی گئی کی انسان اللہ تعالیٰ سے اضافہ علم کی دعا کریں،رب زدنی علما رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا

کرتے تو علم نافع کی دعاء کرتے **اللھم انی أسالک علمانا فعا** ۔اے اللہ میں آپ سے ایسا علم مانگتا ہوں جو نافع ہو نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ بہتری اور اچھائی کا معیار نافع ہوتا ہے۔ **خیر الناس من ینفع الناس** جو شخص لوگوں کے لئے زیادہ فائدہ منداور نفع بخش ہو وہی زیادہ اچھا ہے اللہ رب العزت نے بھی اس جہان آب وگل میں کسی بھی چیز کی بقااور اسکی وجود کی ضمانت کیلئے اس کا نفع بخش ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

و أما ما ینفع الناس فمکث فی الأرض یہ اس کا نظام قدرت ہے کہ جو چیز لوگوں کے فائدہ کی ہوئی اس کو دنیا میں باقی رکھیں گے۔

انسانیت کا وجود بقا بھی اسی سے مشروط ہے، بالخصوص امت محمدیہ جسے خیر امت کا لقب ملا اور اس کا خیر ہونا اسی وجہ سے ہے کہ وہ لوگوں کی نفع رسانی کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ **کنتم خیر امة اخر جت لناس تأ مرون بالمعروف و تنھون عن المنکر** ۔یہ امت جب تک اپنی اس صفت پر قائم رہی عزت وعظمت کے مینار پر فائز رہی اور دولت وثروت اس کی ٹھوکروں میں تھیں۔لیکن جب اس سے بے اعتنائی برتنا شروع کیا اور امر بالعروف اور نہی عن المنکر کے بجائے معروف سے دور اور منکر سے قریب ہوگئے تو یہ خود دنیا کی ٹھوکروں میں آگئے اور ذلت ونقبت ان کا مقدر بن گئی۔

اس لئے ہم سب کو علم کی صحیح قوت وطاقت کا ادراک کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اللہ رب العزت نے علم الانسان مالم یعلم کا جو سبق پڑھایا ہے اور ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حسین وجمیل اسوہ ہمیں عطا فرمایا ہے اسی کی روشنی میں ہمیں اپنی زندگی کا دستور العمل طے کرنا ہوگا، جس میں انسانی جانوں کا احترام اور ان کی عزت و ناموس کے حفاظت کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی رحم وشفقت کا سبق پڑھایا جاتا ہے جو علم بغض وحسد کی آگ سے نکال کر اخوت ومحبت کی ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتا ہے۔

جہاں یتیموں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا سکھایا جاتا ہو اور کسی کی برائی کرنے کو جرم عظیم قرار دیا جاتا ہو۔

مفتی امانت علی قاسمی ۔ استاذ دارالعلوم حیدر آباد

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اوران کانظریۂ تعلیم (۱۲۴۸ھ/ ۱۲۹۷ھ)

حجۃ الاسلام، قاسم العلوم والخیرات، نابغۂ روزگار، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیت ہندستان میں خاص طور پر دینی مدارس میں محتاج تعارف نہیں ہے، آپ نے انگریز عہد حکومت میں اسلام اور مسلمانوں کی ہمہ جہت خدمات انجام دی ہیں، ملک وقوم کے لیے آپ کی جد و جہد آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، آپ تقوی وطہارت میں آفتاب تاباں اور، سادگی و وضع داری میں ماہ درخشاں تھے، آپ ایک انقلابی ہستی ہیں جنہوں نے ہندوستان میں دینی تعلیم کا ایک نیا، انوکھا، پائدار، مفید اور غیر معمولی مؤثر نظام تعلیم رائج کیا۔

مولانا نانوتویؒ کی پیدائش رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں ہوئی ، آپ کا تاریخی نام خورشید حسن ہے، والد کا نام اسد علی ہے، آپ کا تعلق حضرت ابوبکر صدیق کے خاندان سے ہے، ۴۴ویں واسطے سے آپ کا شجرہ نسب قاسم بن ابی بکر سے ملتا ہے، آپ کی والدہ سہارن پور کے وکیل شیخ وجیہ الدین کی صاحب زادی ہیں ، ہندوستان میں آپ کے مورث اعلی مولوی ہاشم ہیں، جو شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور نانوتہ کو اپنا وطن بنایا ،حضرت نانوتوی ان کے ساتویں پشت میں آتے ہیں۔

مکتبی تعلیم آپ نے دیوبند اور سہارن پور میں حاصل کی ، دیوبند میں آپ کے استاذ شیخ مہتاب علی تھے اور سہارن پور میں مولوی نواز تھے ، باقی علوم وفنون کی کتابیں آپ نے اپنے خاص استاذ مولانا مملوک علی سے حاصل کی ،مولانا مملوک علی دہلی کالج میں استاذ

تھے، جو انگریزوں کے غلبے کے بعد انگریزوں کے صرفے سے چل رہا تھا، مولانا نانوتویؒ نے زیادہ تر تعلیم یہیں حاصل کی لیکن حدیث کی تعلیم آپ نے شیخ عبدالغنیؒ مجددی سے حاصل کی، یہ شیخ ابوسعید مجددی کے بیٹے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے خاندان سے ہیں، شاہ عبدالغنیؒ نے حدیث کی تعلیم اپنے والد شیخ ابوسعید مجددیؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد شاہ اسحاقؒ سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں ایک ممتاز نام شیخ احمد علی سہارن پوریؒ کا ہے، جن سے آپ نے حدیث کی تعلیم پائی۔ ۱۷ سال کی عمر میں آپ نے علوم وفنون کی تکمیل کر لی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا نانوتویؒ گھر تشریف لے آئے، جس طرح آج عصری درس گاہوں میں تعلیم پا کر نوکری حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح اُس وقت عربی تعلیم حاصل کر کے نوکری ملتی تھی، لیکن حضرت نانوتویؒ کا رجحان ملازمت کی طرف بالکل نہیں تھا، جس کی وجہ سے ان کے والد شیخ اسد علی کو تھوڑی فکر دامن گیر رہا کرتی تھی کہ ان کا بیٹا اپنی عمر کو پہنچ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور اپنی کمائی سے اپنے پاؤں مضبوط کرے یہ ہر باپ کی فطری خواہش ہوا کرتی ہے، اسی دوران مولانا احمد علی سہارن پوری حجاج سے صحاح ستہ لے کر آئے، ہندوستان میں پریس قائم ہو چکا تھا، انہوں نے مطبع قائم کر لیا تو مولانا نانوتویؒ نے اس مطبع میں تصحیح کتب کی ملازمت اختیار کر لی اور یہیں سے حاشیہ بخاری کا عظیم الشان کارنامہ آپ کے حصہ میں آیا۔

پس منظر

مولانا نانوتویؒ کے نظریہ تعلیم کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کے حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا، ۱۸۴۹ء میں حضرت نانوتویؒ کی رسمی تعلیم سے فراغت ہوئی، یہ وہ زمانہ ہے جس میں مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹا رہا تھا، انگریز صوبہ درصوبہ فتح کرتے ہوئے دہلی پہنچ چکے تھے اور دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی، انگریز ایک چالاک قوم تھی انہوں نے جب ملک پر قبضہ کیا تو ان کے پاس بہت سی پلاننگ تھیں، وہ ہر اعتبار سے اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم کرنا چاہتے تھے اور اس استحکام میں جو بھی رکاوٹیں تھیں وہ ان تمام کو دور کرنا چاہتے تھے، بہادر شاہ کو ملک بدر کر دیا گیا، لال قلعے سے ہندوستانی پرچم اتار کر انگریزی پرچم

لہرادیا گیا، اور ملک مکمل طور پر غلام بن گیا، اس کا زیادہ احساس مسلمانوں کو تھا، اس لیے کہ حکومت مسلمانوں سے چھینی گئی تھی؛ اس لیے مسلمان ہر طرح کی قربانی دے کر ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے، انگریز بھی اس سے ناواقف نہیں تھے، انہیں بھی اس کا احساس تھا کہ مسلمان کسی قیمت بیٹھنے والے نہیں ہیں؛ اس لیے وہ مسلمانوں سے روح اسلام ختم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اقبال نے ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' میں کہا ہے:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز ویمن سے نکال دو

(کلیات اقبال ص:۵۱۰)

انگریز ابلیس کے اس فرمان سے بخوبی واقف تھے؛ اس لیے وہ ہندوستانی مسلمانوں سے فکرِعرب کو نکالنے کی پوری کوشش کرنے لگے، اس کے لیے انہوں نے مختلف اقدامات کئے، ہندوستان میں پادریوں کو بلایا گیا اسلام پر شکوک وشبہات کے تیر برسائے گئے، مسلمانوں اور عیسائی پادریوں کے درمیان مناظرہ کرایا گیا، ، ہندو مسلم میں نفرت پیدا کر کے دونوں گروہ کو آپس میں لڑایا گیا، آریہ سماجوں اور مسلمانوں کے درمیان گرما گرم مباحثے ہوئے، طاقت کے زور پر بھی مسلمانوں کو ڈرایا دھمکایا گیا، سیاسی ومعاشی اعتبار سے مسلمانوں کو مفلوج کر دیا گیا، مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی سرزمین جہاں مسلمانوں نے ایک طویل عرصے تک حکومت کی تھی، اور اسے جنت نشاں اور سونے کی چڑیا بنایا تھا آج وہاں ان کے لیے زندگی گزارنا دشوار ہو گیا تھا ان تمام تر کوششوں کے باوجود انگریزوں کو خاطر خواہ کامیابی نہیں مل پا رہی تھی، اس لیے مزید کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور ہندوستان کی دھرتی پر اسپین کی تاریخ دہرانے اور یہاں سے اسلام کو مکمل نیست ونابود کرنے لیے انہوں نے مسلمانوں کا رشتہ قرآن سے ختم کرنا چاہا، اس کے لیے انہوں نے قرآن کریم کے لاکھوں نسخوں کو

جلا دیا اور پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے انگلستان سے بلایا گیا، کمزور عقیدہ لوگوں کو عیسائیت کی خوب ترغیب دی گئی، جو لوگ عیسائی بن جاتے ان کا نام اخبار میں شائع کرایا جاتا ان کو سہولیات اور ملازمت دی جاتی، ان کے لیے فری ہاسپٹل قائم کئے گئے اور وہاں حضرت مریمؑ کی تصویر کے سامنے سجدہ کرایا جاتا تھا اس طرح انہیں امید ہوگئی تھی کہ اب ہندوستان اسپین بن جائے گا اور یہاں کے مسلمان عیسائیت قبول کرلیں گے۔ انڈیا کی سپریم کونسل کے ایک اہم رکن سر چالس نے جو گورنر کے اہم منصب پر فائز تھا اس نے ایک مرتبہ کہا تھا:

> میں یہ امید قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے لوگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص:۱۴۳)

برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے (حکومت خود اختیاری ص:۱۳۶)

مسلمانوں سے روح محمدی کو ختم کرنے لے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مراکز کو تاراج کیا جائے اور اس کی ہر ممکن کوشش کی گئی، دہلی، آگرہ، ملتان، خیر آباد، بنگال اور بہار کے مدارس جو ہندوستانی سلاطین و امراء کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے ۱۸۸۳ء میں حکومت نے تمام اوقاف کی جائداد کو اپنے قبضے میں لے لیا (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص:۲۰۰) اس زمانے میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ گاندھی جی کی اس تقریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ برٹش گورنمٹ سے پہلے ملک میں ۳۰ ہزار ادارے تھے جن میں دو لاکھ طلبہ تعلیم پاتے تھے آج حکومت دفتری بہ مشکل چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے (اخبار مسافر آگرہ ۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)۔

تعلیم کی طاقت

ان تمام طریقے سے وہ کامیابی حاصل نہیں ہو پارہی تھی جس کی ان کو توقع تھی، اس لیے انہوں نے میدان بدلتے ہوئے تعلیم کو ہتھیار کے طور پر اختیار کیا اس لیے کہ تعلیم کے راستوں ہی سے آدمی کی سوچ اور فکر کو بدلا جاسکتا ہے، تعلیم کی طاقت سب سے مؤثر طاقت ہے، جس کے ذریعہ کلچر اور تہذیب کو بدلا جاسکتا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو فتح کیا جاسکتا ہے، تلوار سے آپ لوگوں کے دلوں کو فتح نہیں کرسکتے ہیں لیکن تعلیم کے ذریعہ آپ دلوں پر حکومت کرسکتے ہیں، آپ لوگوں کے ذہن کو قابو میں کرسکتے ہیں۔ اس لیے انگریزوں نے لارڈ میکالے کو ہندوستان بلایا تاکہ وہ تعلیمی ہتھیار کو استعمال کرکے عیسائی مشن کو کامیاب بنائے۔ لارڈ میکالے ہندوستان آیا اس نے تعلیمی فارمولہ پیش کیا:

> ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں، مگر رجحان، رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہوں (اخبار مدینہ بجنور ۲۸ فروری ۱۹۲۷ء)۔

یہی میکالے ۱۲/ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو اپنی والدہ کے نام خط لکھتا ہے:

> اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال کے بعد یہاں ایک بھی بت پرست غیر عیسائی نہیں رہے گا (وہ جو بیچتے تھے دوائے دل ص: ۳۵)۔

مولانا نانوتوی کی ہمہ جہت سرگرمیاں

یہ وہ انتہائی مایوس کن حالات تھے کہ مسلمانوں سے ان کا ملک چھین لیا گیا، ان کی معیشت چھین لی گئی، اور اب تہذیب اور مذہب سے بے دخل کرنے کی تیاری ہے، ان حالات میں ایک عظیم انقلاب کی ضرورت تھی، اور ایسے مرد مجاہد اور فرد مدبر کی ضرورت تھی جو چوطرفہ مقابلہ کی طاقت رکھتا ہو اور عزم واستقامت کا مضبوط قلعہ ہو، نگاہیں کسی عظیم انسان کو تلاش رہی تھیں، جو وسائل سے آراستہ اور طاقت کے نشے میں چور انگریزوں کے ہمہ گیر فتنہ اور پنجۂ استبداد کا مقابلہ کرسکے، اس سلسلے میں ہمیں جو نمایاں نام ملتا ہے وہ حجۃ الاسلام و

المسلمین، الامام محمد قاسم النانوتویؒ کا ہے۔ مولانا نانوتویؒ نے انگریزوں کے تمام فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ان سے برسر عام مناظرہ بھی کیا، شاملی کے میدان میں سر و جان کی بازی بھی لگائی، ان کے بچھائے ہوئے جالوں کو پاش پاش کیا اور سب سے بڑھ کر ان کے تعلیمی منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے آپ نے نیا تعلیمی فارمولہ پیش کیا اور دارالعلوم دیوبند کی شکل میں اسے عملی جامہ پہنایا۔

مولانا نانوتویؒ کا نظریہ یہ تھا کہ عصری تعلیم کے لیے حکومت ادارے قائم کررہی ہے، اس کی سرپرستی کررہی ہے اور دینی تعلیم جس کے ذریعہ مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ، تہذیب وتمدن اور اسلامی تشخص کی حفاظت ہوگی، اس کو ختم کرنے اور انگریزی کلچر کے فروغ کی مکمل سعی وکوشش ہورہی ہے ایسے حالات میں دینی مدارس کا قائم کرنا بہت ضروری ہے، اور اسے حکومتی امداد سے آزاد رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ اس پر کسی قسم کا کوئی خطرہ درپیش نہ ہو، چنانچہ دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا اور اس کے اصول ہشت گانہ میں اس کی صراحت کی گئی کہ اس کو سرکاری امداد سے محفوظ رکھا جائے۔

مولانا نانوتوی کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ دینی تعلیم کے فروغ پر خاص توجہ دی جائے اور اسے عوامی چندہ پر قائم کیا جائے تاکہ عوام اور علماء کے درمیان رابطہ کی شکل پیدا ہو اور کسی کی اس نظام پر اجارہ داری نہ ہو، حکومت کی دخل اندازی سے نظام تعلیم کو کوئی نقصان نہ پہنچے، حضرت نے جو نظام پیش کیا اس کا زیادہ تر حصہ دینی علوم پر مرکوز تھا اس لیے کہ عصری تعلیم حکومت دے رہی تھی اگر مسلمان بھی عوامی چندوں سے عصری ادارے قائم کرتے تو تحصیل حاصل لازم آتا، اور عوام کو کہنے کا موقع ملتا کہ جو تعلیم حکومت دے رہی ہے اسے عوامی چندے سے قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے، پھر اس وقت سب سے اہم مسئلہ دینی تعلیم کے تحفظ کا تھا اس لیے بھی اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔

نصاب تعلیم اور مولانا نانوتوی

حضرت نانوتویؒ کے نظریۂ تعلیم کو سمجھنے کے لیے اُس وقت کے نصابِ تعلیم پر نظر کرنا بھی ضروری ہے، اُس زمانے میں جو مدرسے تھے وہ زیادہ تر جگہ کے نام سے مشہور تھے،

خیر آباد کا مدرسہ، ٹونک کا مدرسہ، لکھنو میں فرنگی محل کا مدرسہ، رام پور کا مدرسہ عالیہ؛ یہ مدارس زیادہ تر منطق وفلسفہ کی تعلیم وتدریس میں مشغول ومشہور تھے، لکھنو کے فرنگی محل میں کسی حد تک فقہ کی تعلیم بھی جاری تھی، دوسری طرف شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور ان کے خانوادے نے دہلی اور اس کے اطراف میں علم حدیث وتفسیر کی خدمات کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن یہ سلسلہ اب موقوف ہوتا جارہا تھا، آپ کے خاندان کے باقی ماندہ لوگ حجاج مقدس کا سفر کر چکے تھے، حضرت نانوتویؒ کے ذہن میں وسعت وآفاقیت تھی، فکر میں اعتدال کے ساتھ تصلب تھا، آپ نے دارالعلوم کے نصاب میں منطق وفلسفہ کا زور کم کیا، اور شاہ ولی اللہ صاحب کے رائج کردہ حدیث وتفسیر کی کتابوں اور اس نہج کو بھی نصاب کا حصہ قرار دیا، ساتھ میں آپ نے فقہ اور دیگر علوم عالیہ کو مناسب انداز میں شامل کیا، اس طرح حضرت نانوتوی کا تیار کردہ نصاب بالکل منفرد اور ممتاز نصاب ہوگیا، یہ درس نظامی نہیں ہے جیسا کہ یہ لفظ متعارف اور مشہور ہے بلکہ اس وقت رائج تمام نصابوں کا جامع تھا، اس سے حضرت نانوتوی کی فکری آفاقیت اور تعلیمی نقطۂ نظر بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

عصری تعلیم اور مولانا نانوتوی

مولانا نانوتویؒ ایک بہترین ماہر تعلیم تھے، انہوں نے دارالعلوم کے نصاب میں جہاں عربی، فارسی، قرآن وحدیث، فقہ وغیرہ کو اولین ترجیح دی، وہیں ریاضی، ہندسہ، اور علم ہیئت کو بھی نصاب میں شامل کیا، باضابطہ طب کے شعبے قائم کئے گئے، اور دیگر سائنسی علوم کے مقدمہ کے طور پر چند کتابیں الجبرا اور اقلیدس وغیرہ داخل نصاب کی گئیں۔ مولانا گیلانی جن کو فکر قاسمی کا شارح وترجمان کہا جاتا ہے، وہ حضرت نانوتوی اور عصری علوم کے تعلق سے فرماتے ہیں:

> ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں علوم جدیدہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے گویا علوم جدیدہ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا

جا سکتا ہے (سوانح قاسمی۲/۲۸۰)

حضرت نانوتویؒ کے اجمال اور مولانا گیلانیؒ کی تفصیل سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ عصری تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن ایک سوال جو اس وقت بڑے زور وشور سے کیا جاتا ہے کہ نصاب میں تبدیلی ہونی چاہئے اور عصری مضامین کو بھی نصاب کا حصہ بنانا چاہئے، حضرت نانوتویؒ اس سوال سے بھی غافل نہیں تھے، ان کی دور رس نگاہیں اس سوال سے واقف تھیں اس لیے حضرت نے اس سوال کا بہت ہی واضح جواب دیا تھا، جسے مولانا اسیر ادروی نے نقل کیا ہے:

> ہم آدھا تیتر آدھا بٹیر نہیں بنا سکتے، دونوں طرح کے علوم کی مخلوط تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طالب علم کسی بھی علم وفن میں درجہ کمال حاصل نہیں کرسکتا نہ اسے جدید علوم حاصل ہوں گے نہ قدیم علوم (مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۱۶۲)

مولانا گیلانی نے حضرت نانوتوی کا قول نقل کیا ہے:

> زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے (سوانح قاسمی۲/۲۸۳)

فلسفۂ قدیم وجدید

ایک مسلمان کے لیے دینی تعلیم از حد ضروری ہے، اس لیے کہ اس پر آخرت کا مدار ہے، کامیابی کی شاہ کلید ہے، اخروی سرخ روئی کا زینہ ہے، لیکن عصری تعلیم بھی وقت کی ضرورت ہے، اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے، ہمارے مدارس کی قدیم تاریخ یہ ہے اس میں دینی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اور عصری اور سائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے، یہی وجہ ہے تاریخ میں جو مسلم سائنس داں، اطباء، جغرافیہ کے ماہر، اور ایجادات کے ماہرین کا تذکرہ ملتا ہے وہ سب اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، امام غزالی ہوں یا ابن رشد، بوعلی سینا ہوں یا فارابی یا ابن ہیثم سب اسی مدرسے کے فارغ تھے، سب کا لباس اور رہن سہن کا طریقہ ایک تھا اگرچہ ان سب کے میدان الگ الگ تھے۔ پہلے عصری اور دینی علوم کے

نام سے الگ الگ ادارے نہیں ہوا کرتے تھے، ہندوستان میں بھی انگریزوں کی آمد سے پہلے کی یہی صورت حال تھی اور اسی مدرسے سے فارغ طلبہ سرکاری نوکریوں پر فائز ہوا کرتے تھے، لیکن انگریزوں کے ہندوستان آمد کے بعد صورت حال میں تبدیلی پیدا ہوئی اور انگریزوں نے مسلمانوں کا رشتہ قرآن سے کاٹنے کے لیے دینی تعلیم کی جگہ عصری تعلیم کو رائج کر دیا اور دینی تعلیم سے مسلمانوں کو دور کرنے کی کوشش کی، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت نانوتویؒ نے دینی تعلیم کی اشاعت وحفاظت کے لیے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت دینی تعلیم کی حفاظت کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے پوری توجہ دینی تعلیم پر دی گئی اور جس درجہ کے ماہرین کی ضرورت تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ یکسو ہو کر دینی تعلیم حاصل کی جائے، اس لیے آپ نے دارالعلوم کے نصاب میں چند عصری کتابوں پر اکتفاء فرمایا، لیکن حضرت نانوتوی عصری تعلیم کے بالکل خلاف نہیں تھے، بلکہ آپ نے سرسید کے قائم کردہ ادارہ کی حتی الامکان تعریف وتوصیف کی مولانا اسیر ادروی نے لکھا ہے:

> حضرت نانوتوی نے انگریزی تعلیم کے لیے اسکولوں کے قائم کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ مسلمانوں میں سب سے پہلے سرسید نے کوشش کی تو ان کی جد و جہد اور جفاکشی کی تعریف ہی کی (مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۲۱۹)

حضرت نانوتوی نے اگرچہ دینی وعصری علوم کو مخلوط نہیں کیا، لیکن اس کی اہمیت سے آپ نے کبھی انکار نہیں کیا، بلکہ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ جن لوگوں کو عصری علوم پڑھنا ہو مدارس کے نصاب کی تکمیل کے بعد وہ عصری علوم حاصل کریں، آپ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ مولانا گیلانی نے مولانا نانوتوی کے نظریہ تعلیم پر بڑی اچھی بحث کی ہے اس میں انہوں نے حضرت نانوتوی کا جملہ نقل کیا ہے:

> اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہو

نے کے بعد)اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی (سوانح قاسمی۲/۲۸۱)

مولانا گیلانی اس کی تشریح وتفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سیدنا الامام الکبیر نے اپنے اس تعلیمی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب دانش مندی کے فنون کے ساتھ ختم کر لیا جائے، جن کے بغیر خالص اسلامی علوم، تفسیر، شروح احادیث، وفقہ وغیرہ کتابوں کے نہ مطالعہ ہی کی صحیح قدرت پیدا ہوسکتی ہے اور جیسا کہ چاہئے ان کتابوں سے استفادہ بھی بآسانی ممکن نہیں، اس کے بعد جیسا کہ آپ دیکھ چکے صاف اور واضح لفظوں میں اپنی تجویز پیش کی ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے (سوانح قاسمی۲/۲۸۵)

زبان کے تعلق سے مولانا نانوتوی کا نظریہ

موضوع پر بات ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لسانیات کے تعلق سے بھی حضرت کا نظریہ سامنے آجائے تاکہ تعلیمی تجاویز طے کرنے میں سہولت ہو، اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نانوتوی کی زندگی کا زیادہ تر حصہ دفاع عن الدین میں صرف ہوا ہے، آپ کی پوری زندگی دفاع دین اور اشاعت دین سے عبارت ہے، آپ نے آریہ سماجوں، پنڈتوں اور عیسائی پادریوں سے مناظرے کئے اور خوب کئے اور مخالفین کے چھکے چھڑادئے۔ کسی بھی قوم اور زبان کے جاننے والوں سے مناظرہ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیٹریچر کا مطالعہ کیا جائے اس لیے کہنا پڑے گا کہ حضرت نانوتوی فریق مخالف کے لیٹریچر سے کسی حد تک واقف تھے، اگرچہ ہمارے پاس اس سلسلے میں کوئی ایسی شہادت نہیں ہے جو اس جگہ پیش کی جاسکے البتہ زبان کی اہمیت حضرت کے نزدیک کس درجہ مسلم تھی اس کا اندازہ

ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو مولانا گیلانی نے نقل کی ہے:

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے سنی تھی ، اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جارہے تھے تو کپتان جو غالبا کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماوہ دیکھ رہا تھا کہ یہ کون صاحب ہیں، حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے انہوں نے کپتان سے مولانا کے احوال بیان کئے، اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، مولانا بہ خوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں، مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا، وہی انگریزی داں صاحب ترجمان بنے ، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہوگیا اور مولانا کی ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اس نے شاید وعدہ بھی کرلیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر بھی ہوگا۔ اس واقعہ کا مولاناؒ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا، کیوں کہ مولانا کو محسوس ہورہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہورہی ہے (الامام محمد قاسم نانوتویؒ- حیات، افکار، خدمات ص: ۲۸۴)

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے مولانا گیلانی کا وہ اقتباس بھی نقل کر دیا جائے جس میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں مطالعہ ادیان مذاہب کرانے پر زور دیا ہے، جس کی موجودہ ماحول میں بڑی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اس لیے کہ تمام مذاہب کی بنیادی باتوں کو پڑھنا اور برادران وطن کے ساتھ اس سلسلے میں گفت وشنید کرنا وقت کا بہت اہم تقاضہ ہے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

> جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں جب کبھی موقع ہمدست ہوا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت کے سکھانے کا بھی نظم کیا گیا، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لیے بھیجا گیا اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے مروجہ مذاہب وادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرانے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں۔ بلکہ ہندی زبان ناگری خط کے ساتھ جب اس ملک کی دفتری زبان مانی جاچکی ہے تو قدرتاً اس کی وجہ سے اس زبان کی تعلیم کا انتظام زیادہ آسان ہو چکا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی میں منتقل کر دیا جائے، یہ ہمارا ایک تبلیغی فرض ہے، انشاءاللہ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا (سوانح قاسمی ۲/ ۴۷۹)

مولانا نانوتوی کی فکر اور ان کی عملی زندگی اور مولانا گیلانی کی تحریر سے انگریزی، ہندی اور علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ مذاہب ادیان کے مطالعہ کی اہمیت بھی اجاگر ہوجاتی ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے نظریۂ تعلیم کی روشنی میں تعلیمی تجاویز

حضرت نانوتوی کے تعلیمی نظریہ کے مطالعہ کے بعد چند باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں، جنہیں تعلیمی ہدف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

☆ دینی تعلیم ہر شخص کے لیے لازمی ہونی چاہئے اس لیے کہ دین سے اگر ہمارا رشتہ کٹ جائے گا تو ہمارا وجود، ہمارا ایمان، ہماری تہذیب اور ہمارا بقا سب کچھ خطرے میں پڑ سکتا ہے اور مسلمان اس علم سے محروم ہونے کے بعد مسلمان نہیں رہ سکتا ہے، اس لیے سب سے پہلے بچوں کو دینی تعلیم ملنی چاہیے، علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

☆ سر سید نے عصری علوم کا ادارہ قائم کیا تو مولانا نانوتویؒ نے اس کی تعریف فرمائی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عصری ادارے قائم ہونے چاہئے اور اس کی حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہئے لیکن مسلمانوں کے اپنے عصری اداروں میں دینیات کی تعلیم کا بھی معقول نظم ہونا چاہئے تاکہ طلبہ دینی تعلیم سے بے بہرہ نہ رہ جائیں، یہ ہماری بہت بڑی کمزوری ہے، اس جانب خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ ایسا بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پہلے عصری تعلیم دے دی جائے پھر دینی تعلیم دی جائے اس لیے کہ بچپن میں جو تعلیم دی جائے گی اس کا نقش دل میں اس طرح بیٹھ جائے گا کہ بعد میں وہ دینی تعلیم کی طرف مائل ہی نہیں ہوگا۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ بچوں کو عصری تعلیم دلا کر کسی عالم یا حافظ کو گھر میں رکھ کر قرآن اور ضروری بنیادی تعلیم دلا دی جاتی ہے لیکن اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا ہے اور بچوں میں اس طرح اسلامی رجحان پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔

☆ دینی تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد طلبہ عصری علوم کی تحصیل کے لیے یونیورسٹی اور کالج جا سکتے ہیں، جہاں وہ اپنی تعلیم کے اثر و رسوخ کو بھی قائم کریں گے اور ان کی صلاحیت میں مزید پختگی بھی پیدا ہوگی وہ دین و شریعت کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضوں اور چیلنجوں کو بھی قبول کر سکتے ہیں۔

☆ مولانا گیلانی نے حضرت نانوتوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہیں عصری تعلیم

کا مقدمہ پڑھا دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں چند ایسی کتابیں شامل کی جاسکتی ہیں جس سے عصری تعلیم کی تمہید بچوں کو معلوم ہوسکیں اگر وہ عصری مدارس میں جائیں تو آسانی سے کامیابی کا زینہ طے کرسکیں، اور اگر وہ عصری اسکول میں نہ بھی جائیں تو زندگی میں یہ تعلیم اس کی بنیادی ضرورت کو پورا کرسکے، لیکن یہ شمولیت اسی حد تک ہونی چاہیے کہ دینی علوم کی پختگی میں کسی قسم کا رخنہ نہ پڑے، مثلا ابتداء کی چند کلاسوں میں انگریزی کی ابتدائی چند کتابیں پڑھا دی جائیں تاکہ طلبہ اس زبان سے کسی حد تک واقفیت حاصل کرکے اپنی دنیوی ضرورت کو کسی حد تک پوری کرسکیں۔

☆ آٹھ دس سال دینی تعلیم دے کر دنیاوی ضرورتوں سے بالکل بے بہرہ رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے، اس صورت حال میں جب فضلاء مدارس کو بعض دنیوی دشواری کا سامنا ہوتا ہے تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ دارالعلوم نے ہمارے دس سال برباد کردئے، ہمیں کچھ بھی دنیوی معلومات نہیں ہے اگرچہ ایسے فضلاء کی باتوں سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ابتدائی جماعتوں میں بھی کچھ عصری مضامین پڑھادئے جائیں تو کسی حد تک ان کی ضرورتوں کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

☆ ہمارے مدارس کے نصاب میں بحیثیت زبان انگریزی کو بھی شامل کرنی چاہئے، اس لیے کہ یہ اس وقت عالمی زبان ہے جس کی ہر وقت اور ہر سطح پر ضرورت پڑتی ہے، الحمدللہ، اللہ کا شکر ہے کہ ارباب مدارس نے اس جانب توجہ دی ہے اور مدارس میں انگریزی کو بھی نصاب کا حصہ بنایا ہے، یہ ہماری ایک ضرورت ہے۔

☆ مطالعۂ مذاہب ادیان بھی ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہئے، موجودہ حالات میں اس کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے ایک سوامی اور پنڈت ہمارے پروگراموں میں آتا ہے اور اسلام کی بنیادی باتیں بتا کر چلا جاتا ہے لیکن ہم ان کے پروگرام میں جاکر ان کے مذہب کی ابتدائی باتیں نہیں کرسکتے ہیں، آج اس کی ضرورت ہے اگر ہم باضابطہ اس کو نصاب میں شامل نہیں کرسکتے ہیں تو کم از کم خارجی مطالعہ میں ہی اس کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا انصار احمد معروفی قاسمی۔ مدرسہ چشمۂ فیض، ادری، مئو

مدارس کے نصاب تعلیم میں تجدید وتوسیع کی ضرورت

اس بات پر تمام علما ودانشوران متفق ہیں کہ تعلیم کا مقصد روزگار کا حصول اور ملازمت نہیں، بلکہ تعلیم کا مقصد انسان کو اللہ تعالی سے ملانا اور انسان کو انسان بنانا ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم کی پہلی وحی؛ جس میں اسے پڑھنے کا حکم دیا گیا تو رب کے نام سے پڑھنے کے حکم کے ساتھ خالق کائنات کا تعارف کرایا گیا، جس سے تعلیم کی مقصدیت کی طرف اشارہ کردیا گیا۔

ہمارے ملک کا نظام سیکولر ہے، باضابطہ دینی تعلیم عام اسکولوں میں نہیں دی جاسکتی اس لئے علیحدہ ادارے کھولے جاتے ہیں جو مدارس کہلاتے ہیں، دینی مدارس اسلام کی حفاظت کے مستحکم قلعے ہیں جن کے ذریعے اصول اسلام کے محافظین کی فوج تیار کی جاتی ہے، مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد اسلامی تعلیم کا فروغ، اس کی توسیع اور حفاظت ہے، اسی لئے اس کا ایسا نصاب تیار کیا گیا، جس کے ذریعے ایسے علما کی جماعت تیار ہو جو راسخین فی العلم ہوں، کامل الیقین ہوں، اور علم وعمل کی پختگی کے ساتھ جہاں وہ اپنے مذہب کی تبلیغ اور اس کی نشر واشاعت پر کمر بستہ ہوں، وہیں فرق باطلہ کی تردید، بدعات ورسومات کی بیخ کنی اور اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا تسلی بخش، اور مدلل جواب دے سکیں۔

<u>دور جدید اور نصاب قدیم گویا نئی فوج کے ہاتھ میں پرانا ہتھیار:</u> درس نظامی کا یہ نصاب عرصۂ دراز سے رائج ہے، اور کسی بڑی بنیادی تبدیلی کے بغیر جاری ہے، اس میں عموماً جو کتابیں داخل نصاب ہیں وہ تقریباً پانچ چھ صدی قبل لکھی گئی ہیں، ہر زمانے میں جو کتابیں تصنیف کے مراحل سے گذرتی ہیں وہ اپنے دور کے ماحول اور اثرات کی مکمل عکاسی کرتی ہیں اسی لئے ان کا تصنیفی اسلوب بھی اتنا ہی پرانا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پورے درس نظامی پر قدیم منطقی چھاپ نظر آتی ہے۔

مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تبدیلی کے لئے پرزور آواز میں مطالبہ کیا جارہا ہے،

یہ مطالبہ جہاں جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کی جانب سے کیا جارہا ہے وہیں مدارس کے قابل ذکر علما کی طرف سے بھی اس کا تقاضہ جاری ہے۔

مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی (دیوبند) نے نصاب تعلیم کی تجدید وتوسیع کے سلسلے میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالبات کے پیش نظر علما کی طرف سے کیا جوابات دیئے جارہے ہیں؟ اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں ''علمائے دین کی جانب سے اکثر وبیشتر دوطرح کے جوابات دے کران باتوں کونظرانداز کردیا جاتا ہے۔

تبدیلی نصاب کا مطالبہ اور علما کا جواب: پہلی بات علما کی جانب سے یہ کہی جاتی ہے کہ دینی مدارس خالص دینی تعلیم کے لئے ہیں، اور ہم عصری علوم کو دینی مدارس کے نصاب میں جگہ دے کر دینی مدارس کو عصری کالجوں میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے، دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے ساتھ عصری علوم کا بوجھ بھی طلبہ پرڈال دیا جائے، طلبہ اس بارگراں کے متحمل نہ ہوسکیں گے۔

پھر مولانا نے اس جواب پر عدم تسلی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' دینی مدارس کے فارغ طلبہ کو بھی اسی دنیا میں جینا ہے، لہٰذا بقدرضرورت عصری علوم بھی: جومحض علمی ضرورت ہی نہیں بلکہ اس دور میں ضروریات زندگی میں شامل ہیں، حاصل کرنا ضروری ہے، یعنی مختصراً علم ریاضی، سائنس، تاریخ وجغرافیہ اورعصری زبانیں وغیرہ، آپ دینی تعلیمی پہلوؤں کو حاوی رکھتے ہوئے ان علوم اورزبانوں کو بھی ضمنی طور پر نصاب تعلیم میں جگہ دیں تاکہ مدارس سے فارغ طلبہ سماج میں دوسروں کے کندھے سے کندھا ملاکر چل سکیں۔

بے ضرورت بوجھ: طلبہ پر بے ضرورت بوجھ کی ایک مثال ہمارے موجودہ نصاب تعلیم میں یہ ہے کہ ''اس نصاب تعلیم کے ابتدائی تین چار برسوں تک نوے فیصد دباؤ عربی گرامر نحو وصرف کو پڑھانے اور سکھانے پر ہوتا ہے، کسی بھی زبان کی گرامر پڑھانے کا مقصد وہ زبان سکھانی ہوتی ہے، عربی نحو وصرف پڑھانے کا مقصد عربی زبان وادب سکھا کر قرآن وحدیث کے ماہرین پیدا کرنا ہوتا ہے، مگر اس نصاب تعلیم کا نصف حصہ نحو وصرف کے اردگرد گھومتا ہے، جس سے بسا اوقات طالب علم ایک نحوی یا صرفی تو بن جاتا ہے لیکن محدث ومفسر کم ہی بن پاتا ہے،

ہمارے مدارس میں عربی درجات کی شروعات عربی زبان کی قواعد یاد کرانے سے کی جاتی ہے، مثلا نحو میر اور میزان الصرف، ابتدائی درجات کے ایک ننھے سے طالب علم پر بیک وقت تین تین زبان کا بوجھ ڈال کر عربی کے گرامر سکھائے جاتے ہیں، عربی قواعد سکھانے کے لئے فارسی زبان کا سہارا لیا گیا، اس طرح اردو، فارسی اور عربی یعنی تین زبان کے ذریعے عربی کا ایک اصول سکھایا گیا، بچہ کی مادری زبان اردو ہے، اسے عربی زبان کا گرامر سکھانا ہے، غور کیجئے کہ ایک ہی وقت میں بچے کا دماغ ہم کتنی قوتوں میں ضائع کر رہے ہیں، اس کی دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے، فارسی کا سمجھنا، عبارت کا حل کرنا، اور عربی گرامر کو سمجھنا اور حل کرنا۔

ہمارے یہاں استخراجی طریقے سے اصول وقواعد سکھائے جاتے ہیں، تعریفیں اور اصول رٹوائے جاتے ہیں پھر ان کی مثالیں فراہم کی جاتی ہیں، یہ طریقہ نہایت ہی خشک اور بے جان ہے، اس طریقے میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ طالب علم گرامر کو ایک جداگانہ مضمون سمجھنے لگتا ہے۔

<u>اس مشکل کا حل:</u> مولانا محمد اسلم صاحب نے اس کے حل کے لئے یہ تجویز رکھی ہے کہ ''بہتر ہوگا کہ نحو وصرف کا ایک آدھ مختصر رسالہ اردو زبان میں پڑھا کر گرامر کی کوئی ایک تفصیلی کتاب مثلا ہدایۃ النحو پڑھانے پر اکتفا کر لیا جائے، آج کے دور میں کافیہ اور شرح جامی کے سوال وجواب کی طویل بحثوں کی ضرورت نہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ کیوں کہا، اور یہ کیوں نہیں کہا؟ اور ایسے کیوں کہا اور ویسے کیوں نہیں کہا؟ اور اس کا جواب یہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ہدایۃ النحو کے بعد کافیہ جیسی مغلق کتاب پڑھانا اور کافیہ جیسی مشکل اور مغلق کتاب کو پڑھانے کے بعد اگلے سال میں اس کی شرح طویل یعنی شرح جامی جیسی ضخیم کتاب پڑھانا طلبہ پر بے ضرورت بوجھ بڑھانے کے سوا کچھ نہیں، عبارت کی پیچیدگیاں، لفظی مغلقات اور نحوی باریکیوں کو سمجھنے کے چکر میں مقصود اصلی فوت ہو جاتا ہے''، آج کے زمانے میں سیدھے طور پر عربی زبان وادب کو سیکھ کر قرآن وحدیث کو سیکھنے کی زیادہ ضرورت ہے، لہٰذا اس طرح کی کتابوں کو الگ کر کے عصری زبانیں یا عصری علوم پڑھائے جاسکتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صرف قواعد کے رٹ لینے یا پڑھ لینے سے طالب علم اس زبان میں ماہر نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان قواعد کا اجرا نہ کرایا جائے، اور تمام قواعد کا ''انشا'' کے ذریعے انطباق نہ کرا دیا جائے، جب کہ انشا کی طرف سے آج ہمارے مدارس میں بہت بے توجہی

برتی جارہی ہے، اور سارا زور قواعد کے پڑھنے پڑھانے پر دیا جارہا ہے، حالاں کہ صرف ''معلم الانشا'' کے حصے کو اگر صحیح طور پر پڑھا اور لکھا دیا جائے، اور سامنے اس کی تحریری مشق کرادی جائے تو نحو وصرف کے تمام قواعد ذہن نشین ہوجائیں گے، دراصل ہم پرانے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ اس کے اندر کسی بھی طرح کی تبدیلی ہمیں گناہ کبیرہ محسوس ہوتی ہے، جب کہ جدید طریقۂ تعلیم کو اپنانے سے زیادہ فوائد کی امید کی جاسکتی ہے، ارشادنبوی ''**خذ ما صفا دع ما کدر**'' آخر کس کے لئے ہے؟ اور اس کے مطابق راستہ اختیار کرنے میں کیوں تردد ہوتا ہے؟

علم کی تقسیم: اور امت کی قیادت: کیا علم کی دینی اور دنیوی تقسیم درست ہے؟ اور یہ تقسیم کس وقت وقوع پذیر ہوئی؟ کیا دور نبوی، دور صحابہ اور تابعین میں بھی یہ تقسیم تھی؟ اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی تعلیم کے سلسلے میں یہ دور جحان کارفرما تھے؟ دینی اور دنیوی علوم کی دو الگ الگ تقسیم سے ہمیں کیسے کیسے دن دیکھنے پڑے؟ اور پوری امت بعد کے زمانے میں انحطاط کے آخری زینے پر کیسے پہنچی؟ اور کس طرح وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل کرسکتی ہے؟ آیئے اس بارے میں مقتدر علمائے کرام کے خیالات کو جاننے کی کوشش کریں۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں: ''جدید علوم سے بے خبر علما اسلام کی سچی خدمت انجام نہیں دے سکتے، آج ہم ایک تماشائی بن کر زندہ نہیں رہ سکتے ہیں، یورپ کی جملہ علوم وفنون میں ترقی اور ان کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے شمس العلما علامہ شبلی نعمانیؒ نے ۱۹۰۹ء میں کہا تھا کہ ''ہندوستان میں موجودہ سلطنت اور یورپین علوم وفنون کے اثر سے قوم کے خیالات میں، معلومات میں عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگیا ہے، ایسی حالت میں کیا وہ علما قوم کی رہبری کرسکتے ہیں جو آج کل کے علوم، آج کل کی تحقیقات اور آجکل کے حالات سے محض ناآشنا ہوں، (ملت اسلامیہ کا عروج وزوال ۱۴۱، ڈاکٹر اقتدار فاروقی)

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے تحریر کیا ہے: ''غفلت اور سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہوچکی ہیں، اب خدا کے لئے بستر سے اٹھ کر دیکھئے کہ آفتاب کہاں تک پہنچ چکا ہے (حوالۂ بالا) مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں: ''سولہویں اور سترھویں

صدی میں یورپ اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا، اور ایک جوش وجنون کی حالت میں اٹھ کر غفلت اور جہالت کی طویل زمانے کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبۂ حیات میں ترقی کررہا تھا طبعی قوتوں کو مسخر کررہا تھا، ہر علم وفن میں ان کی فتوحات اور انکشافات جاری تھے، اس مختصر مدت میں ان کے یہاں عظیم محقق، موجد اور مجتہد پیدا ہوئے، مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت وعلوم نظریہ اور صنعت وحرفت ہی میں نہ تھا، بلکہ ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا۔ یہ انحطاط یہاں تک پہنچا کہ قوم وملت کی رہنمائی تو دور کی بات ہے، آج وہ رہبر خود اپنی رہبری کا محتاج ہے، اپنے کام کو لے کر کسی بھی آفس میں چلے جایئے، مولوی نما صورت دیکھتے ہی اس دفتر کے رشوت خور حکام اور کلرک کو تو چھوڑ دیجئے، ہماری لسانی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے چپراسی میڈیم تک کے لوگ ہمیں اپنے جال میں پھنسانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کی خاطر تیزی سے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود رہتے ہیں، اسٹیشنوں اور اس طرح کی دوسری جگہوں پر ایسے لوگ ہماری تاک میں رہتے ہیں، وہ مولوی ملا کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارا شکار آ گیا ہے، گویا آمدنی کا راستہ کھل گیا ہے۔

<u>ہمارا شاندار ماضی:</u> خیر القرون کے زمانے سے لے کر ایک ہزار سال تک علم کی آج کی تقسیم نظر نہیں آتی، دینی وعصری تعلیم کے الگ الگ اداروں کے قیام نے ملت کو دولخت کر دیا ہے، اس لئے جنہوں نے عصری تعلیم حاصل کی وہ دین کی مبادیات سے بھی بے بہرہ ہوگئے، اور جنہوں نے دین کی تعلیم حاصل کی انہیں دنیا ومافیہا کی خبر نہیں، اگرچہ ''**العلم علمان، علم الاد یان وعلم الابدان**'' کا مقولہ مشہور ہے، مگر علم الابدان کا یہ مقولہ صرف طب وصحت کے فروغ اور اس کی اہمیت بتلانے کے لئے ہے نہ کہ اس کے متوازی کسی الگ ادارے کے قیام کے لئے، کیا نبی اکرم ﷺ نے طب وصحت کے متعلق رہنما اصول ارشاد نہیں فرمائے ہیں؟ اور کیا انہوں نے غیر عربی زبانوں کے سیکھنے کے لئے احکام جاری نہیں کئے ہیں؟ کیا قرآن کریم میں علوم دین ودنیا کی تقسیم کا کوئی خط امتیاز کھینچا گیا ہے؟ کیا اپنے تحفظ کے لئے ہر طرح کی تدابیر جنگ وحرب اور دوسرے اس قسم کے اصولوں کی جانب توجہ اس کے اندر نہیں دلائی گئی ہے؟ یا ان چیزوں کے حصول کے لئے جدا جدا اداروں کے قیام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

جب تک علوم کی یہ تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی اس وقت ہر صدی کے علمائے کرام کے اندر جامعیت کا وصف موجود تھا، اس کی بدولت مسلمان چار سو سال تک علوم کے قافلہ سالار بن گئے تھے، ان کی عسکری تسخیرات ان کی ذہنی فتوحات کے شانہ بشانہ چل رہی تھیں، کتنی ایسی ایجادات ہیں جن کے موجد ہونے کا سہرا صرف اور صرف مسلمانوں کے سر ہے، جب کہ اس زمانے میں یورپ ابھی جہالت کی ظلمات کے دبیز پردوں میں لپٹا ہوا تھا، میں نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بغداد منور تھا یورپ تھا اندھیروں میں
روشن ہوا اب یورپ ، بغداد پہ ظلمت ہے

وصف جامعیت: آپ مسلم سائنس دانوں کی تاریخ پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ زکریا رازی طب، کیمیا، اور فلکیات میں، جابر بن حیان کیمیا میں، الزہراوی جراحی اور طب میں، خوارزمی ریاضی، جغرافیہ اور الجبرا میں ابن الہیثم طبیعیات، اور بصریات میں، ابو کامل ریاضی اور الجبرا میں ،ابن سینا طب، اور فلکیات وغیرہ میں ماہر تھے بلکہ بعض ان میں اس کے موجد بھی تھے، یہ تو ’’مشتے ازخروارے‘‘ کے بمصداق نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا نام ہے، ورنہ آج اہل یورپ بھی اس بات کے معترف ہیں کہ جس زمانے میں یہ حضرات سائنسی میدان میں ترقیات پہ ترقیات، اور ایجادات پیش کر رہے تھے، اس زمانے میں ہم لوگ خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔

جن حضرات کا نام اوپر لیا گیا یہ سائنس کے مذکورہ شعبے میں مہارت تامہ کے ساتھ دینی اور اسلامی علوم پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے، اور نہ صرف علوم اسلامیہ میں ماہر تھے بلکہ ان کی ان علوم میں تصانیف بھی پائی جاتی ہیں، سوال یہ ہے کہ ان علما اور سائنس دانوں نے کیا وہ علوم الگ الگ درس گاہوں میں حاصل کئے تھے؟ یا اس زمانے میں اس کے لئے جدا جدا تعلیم گاہیں موجود تھیں؟ نہیں ایسا نہیں تھا، بلکہ ایک ہی ادارے میں ایک چھت کے نیچے یہ تمام علوم پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔

آدم سے محمد علیہم السلام تک علم ہی علم: اللہ تعالی نے سب سے پہلے انسان اور نبی حضرت آدم علیہ السلام کو حیات کے تمام علوم سکھلائے اور ’’ **وعلم آدم الاسماء کلھا** ‘‘ میں اسماء کے جمع کے ذکر کے علاوہ اللہ نے اس کی تاکید میں کلھا کا بھی اضافہ فرما کر اس کے ہمہ جہتی کی طرف

اشارہ فرما کر انہیں مسجودِ ملائکہ بنادیا، اس کے بعد سب سے آخری نبی سید الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذکر میں " **وعلمک مالم تکن تعلم ، وکان فضل الله علیک جمیعا** " میں آپ کو سکھلائے گئے علوم کی وسعت، کاملیت اور جامعیت کی طرف روشنی ڈالی گئی۔

سینکڑوں سال پہلے جو نصاب تیار کیا گیا تھا واقعی وہ اپنے وقت کا بہت اہم، پرمغز اور محیط نصاب تعلیم تھا، جو اس وقت کے تمام دینی وعصری تقاضوں کو پورا کر رہا تھا، مگر آج اس کی افادیت کم ہوگئی ہے، زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے، اس تبدیلی کے پیش نظر اب نصاب تعلیم میں سے کچھ چیزیں گھٹانے اور بڑھانے کی ضرورت ہے،" یہ ایک تاریخی غلطی تھی کہ علم کو دو حصوں میں بانٹا گیا قرآن وحدیث میں جہاں جہاں علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے وہاں پر علم کے عمومی لفظ کا استعمال ہوا ہے، عالم وہی شخص کہلانا جانا چاہئے جو دینی علوم میں مہارت رکھنے کے ساتھ دنیاوی پہلو پر بھی نظر رکھتا ہو، (ماہنامہ اردو دنیا، جولائی ۲۰۰۳ء) اگر چہ یہ زمانہ تقسیم علم کا ہے اور ہر ایک میدان میں علم کے ماہرین اور متخصصین تیار ہورہے ہیں، لیکن تخصص کی راہ کچھ دور جا کر منقسم ہوتی ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے علوم سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، البتہ کسی ایک فن میں مہارت کے ساتھ دیگر علوم میں وہ ماہر نہیں ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی کئی دہائی قبل یہ خواہش تھی کہ دینی علوم کی کچھ سالوں تک اجتماعی اور عمومی تعلیم ہو، اور اس کا نصاب مختصر ہو پھر جو طلبہ آگے پڑھنا چاہیں اور ان کا ذہن اس لائق ہو ان کے لئے دوسرا ایسا نصاب ہو جس کے ذریعے وہ علوم اسلامیہ میں ماہر ہوسکیں۔

<u>نصاب تعلیم اور دیوبند کا ابتدائی دور:</u> امام غزالیؒ سے لے کر دارالعلوم دیوبند کے شروعاتی دور تک ہمیں اس طرح کی تقسیم نظر نہیں آتی، اس دور کے علما کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علم، دین ودنیا کے تمام داخلی اور خارجی پہلوؤں پر محیط ہے، اس دور کے نصاب تعلیم میں جہاں ایک طرف قرآن وحدیث، علم کلام وفقہ شامل تھا، وہیں ریاضی، ہیئت، منطق، فلسفہ، اور علم طب بھی پڑھائے جاتے تھے۔

<u>شنیدہ کے بود مانند دیدہ؟</u> "جان پومر" ایک انگریز معائنہ کار ہے، جس نے <u>۱۸۷۵ء</u> میں دارالعلوم دیوبند کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا ہے" میری حیرت کی کوئی انتہا

نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ کہ مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہورہے ہیں جو میں نے کبھی ڈاکٹر ''اسپرنگر'' سے بھی نہیں سنے تھے، یہاں سے اٹھ کر میں دوسری دالان میں گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے بیٹھے ہیں، یہاں ''اُقلیدَس'' کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے اختلاف بیان ہورہے ہیں، اور مولوی صاحب اس پر ایسی برجستگی سے بیان کررہے ہیں کہ گویا اقلیدس کی روح ان میں آگئی ہو، اس دوران مولوی صاحب نے جبر ومقابلہ ٹاہنٹر سے مساوات درجہ اول کا ایک ایسا مشکل سوال طلبہ سے پوچھا کہ مجھے اپنی حساب دانی پر پسینہ آگیا، میں یہاں سے ایک زینہ پر چڑھ کر دوسری منزل پر گیا، میں نے دیکھا کہ دواندھے بیٹھے بڑبڑارہے ہیں، میں دبے پاؤں ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کررہے ہیں۔

یہ ایک تفصیلی رپورٹ ہے جس کا یہ مختصر سا اقتباس یہاں نقل کیا گیا ہے، اپنی رپورٹ میں جان پومر نے کہا ہے ''میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ کوئی فن ایسا نہیں جو یہاں نہ پڑھایا جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ صرف کرکے ہوتا ہے وہ یہاں پر ایک مولوی صرف چالیس روپئے میں کررہا ہے۔ (الرشید بحوالہ اردو دنیا، جولائی ۲۰۰۳ء)

<u>ومن ترکی نمی دانم:</u> درس نظامی میں دعوت وتبلیغ کے کام کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے، مشن اسکولوں سے نکلنے والا ہر بچہ با قاعدہ ایک عیسائی مبلغ ہوتا ہے، مگر ہم دفاع کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں، ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ اور منصوبہ بند طریقے سے فی الحال گوشت، طلاق، جہاد، دہشت گردی اور مسلم پرسنل لا کا معاملہ اٹھا کر دنیا بھر میں مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ہندی میڈیا کے ذریعے غلط تصویر پیش کی جارہی ہے، مگر ہم میں سے بہت سے لوگ ہندی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے سمجھ بھی نہیں پاتے، چہ جائیکہ اس کا جواب مدلل طریقے سے دے سکیں، انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو کچھ لکھا اور پیش کیا جارہا ہے بھلا اس سے ہم کس طرح واقف ہوسکتے ہیں، کہ وہ تو ''زبان یار من ترکی'' والی بات ہوگی، اگر کوئی مولوی اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوتا ہے تو یقیناً اس نے انگریزی یا ہندی زبان فراغت کے بعد کسی کالج وغیرہ میں پڑھی ہوگی، شاید اسی عجز ولاچاری کو دیکھ کر علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے ؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام؟

اس کے بالمقابل بہت سے دقیانوسی مزاج حضرات؛ ان طلبہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو کسی دینی مدرسہ سے فراغت کے بعد کالجوں یا یونیورسیٹیوں کا رخ کرتے ہیں اور عصری تعلیم کے لئے جامعات کا انتخاب کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اب ہمارے ہاتھوں سے گیا، اسے وہ ترقی معکوس سے تعبیر کرکے اس کا حوصلہ پست کرنے کی سعی مذموم بھی کرتے ہیں، مولانا محمد اسلم صاحب نے لکھا ہے کہ ''میرے ایک قریبی دوست نے درس نظامی سے فراغت کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی میں داخلہ لیا، تو ان کے ایک قریبی استاد نے اس پر یوں اظہار خیال فرمایا کہ ''جناب تو گھوڑے سے اتر کر گدھے پر بیٹھ گئے''، جب کہ علم دین میں پختگی کے ساتھ عصری زبانوں کے ماہرین اسلام اور مسلمانوں کی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں، حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے، جن کے ذریعے آج پوری امت کو عموی نفع پہنچ رہا ہے۔

<u>المیہ:</u> دیوبند اور اس سے مربوط مدارس کا حال تقریبا یکساں ہے، الا یہ کہ بعض وہ ناظم جنہوں نے عصری تقاضے کو محسوس کیا، تو انہوں نے اپنے طور پر بعض تبدیلیاں کیں، اور کم از کم اپنے یہاں انگریزی زبان کو عربی چہارم یا پنجم تک داخل کیا، ورنہ اکثر مدارس اس سے محروم ہی ہیں یا اگر انہوں نے کسی درجہ میں اس کو شامل بھی کیا تو نہ جانے کیوں، اسے ذمہ داروں کی بے توجہی کہئے، یا پھر کسی بدروح کا اثر کہئے؛ انگریزی کی جانب طلبہ کی ویسی ہی بے توجہی دیکھی جاتی ہے جیسی وہ قرات کے بارے میں کرتے رہتے ہیں، اور بعد میں پچھتاتے رہتے ہیں، اسی کے پہلو بہ پہلو دارالعلوم ندوۃ العلما اور اس کے ملحقات ادارے، نیز جامعۃ الفلاح، مدرسۃ الاصلاح وغیرہ مدارس میں دیگر عصری مضامین نہ سہی؛ مگر انگریزی زبان سکھانے کا بہتر نظم ہے، اسی لئے انہیں میں سے زیادہ تر طلبہ عصری جامعات کا رخ کرتے ہیں، اور خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، جب کہ دیوبند اور اس سے مربوط مدارس کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود عصری اداروں میں ان کی تعداد نہایت کم ہے، پھر بھی بہت سی یونیورسیٹیوں نے دیوبند کی سند فضیلت کو مذکورہ اداروں کے مساوی تسلیم

کر کے بی اے میں راست داخلے کے لئے منظور کرلیا ہے، یہ کہنا کہ فراغت کے بعد ہم نے الگ سے اس زبان کی تعلیم کے لئے شعبہ کھول لیا ہے، کافی نہیں، کیوں کہ اس میں سب بچے داخلہ نہیں لے سکتے، دوسری بات یہ کہ سب کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا، نیز جو تعلیم نصاب کے ساتھ مسلسل جاری رہتی ہے، اسی کے فوائد سامنے آتے ہیں۔

سید حامد صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''تعلیم ابدی قدروں کی حامل وشارح ہوتی ہے، تہذیب نے قرنہا قرن میں جو ترقیاں کی ہیں وہ دراصل مذہب کے سائے میں رونما ہوئی ہیں، صنعتی انقلاب، اور علوم وفنون کی ترقی سے ہم نے آنکھیں بند کرلیں وہ ہم سے کترا کر نکل گیا، لیکن صنعتی انقلاب سے بھی بڑا انقلاب ''ذرائع ابلاغ'' کا ہے جس کی پکڑ میں سارے شعبے آگئے ہیں، اس سے ہم دور ہیں، وہ قوم جو داعی بن کر آئی تھی، آج تمام شعبوں میں مدعو بن کر لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے، وہ مسائل جو مذکورہ ترقیات نے پیدا کئے ہیں ان کو وہ آخر کس طرح حل کر پائیں گے؟

اگر چہ ان جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے آج کئی فقہی اکیڈمیاں قائم ہیں، مگر ان مسائل سے واقفیت، ان کی تہ در تہ گہرائی، ان کی نوعیت کے بارے میں تفصیلی معلومات ہمیں اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے بارے میں جدید انگریزی داں اور ڈاکٹرس حضرات ہی اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

وہ علوم؛ جن کا محور انسان کی ذات ہے یعنی عمرانیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، انسانیات اور تاریخ نگاری وہ کس قدر پیش رفت کر چکے ہیں، ہم ان سے ناواقف ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ قدیم کتب فقہ کو مختصر کر کے جدید فقہی مسائل کی کتب کا اضافہ کیا جائے، معقولات قدیمہ منطق وفلسفہ کو دفتر آثار قدیمہ کے حوالے کر کے اس کی جگہ جدید سائنس کا اضافہ کیا جائے، اسی کے ساتھ علم کلام کو جدید اسلوب میں ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس کے لئے بین المدارس ورکشاپ کے ذریعے اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری۔ مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ مبارکپور اعظم گڑھ

اکابر دیوبند کا نظریۂ تعلیم

تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے، تخلیق آدمؑ کے وقت ہی اللہ تعالی نے اس کی صراحت کردی تھی۔ ارشاد ربانی ہے۔ **وعلم آدم الاسماء کلمھا** ۔ سکھائے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام (بقرہ ۳۱)۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ **وعلم الانسان مالم یعلم** ۔(علق ۵)اور سکھایا انسان کو وہ جو وہ نہیں جانتا تھا۔ پھر انسانوں میں ہی وہ انسان جو مقصود کائنات ہیں یعنی مسلمان کلمہ گویان اسلام۔

اس بنیادی ضرورت ہی انہیں کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ حدیث نبوی ہے۔ **لن یشبع المومن من خیر یسمعہ حتی یکون منتھاہ الجنۃ** (رواہ الترمذی، مشکوۃ ج ا ص ۳۴)۔ مومن خیر (علم) سے کبھی شکم سیر نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اس کا ٹھکانا جنت ہوجاتا ہے۔

اکابر دار العلوم دیوبند، جنہیں غیر منقسم ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد اللہ تعالی نے احیاء اسلام کے لئے چن لیا تھا۔ جن کے اخلاص نیت، جہد مسلسل، کوشش پیہم، اسی کے ساتھ ان کی صفات حمیدہ اور خصائل فاضلہ اس کی شاہد عدل ہیں۔

اکابر دیوبند نے مسلمانوں کے نظریۂ تعلیم سے جس قدر اعتناء کیا ہے اور اس کی طرف جو توجہ کی ہے، وہ بے نظیر بھی ہیں اور لازوال بھی، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ان کے نظریہ اور تعلیم کے سلسلے میں ان کی مساعی جمیلہ کی، ماضی کی قریب ہی پوری دنیا میں مثال نہیں ملتی، تو یہ ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔

اکابر دیو بند کے نظریہ تعلیم اور اس کے مطابق، ان کی زمینی جدو جہد نے برصغیر میں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ مسلمانوں کی رگ حیات ہی حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی کا لہو دوڑا رہا اور وہ مزاج بنا دیا، جس کا نمونہ اور مشاہدہ ہم آئے دن پوری دنیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں غیر منقسم ہندوستان، ہند، پاکستان، بنگلہ دیش کے مسلمانوں میں دیکھتے ہیں۔

اکابر دیو بند کے نظریہ تعلیم کو درج ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) ٹھوس دینی تعلیم

ابتداء سے لے کر آج تک دارالعلوم دیو بند اور اس سے منسلک وہم مشرب مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم اس کا غماز ہے، اسی لئے یہ مدارس دین اسلام کے قلعے کہلاتے ہیں۔ دارالعلوم دیو بند اپنے نظام تعلیم کی وسعت، رسوخ علم، اتباع سنت میں پختگی اور علو دینیہ اسلامیہ (تفسیر، حدیث، فقہ، کلام) میں گیرائی و گہرائی کے بنا پر برصغیر میں منفرد تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے نصاب تعلیم میں علوم اسلامیہ کی ان نابغہ روزگار کتب کو رکھا گیا ہے، جو استعداد سازی میں بھرپور معاون ہوں، اسی طرح ان کتب کو عام طور پر مکمل پڑھایا جاتا ہے، نہ کہ ادھر ادھر سے چند منتخب ابواب۔

(۲) تعلیم کا عموم

پہلے علم اور تعلیم چند خاندانوں اور برادریوں تک محدود تھی، بانی دارالعلوم دیو بند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے اصول ہشت گانہ کے ذریعہ تعلیم کو عام کر دیا، کسی ایک امیر کبیر یا نواب و وزیر پر ہی بھروسہ و اکتفاء نہ کرو، سب سے چندہ لو، سب کو تعلیم دو۔

''اصول ہشت گانہ'' میں ۶، ۷، ۸، ملاحظہ کریں۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کا کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسی جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے یہ کہ خدمت ورجاء کا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں

میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصد آمدنی اور تعمیر وغیرہ ہی نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) نامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت، اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ (دارالعلوم دیوبند کی جامع مختصر تاریخ، ص ۵۴)۔

اصول ہشت گانہ'' سے ہندوستان ہی مضبوط و مستحکم دینی تعلیمی نظام کی بنیاد پڑی، اسی کے ذریعہ مدارس کو حکومت وامراء کی سرپرستی سے نکال کر جمہور اور عوام سے جوڑا گیا۔ عوام کے چندوں سے چلنے والے اس نظام میں استحکام ہی تھا اور سماج کے ہر حلقے میں پہنچنے لگی۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر قائم ہونے والے مدارس کے ذریعہ مسلمانوں کے ہر طبقے میں تعلیم وتعلم کا فروغ ہوا، جو اس سے پہلے اتنی وسیع سطح پر کبھی نہیں ہوا تھا۔

عوامی چندہ کے ذریعہ مدارس کا قیام ونظام، آج سے ڈیڑھ سو سال قبل بلاشبہ ایک عجیب وغریب بات تھی، ایسے دینی تعلیمی ادارے قائم کرنا، جو حکومت اور امراء کے اثرات سے آزاد ہوں، آنے والے جمہوری دور کے پیش نظر ایک زبردست پیش بینی اور پیش بندی تھی، اب جبکہ بڑی بڑی ریاستیں خواب وخیال ہوچکی ہیں، زمینداریاں ختم ہوگئی ہی، مگر کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک ہزاروں دینی مدرسے چل رہے ہیں، ان پر حکومتوں کی تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں، اس سے عوامی چندہ کی اہمیت وافادیت اور مدارس کی بنیادوں کے استحکام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ آج کے دور میں دینی مدارس کا قیام، دینی تعلیم کی نشر واشاعت اور دینی تعلیم کا فروغ عوامی چندہ کی تحریک سے مربوط ہے۔

(۳) ایک وقت میں ایک تعلیم

ایک شخص سے سارے علوم کی تحصیل اور ان پر کامل دستگاہ کی توقع نہ رکھو، نہ اس طرح کا نظام بنالو، اگر عالم بنانا ہے تو عالم بناؤ، اسی سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ عالم ہی رہے گا، ڈاکٹر بھی رہے گا، وکیل بھی رہے گا، انجینئر بھی رہے گا، سائنسداں بھی رہے گا، ورنہ وہ کچھ بھی نہ بن

پائے گا۔مشہور ناقد ومحقق ڈاکٹر عندلیب شادانی نے جو بات موجودہ دور کے متعلق کہی ہے،وہ حقیقت میں ہر دور سے متعلق ہے۔

’’ہمارا دور علم وفن کے ہر شعبے میں تخصص کا دور ہے اور تخصص کے حصول کا ایک خاص ذریعہ ریسرچ ہے،اس محل پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا پرانے زمانے میں تخصص کی ضرورت نہ تھی؟ آخر اگلے وقتوں میں بھی تو لوگ اپنے فن میں استاد کامل ہوا کرتے تھے۔کیا وہ تخصص نہ تھا؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ کاملان فن تو ہر زمانے میں گزرے ہیں،لیکن ان کا کمال فن عمومیت رکھتا تھا۔مثلا پرانے زمانے میں ایک ماہر طبیب کے یہ معنی تھے کہ وہ ہر مرض کا علاج ایک حد تک کامیابی کے ساتھ تو کرسکتا تھا،آج بھی ایک اچھا ڈاکٹر ہر مرض کا علاج کامیابی کے ساتھ کرتا ہے،لیکن جب کوئی مرض مزمن اور پیچیدہ ہوجائے تو پھر وہ عام قسم کے ڈاکٹر کے بس کا نہیں رہتا،اس وقت اسپیشلٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔آج علوم وفنون کی اشاعت کثیر کا ذمہ دار وہ شخص نہیں جو تمام علوم وفنون کو جاننے کا دعوی کرتا ہے، بلکہ وہ شخص ہے جو خوب غور وفکر کے بعد اپنے مطالعہ کے لئے مخصوص مضامین کا انتخاب کرلیتا ہے اور بقدر امکان ان کے مطالعہ کو درجہ کمال تک پہونچاتا‘‘۔(تنقیدی نظریات حصہ دوم،ص:۳۱۳،مضمون کا طریقہ کار،ازعندلیب شادانی)

زمانہ قدیم میں جن لوگوں۔مثلا زکریا رازی وغیرہ۔کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عالم بھی تھے اور سائنس داں بھی،اسی طرح فلاں صاحب عالم بھی تھے اور طبیب بھی،تو اس میں حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم محض واجبی طور پر تھے،عالم دین کی حیثیت سے انہیں کوئی مقام ومرتبہ حاصل نہ تھا،اصل ان کا کام اور ان کی شناخت سائنس داں اور طبیب کی حیثیت سے تھی، چنانچہ علمائے دین کے طبقات میں ان کا بالکل شمار نہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ مہارت تامہ حاصل کرنے کے لئے کسی ایک عالم کی طرف یک سوئی کے ساتھ توجہ اور مشغولیت ضروری ہے۔

(۴)مقصد تعلیم کو سامنے رکھنا۔

تعلیم کا مقصد اچھا مسلمان اور اچھا انسان بنانا ہونا چاہئے، پیسہ کمانے کی مشین

نہیں، ورنہ ایسا تعلیم یافتہ شخص اشرف المخلوقات کے درجے سے گر جائے گا۔ آج کے دور میں اسی کا مشاہدہ عام ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے علم کو وسیلے کے بجائے مقصد سمجھا ہے، اسے ذریعہ معاش نہیں سمجھا۔ علم دین کی تحصیل میں مقصد معاش کے پیش نظر لگنا سخت خطرناک ہے۔ یہاں تو مقصد صرف رضائے الٰہی، معاش ایک ضمنی چیز ہے۔

آج عمومی طور پر تعلیم کا مقصد یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی اچھی پر منفعت ملازمت حاصل کی جائے، معقول روزی کمایا جائے، گویا تعلیم کا مفہوم ہی سرے سے بدل دیا گیا ہے اور علم برائے علم کے بجائے تعلیم برائے معاش ہو کر رہ گیا ہے اور قوم کی ترقی اور عروج پس پشت چلا گیا ہے، صرف ذاتی منفعت سامنے ہے، قومی و ملی منفعت نہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر چلنے والے مدارس اسلامیہ اور عصری درسگاہوں کے مقصد تعلیم میں جو فرق پایا جاتا ہے، اسی کو سمجھنے کے لئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی اس تقریر کی یہ سطریں ملاحظہ کیجئے، جو موصوف نے اسمبلی ہال لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند کی بلائی ہوئی تعلیمی کانفرنس میں ۲۲ر فروری ۱۹۴۷ء میں فرمائی تھی۔

''آج ایک تیز رفتار انقلابی ہوا چل رہی ہے اور اقتدار بدل رہا ہے، موجودہ حکومت، قومی حکومت سے تشکیل پا رہی ہے، سو اس کے تعلیمی اداروں کا نصب العین اگر وہی ہوگا بدیسی حکومت کا تھا کہ چند کلرک، چند سرکاری مشین کے کل پرزے حکومت کی دفتری مشین کے لئے تیار ہو جائیں تو مدارس کے طلبہ کا جو رویہ سابق حکومت کے ساتھ رہا ہے وہی اس حکومت کے ساتھ بھی رہے گا، کہیں اگر موجودہ گورنمنٹ کا نصب العین تعلیمی دفتری کارکن تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے ذہن وطبیعت کے لوگ تیار کرنا ہے، جو حقیقی انسانیت سے آراستہ ہو کر انسانیت کے سچے خادم

ہوں، آشتی مسالمت اور پریم وصلح کے خوگر رہ کر ملک کو آسمان ترقی پر پہونچا دینے کے جذبات رکھیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصب العین ان قومی مدارس کے قریب آجائے گا اور نقطہ سنگم پیدا ہو جائے گا''۔

حضرت قاری صاحب نے یہ بھی فرمایا۔''دینی درسگاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم نے روٹی نہ کرسی بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں، جو انسانیت کے سچے خدمات گزار ہوں اور عالم بشریت کے بہی خواہی میں اپنی جان مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں''۔(خطبات حکیم الاسلام جلد دوم، ص: ۴۷۷)

اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا تھا۔''مولانا محمد طیب صاحب نے صحیح فرمایا کہ تعلیم کی غرض وغایت اگر محض کلرک اور یا دفتری لوگ پیدا کرنا ہے تو اس سے کم مرتبہ غرض کوئی دوسری نہیں ہوسکتی اور یہ ملک کی کوئی صحیح خدمت نہ ہوگی۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ نے دارالعلودیوبند کے نصب العین کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

''اول مذہبیت: دارلعلوم دیوبند مذہبی قوت کا سرچشمہ ہے اور اول سے آخر تک اسلام کے دستور آئین کا پابند ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر فرد اسلام کا نمونہ کامل ہے۔

دوم آزادی: جس کے معنی یہ ہیں کہ داراللعلوم دیوبند مکمل طور پر بیرونی غلامی کے خلاف ہے،اس کا نظام تعلیم وتربیت،اس کا نظام مالیات اور اس کا نظام اجتماعی سراسر آزاد ہے، دنیا میں یہ پہلی جامعہ ہے جس کے سامنے حکومت نے بارہا پیش کش کی مگر اس نے لاکھوں روپے کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کردیا۔

سوم سادگی اور محنت پسندی: جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے علماء وفضلاء جہاد زندگی میں بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کرنے کے عادی ہیں۔

چہارم کردار واخلاق کی بلندی: جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے طلبہ اس

کردار بلند کا نمونہ کامل ہیں، جس کو انہوں نے اپنے اکابر سے پایا ہے، یہ کردار سراسر روحانی ہے۔

پنجم علمی اور تعلیمی وابستگی: یہ وہ خصوصیت ہے جسے دارالعلوم کو دیکھنے والا اولین لمحات میں محسوس کرتا ہے، یہ نہ کہنے کی بات ہے، نہ سننے سے متعلق ہے، دارالعلوم کی ہر خصوصیت کو اسی کی زندگی کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے''۔(تاریخ دارالعلوم دیوبند جلداول ص:۱۴۵)

(۵) علوم عصریہ کی تعلیم

حالات کے مطابق اور دعوت تبلیغ کے نقطہ نظر سے دارالعلوم دیوبند علوم عصریہ (انگریزی، حساب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ) کی بقدر ضرورت تعلیم کا قائل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جس تعلیمی کانفرنس کا ذکر پہلی سطور میں ہوتا ہے، اس میں حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے فرمایا تھا۔

''جن تعلیمات کا وحی الٰہی سے تعلق ہے، اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں، نہ ہمیں حق ہے، باقی جوفنون اور کتابیں قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں، وہ زمانہ اور اصول کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔قرآن ہر زمانے میں ایک رہا، لیکن اس کی تفہیمات کا اندازہ بدلتا رہا۔جس دور میں مثلا فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھا گیا، جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنس رنگ میں تجلی کرے گا، اس ساری حقیقت تو ہی بطور خلاصہ ان الفاظ میں لاسکتا ہوں کہ مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔پس تبدیلی نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کریں''۔(خطبات حکیم الاسلام جلد دوم، ص:۴۷۷)

ڈاکٹرحمران احمد معروفی ۔ پورہ معروف پوسٹ کرتھی جعفر پور ضلع مئو

تعلیم کی ایک عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند

محترم سامعین! میرے مقالے کا عنوان ہے ’’تعلیم کی ایک عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند‘‘۔ دارالعلوم دیوبند کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ دارالعلوم نے صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ پورے عالم کو کسی نہ کسی صورت میں تعلیم کی روشنی سے منوروشن کیا ہے۔ خصوصاً اس ادارہ کی دینی خدمات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ آیئے آج کی اس نشست میں اس عظیم ادارہ کے تعلق سے جس نے تعلیم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، کچھ گفتگو کرتے ہیں۔

پس منظر: دہلی وہ سرزمین ہے، جس کو ایک زمانے میں علوم وفنون کی مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس سرزمین پر ملک کے گوشے گوشے سے طالبان علوم نبویہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے چلے آرہے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں اس سرزمین پر حضرت شاہ ولی اللہ جیسی عبقری شخصیت موجود تھی، جن کے علمی فیض سے ایشیاء کے اکثر ممالک سیراب ہورہے تھے۔

لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد دہلی کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں اور اس کی تاریخ دیواروں میں شگاف پیدا ہوگیا، جس کی وجہ سے اس کی سیاسی اہمیت بھی کم ہوگئی تھی اور علمی مرکزیت بھی ختم ہوگئی اور علم وفن کے بڑے بڑے نام دہلی سے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوگئے۔ ایسے حالات میں اس وقت اہل اللہ اور خصوصیت سے ان بزرگوں نے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے خونی حادثے کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور مسلمانوں کی نعشوں کو خاک وخون میں تڑپتا ہوا دیکھ چکے تھے، ان تمام حضرات کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ علم ومعرفت کے اس کارواں کو کہاں ٹھکانا دیا جائے، حسن اتفاق دیکھئے کہ اس وقت اس راہ عمل کے مذاکروں کے

لئے جو جگہ منتخب ہوئی، وہ دیوبند کی چھتہ مسجد تھی، یہ وہی چھتہ مسجد ہے، جس میں دارالعلوم کے بانی مولانا قاسم نانوتویؒ جب بھی دیوبند میں ہوتے، قیام پذیر رہتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا دیوبند میں حضرت مولانا ذوالفقارؒ، حضرت مولانا فضل الرحمانؒ اور حضرت حاجی محمد عابدؒ سے مودت ومحبت کا رشتہ قائم تھا۔ ان حضرات کا اکثر وبیشتر وقت اس وقت کے حالات کے ذکر وفکر میں گزرتا تھا، چنانچہ اس تعلق سے ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کے مرتب سید محبوب رضوی رقم طراز ہیں۔

''اس وقت بنیادی نقطہ نظر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لئے ایک دینی علمی درسگاہ کا قیام ناگزیر ہے، اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقا کے خاص حضرت مولانا ذوالفقارؒ، حضرت مولانا فضل الرحمانؒ اور حضرت حاجی عابدؒ نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونی چاہئے''۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص:۱۴۹)

دارالعلوم کا قیام: چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں کی دینی ملی اور اجتماعی زندگی کی بقا وتحفظ کے لئے ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہی ادارہ آگے چل کر ہندوستان میں دینی تعلیم کی ایک عظیم درسگاہ بن کر سامنے آیا۔ اس عظیم ادارہ کا قیام ۱۰ رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے درخت کے سائے میں نہایت سادگی سا تھ عمل میں آیا۔ حضرت مولانا محمود دیوبندی کو جو علم وفضل میں بلند پایہ کے عالم تھے مدرس مقرر کیا گیا، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اس کے پہلے شاگرد تھے۔۔ یہ عجیب اتفاق دیکھئے کہ استاد اور شاگرد دونوں کا نام محمود تھا۔ جس وقت اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا، سوائے توکل علی اللہ اور اخلاص وللہیت کے کچھ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ بڑے ہی بے سروسامانی کے ساتھ یہ ادارہ قائم ہوا، صرف ایک طالب علم اور ایک استاد، اس وقت پڑھانے کے لئے، نہ مناسب جگہ دستیاب تھی اور نہ ہی طالبان علوم نبویہ کی رہائش کا کوئی انتظام تھا، مگر اللہ کی نصرت اور امداد دیکھئے کہ اپنے قیام کے چند ہی سال کے بعد حیرت انگیز طور پر ترقی کی جانب قدم بڑھانا شروع کر دیا، چنانچہ

زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ برصغیر سے گزرکر افغانستان، سمرقندوبخارا ، برما ، انڈونیشیا، ملائشیا، ترکی اور براعظم افریقہ کے دوردراز خطوں سے طالبان علوم نبویہ آنے شروع ہوگئے اور چندہی دنوں میں یہ معمولی مدرسہ ایک اقامتی درسگاہ میں تبدیل ہوگیا۔

اس ادارہ کے قیام کا مقصداوراس کا نصب العین کیا تھا،اس کوواشگاف کرنے کے لئے،ہم یہاں پرایک مبصر کا تبصرہ نقل کرتے ہیں۔

ایک مبصر کا تبصرہ: دارالعلوم دیوبند کے معاونین میں ایک اہم نام مولوررحیم بخشؒ پریسیڈنٹ ریاست بھاولپور کا ہے۔موصوف نے دارالعلوم کودیکھ کر جواظہارخیال کیاہے،اس کاایک اقتباس ذیل میں پیش کیاجارہاہے،جس سے بخوبی اندازہ لگایاجاسکتاہے کہ اس زمانے میں دارالعلوم میں کس طرح کے علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے۔

’’یہ کالج ہندوستان کے بڑے حکما اور مقدس اشخاص کی کوششوں کا نتیجہ ہے،جس کا منشا یہ ہے کہ خالص اہل سنت والجماعت،ان اغراض وفوائد کو ہندوستان میں محفوظ ومصئون رکھے،جن کی نسبت سالہاسال داخلی وخارجی طور پر زوال کاقوی اندیشہ تھا،جو مضامین کالج میں سکھائے جاتے ہیں،وہ متعدداقسام اورمختلف انواع کے ہیں،کالج کی کل مدت تعلیم آٹھ سال رکھی گئی ہے۔قانون شریعت،علم الٰہی اور ہرایک خیالی ودماغی سائنس شامل ہیں۔لیکن یہ سب علوم جوکالج کی روداد میں درج ہیں،باہم نہایت مختلف ہیں تاہم ان سب کاایک خاص مقصد ہے،جوسب میں اشتراک رکھتاہے۔یہ سب علوم عربی زبان میں سکھائے جاتے ہیں،جس کی بڑی غرض یہ ہے کہ طلباء کوکافی طور پرعربی کی استعداد حاصل ہواوراس کے بعدوہ لوگ دماغی درس وتدریس،قانون شریعت اور مذہب میں قوت حاصل کریں۔فی الواقع یہ علوم اس امر کے لئے ذریعےٹھہرائے گئے ہیں کہ مذہب اسلام کے متعلق کامل درجے کی تعلیم ہوسکے،کیونکہ خالص مذہبی تعلیم کی غرض سے اس کالج کی بنیادقائم کی گئی ہے‘‘۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۲۱۸)

مذکورہ بالااقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس ادارہ کا بنیادی مقصد خالص مذہبی

علوم کے تحفظ اوران کی تعلیم واشاعت کی غرض سے ہوئی تھی اور یہ عظیم ادارہ اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب ہے۔اس ادارہ نے مسلمانوں کو روحانی اور علمی شکست سے بچانے میں اہم کردارادا کیا ہے،اس ادارہ کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ علمی، تعلیمی، تبلیغی، تصنیفی، سیاسی اور معاشرتی امور میں برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم الشان اور گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور جن اساسی اصولوں پر یہ عظیم ادارقائم کیا گیا،اس کو بھی آپ کے سامنے بیان کرنا ضروری ہے،جس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک الہامی ادارہ ہے،حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ادارہ کے بقاء وتحفظ اور طریقہ کار کے لئے آٹھ نایاب اصول قائم کیا،جن کو اصول ہشتگانہ کے نام سے جانا جاتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اختصار کے ساتھ پیش کردیا جائے۔

(۱)اصول اول یہ کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے ،آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں، نیز اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲)ابقاء طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳)مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کوخوبی اورخوش اسلوبی ہواور اپنی بات کی پیچ نہ کی جائے۔

(۴)یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں،خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵)خواندگی مقررہ اس اندازے سے ہو،جو پہلے تجویز ہوچکی ہے یا بعد میں کوئی اوراندازہ مشورہ سے تجویز ہو، پوری ہوجایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خودآباد نہ ہوگا اوراگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(٦)اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ ان شاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اوراگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر یا

کارخانہ وغیرہ تو پھریوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہاتھ جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو یا حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ اس درسگاہ کے سندیافتہ نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، حجاز اور دیگر اسلامی ممالک میں درس وتدریس اور تبلیغ واشاعت کے ذریعے علوم دینیہ کی اشاعت اور اوہام باطلہ کے ازالہ میں مصروف ہیں۔

میں آپ کے حضرات کے سامنے اس کی بہت مختصر روداد بلکہ سوسالہ خدمات کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوجائے گا کہ دارالعلوم دیوبند نے دنیا کو کیا دیا ہے، مورخ لکھتا ہے کہ:

۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک سوسال کے عرصہ میں دارالعلوم دیوبند نے

۵۳۶/ مشائخ طریقت

۵۸۸۸/ مدرسین

۱۱۶۴/ مصنفین

۱۷۸۴/ مفتی

۱۵۴۰/ مناظر

۶۸۴/ صحافی

۴۳۸۸/ خطیب ومبلغ

۲۸۸/ طبیب پیدا کئے ہیں

عرض یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے فضلاء کرام کا ایک ایسا گلدستہ تیار کیا ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول اپنی عطر بیزی سے مشام جان کو فرحت وانبساط کا سامان بہم پہنچایا رہے ہیں۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص:۴۴۶)

ڈاکٹر مولانا محمد رفیق احمد قاسمی ۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی ،حیدر آباد)

تعلیم: رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب جہالت اور گمراہی میں بھٹک رہے تھے، سیاست تعلیم اور تمدن میں نہایت پستی کا شکار تھے، اس زمانہ میں بڑی سیاسی قوتیں عرب کے علاقوں کو ناقابل اعتناء تصور کیا کرتی تھیں، مشہور مؤرخ بلاذری کے بقول قریش میں صرف سترہ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا : وبعث فی الامیین رسولا منھم الآیۃ ''اور اللہ تعالیٰ نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیج دیا۔''

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر تعلیم کتاب وحکمت کو آپ ﷺ کی ذمہ داری بتائی گئی ہے''اور وہ تمہیں کتاب وحکمت سکھاتے ہیں اور وہ تمہیں ان باتوں کی تعلیم دیتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے (بقرۃ :۲: ۱۵۱) ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب وحکمت کی تعلیم آپ ﷺ کا فرض منصبی تھا، خود رسول پاک ﷺ نے متعدد مرتبہ اس بات کا اظہار فرمایا کہ مجھ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ مسجد میں دو حلقے دیکھے، ایک ذکر کا حلقہ اور ایک تعلیم کا حلقہ، تو آپ ﷺ نے دونوں کی تعریف فرمائی لیکن خود آپ ﷺ تعلیم کے حلقہ میں جا کر بیٹھ گئے اور فرمایا: مجھ کو تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے''۔

علم کی اہمیت۔۔۔قرآن وحدیث کی روشنی میں

قرآن کریم میں علم کی اہمیت اور رفع شان کا بار بار ذکر آیا ہے اسی کے ساتھ علم سے مشتق صیغوں کا سینکڑوں مرتبہ استعمال کیا گیا ہے، جس سے علم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں لفظ علم مختلف اشتقاقی صورتوں میں ۷۷۸ مرتبہ وارد ہوا ہے قرآن مجید میں اس مادے کے اشتقاقات جس کثرت سے آئے ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ قرآن مجید کی رو سے علم کو غیر معمولی، بلکہ فوق الکل اہمیت حاصل ہے اور جب یہ جزوی ترادف کے ساتھ دوسرے ترادفات (مثلاً: تعقلون، یتدبرون، تفقھون، تشعرون وغیرہ) کے ساتھ مل کر یا ان کی جگہ آتا ہے تو ان سے علم کے طریقوں، غایتوں اور حجتوں کا پتہ چلتا ہے۔

دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث نبوی کا بڑا سرمایہ حصول علم کی تاکید اور علم کی فضیلت پر مشتمل ہے اور اس کی اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ بشمول امام بخاری بیشتر محدثین نے کتاب العلم کے باب کو کتاب الایمان کے بعد ذکر کیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان کے بعد سب سے اہم نعمت علم کی ہے۔

پہلی وحی میں علم کی تاکید

رسول اللہ ﷺ پر سب سے پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ یہ تھی: اقرأ باسم ربک الذی خلق '' قرآن پاک کی سب سے پہلی سورت جو نازل ہوئی اس میں بہت وضاحت کے ساتھ پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے اور پڑھنا تبھی ہوسکتا ہے جب کوئی چیز لکھی ہوئی ہو یعنی اس آیت میں بلاواسطہ پڑھنے اور بالواسطہ لکھنے کی تعلیم دی گئی ہے پھر اسی سورت میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تعلیم کا بڑا ذریعہ قلم ہے جس کے ذریعہ علوم کو محفوظ اور اگلی نسلوں کو منتقل کیا جاتا ہے۔

مفت تعلیم

آپ ﷺ کی منشأ یہ تھی کہ تعلیم مفت ہو، تاکہ امت کا ہر طبقہ تعلیم یافتہ ہو جائے اور علم کی روشنی ہر گھر اور ہر فرد تک پہنچ سکے، رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کے بدلے میں صحابہ کرام کو طلبہ سے ملنے والے ہدایا پر سخت وعید فرمائی، حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت ابی بن کعب کو جب ان سے قرآن پڑھنے والے کچھ شاگردوں نے کمان ہدیہ کیا اور اس کا ذکر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ آگ کی کمان ہے، اگر چاہو تو قبول کرلو (سنن ابن ماجہ: باب الاجر علی تعلیم القرآن)

علم کے چھپانے پر وعید

حصول علم کی ایک بڑی رکاوٹ کسی علم کا چھپایا جانا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم رفتہ رفتہ معدوم ہوجاتا ہے، طب یونانی کو اسی لئے زوال ہوگیا کہ اس کے تیر بہدف نسخے حکماء نے شاگردوں کے سامنے عام نہ کیا، سنسکرت زبان کو اسی لئے زوال ہوگیا کہ اس کو برہمنوں نے صرف اپنے لئے خاص کرلیا، رسول اللہ ﷺ نے صرف علم کی نشرواشاعت ہی کی فضیلت بیان نہیں کی، بلکہ یہ بھی بتایا کہ اگر کسی سے علم کی بات پوچھی جائے تو وہ اس کے بتانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کرے، بلکہ بتادے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کو قیامت کے دن آگ کا لگام ڈالا جائے گا، حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کسی سے علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے علم کے باوجود اس کو چھپایا تو قیامت کے دن اس کو آگ کا لگام پہنایا جائے گا (مسند احمد ۱۳/۱۸)، ابن ماجہ کی روایت جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ علم کی بات لوگوں کے معاملات سے تعلق رکھتی ہو یا دینی امور سے، یہ وعید دونوں صورتوں میں ہے (ابن ماجہ ۱/۹۷) ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے علم کے چھپانے کو خیانت سے تعبیر فرمایا کہ یہ خیانت مال خیانت سے بھی زیادہ بڑا ہے (فوائد تمام ۲/۱۹۷)

تعلیم ہر شخص کی ذاتی ذمہ داری

آپ ﷺ نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے صرف اجتماعی اور انفرادی ذمہ داری پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ تعلیم کے حصول کے لئے کو ہر شخص کی ذاتی ذمہ داری قرار اردیا، چنانچہ اگر کوئی جاہل رہتا ہے تو یہ اس کا قصور مانا جائے گا کہ اس نے تعلیم کے حصول کی کوشش کیوں نہیں کی، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ''علم کا طلب کرنا (بقدر ضرورت) ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔

انفرادی طور پر علم کو پھیلانے کی ذمہ داری

آپ ﷺ نے تعلیم کو انفرادی ذمہ داری قرار دیا، چنانچہ ہر شخص کی یہ ذاتی ذمہ داری ہے کہ کوئی دین کی بات جانتا ہو اور اللہ و رسول کے ارشاد کا کسی بھی درجہ میں علم رکھتا ہو تو اس کی ذمہ

داری ہے کہ وہ اس کو دوسروں تک پہنچائے ،ارشاد فرمایا: بلغوا عنی ولو آیة ((مختصر صحیح البخاری۲/۴۴۵)) ''کہ مجھ سے جو کچھ سنو اسے دوسروں تک پہنچاؤ، اگر ایک ہی آیت کیوں نہ ہو ''ایک موقع سے آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے حدیث سنی اس کو یاد کیا اور دوسروں تک پہنچایا، کیوں کہ بسا اوقات جن کو پہنچایا جاتا ہے وہ سننے والے سے زیادہ حافظہ والے ہوتے ہیں۔(سنن دارمی:۱/۷۵)

تعلیم اور اجتماعی ذمہ داری

دور حاضر میں تعلیم ریاست اور معاشرہ کی ذمہ داری تسلیم کی جاتی ہے کسی بھی حکومت کی یہ ذمہ داری مانی جاتی ہے کہ وہ عوام کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے، اور معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کام میں حکومت کی مدد کرے، تعلیم کے باب میں اس قدم کو دور حاضر کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے، لیکن ہمیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ دور حاضر کی خصوصیت نہیں، بلکہ تاریخ میں سب سے پہلے جس شخصیت نے تعلیم کو عوامی اور اجتماعی ذمہ داری قرار دیا وہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔آپ نے تعلیم کے باب میں یہ انقلابی اعلان فرمایا کہ تعلیم اجتماعی ذمہ داری ہے خواندہ اور تعلیم یافتہ قبائل کی ذمہ داری ہے کہ وہ پڑوس کے جاہل قبائل کو تعلیم یافتہ بنائیں اور جاہل قبائل کی ذمہ داری ہے کہ وہ پڑوس کے تعلیم یافتہ قبائل سے تعلیم حاصل کریں ، حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ اعلان علم کی دنیا میں ایک انقلاب تھا، جس کے اثرات اور ثمرات سے دنیا آج بھی مستفید ہو رہی ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے خطاب فرمایا، پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان فرمائی پھر مختلف مسلمان جماعتوں کا تذکرہ فرمایا اور ان کی تعریف کی اور پھر فرمایا: کچھ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے پڑوسیوں میں تفقہ (دین کی سمجھ) پیدا نہیں کرتے ،ان کو تعلیم نہیں دیتے ،ان کو نصیحت نہیں کرتے ان کو نیک باتوں کی ترغیب نہیں دیتے اور بری باتوں سے منع نہیں کرتے اور کچھ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے تعلیم حاصل نہیں کرتے اور نہ ان سے دین کی سمجھ حاصل کرتے ہیں اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں، خدا کی قسم ان کو چاہیئے کہ اپنے پڑوسیوں کو تعلیم دیں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں اور ان کو نصیحت کریں اور

ان کو اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں اور دوسروں کو چاہیئے کہ وہ پنے پڑوسیوں سے علم حاصل کریں، دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں اور نصیحت حاصل کریں (اگر ایسا نہ ہوا) تو میں ان کو دنیا ہی میں عذاب دوں گا پھر آپ ﷺ منبر سے اترے اور اپنے گھر میں داخل ہو گئے (لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ یہ باتیں کن کو کہی گئیں ہیں، بعض نے کہا یہ اشعریوں کو کہا گیا ہے وہ سمجھدار لوگ ہیں لیکن پانی کے چشموں کے پاس جو لوگ ان کے پڑوسی ہیں وہ دین سے جاہل ہیں اور گنوار و بدو ہیں، یہ باتیں اشعریوں تک پہنچی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ آپ نے ایک قوم کو بھلائی کے ساتھ ذکر کیا اور ہمارے بارے میں سخت کلمات ارشاد فرمائے، اس کی وجہ جاننا چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک گروہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ پیدا کریں اور ان کو نصیحت کریں اور ان کو اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے منع کریں اور کو تعلیم دیں اور دوسری قوم کو چاہیئے کہ اپنے پڑوسیوں سے تعلیم حاصل کریں اور سمجھ بوجھ پیدا کریں ورنہ میں ان کو دنیا میں ہی سزا سے دوچار کردوں گا ،اشعریوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ! کیا ہم دوسروں کو سمجھائیں تو آپ نے پھر سے دوبارہ اپنی بات دوہرائی ،اشعریوں نے پھر پوچھا کیا ہم دوسروں کو سمجھائیں تو آپ ﷺ نے دوبارہ اپنی بات دوہرائی اس پر اشعریوں نے کہا آپ ہمیں ایک سال کی مہلت دیں، تاکہ ہم اپنے پڑوسی قبائل اور بستیوں کو تعلیم دیں اور ان کے اندر دینی شعور پیدا کریں اور ان کو سمجھائیں۔((الترغیب والترہیب)

بعض روایات میں آتا ہے کہ اشعریوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ کیا دوسروں کی ذمہ داری ہماری ہے یا دوسروں کی وجہ سے ہمیں سزا دی جائے گی ،انہوں نے بار بار اپنی بات دوہرائی ،اس کے بعد انھوں نے ایک سال کی مہلت مانگی۔اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے عالم عرب کے مشہور فقیہہ مصطفیٰ زرقاء لکھتے ہیں:: تعلیم کو اجتماعی ذمہ داری قرار دینا اور اس میں کوتاہی کو اجتماعی کوتاہی اور سزا کا موجب قرار دینا علم کی دنیا میں ایسا انقلاب تھا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ، نہ نبی ﷺ سے پہلے اور نہ آپ ﷺ کے بعد ،اور برائی کے ارتکاب اور تعزیری سزا کے قابل جرائم میں سے دینی واجبات میں سستی اور تقصیر شامل ہے اور اسی سے تعلیم

اور تعلم بھی ہے، پس جو کوئی عالم تعلیم کے فریضہ میں کوتاہی کرتا ہے یا کوئی جاہل تعلیم کے حصول میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ سزا اور تعزیر کا مستحق ہو جاتا ہے، کیوں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: علم کا حصول ہر مسلمان پر ضروری ہے'' اور مسلم کے لفظ میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں: کیوں کہ جس وصف کو حصول علم کا موجب قرار دیا گیا ہے وہ ان کا مسلمان ہونا ہے ((المدخل الفقھی العام: ج ۲ ص ۱۴۱ ۶)

مولانا منظور نعمانیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''دینی تعلیم و تربیت کا یہ ایسا عمومی نظام تھا کہ اس کے ذریعہ ہر شخص بغیر مکتب یا مدرسہ اور بغیر کتاب اور کاغذ و قلم کے اور بغیر پڑھے لکھے بھی دین کا ضروری علم حاصل کر سکتا تھا، بلکہ اپنی محنت اور صلاحیت کے مطابق اس میں کمال بھی حاصل کر سکتا تھا، صحابہ کرام نے اسی طرح تابعین کی غالب اکثریت نے علم حاصل کیا افسوس کہ بعد میں امت میں یہ نظام قائم نہ رہا، اگر قائم رہتا تو امت کا کوئی طبقہ اور کوئی عنصر بلکہ کوئی فرد دین سے ناواقف اور بے بہرہ نہ رہتا، اس نظام تعلیم کی یہ خاص برکت تھی کہ زندگی علم کے سانچہ میں ڈھلتی چلی جاتی تھی، حدیث کے آخر میں یہ ہے کہ اشعریین کے وفد نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کو ایک سال کی مہلت دے دی جائے ہم اس مدت میں انشاء اللہ تعلیمی مہم انجام دے لیں گے، آپ ﷺ نے ان کی بات منظور فرمالی، یہ گویا اس علاقہ کی آبادی کے لئے ایک سالہ تعلیمی منصوبہ تھا (معارف الحدیث)

وفود کے ذریعہ تعلیم

جو قبیلہ، بستی، محلّہ اسلام سے مشرف ہوتا تھا آپ ﷺ ان کی تعلیم کے لئے وفود بھیجا کرتے تھے، جو کبھی یہ وفد صرف ایک آدمی پر مشتمل ہوتا تھا اور کبھی تین پانچ اور کبھی ساٹھ ستر افراد پر مشتمل ہوتا تھا کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ مشرف بہ اسلام ہونے والے قبائل کی تعلیم و تربیت کے لئے افراد بھیجا کرتے تھے اور ایسا بھی بسا اوقات ہوتا تھا کہ مشرف بہ اسلام ہونے والے قبائل کے کچھ افراد وفد کی صورت میں آپ ﷺ کے پاس آتے، تعلیم حاصل کرتے اور فقہی احکام وغیرہ سے واقفیت پیدا کرتے اور پھر چلے جاتے، آپ ﷺ ان وفود کو تاکید کرتے کہ جو کچھ تم نے یہاں سیکھا ہے وہ اپنے مقام پر جا کر دیگر افراد کو سکھاؤ۔

مالک بن حویرثؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم کچھ ہم عمر نوجوان افراد رسول اللہ ﷺ کے پاس بطور وفد آئے کچھ دن ٹھیرنے کے بعد جب ہمیں اہل وعیال کی یاد ستانے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے اہل وعیال کی جانب لوٹ جاؤ، ان میں ٹھیرو اور ان کو تعلیم دو (بخاری، کتاب الاذان) اسی طرح وفد عبدالقیس جب مدینہ آیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو تعلیم وتربیت کے لئے انصار کو حوالہ کردیا تاور انصار کی میزبانی کے بارے میں ان سے پوچھا تو انھوں نے عرض کیا ،انھوں نے ہمیں اپنے بستروں پر جگہ دی اپنا کھانا کھلایا اور رات گذرنے کے بعد صبح ہمیں اپنے رب کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت کی تعلیم دی، (مسند احمد بن حنبل) ہجرت کے تیسرے سال عضل وقارہ کے افراد نے آپ ﷺ سے معلمین کو بھیجنے کی گذارش کی تو آپ ﷺ نے ستر افراد کو بطور معلم بنا کر بھیجا (المغازی للواقدی) نجران کے وفد نے رسول اللہ ﷺ سے خواہش کی کہ ہماری تعلیم کے لئے کسی کو روانہ فرمائیں تو آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے روانہ فرمایا (مسند احمد بن حنبل)

گورنر اور عمال کو اپنے علاقہ میں تعلیم کی تاکید

جن علاقوں میں آپ ﷺ عمال کو بھیجتے تھے یا وہاں گورنر تعینات کرتے تھے انھیں تاکید کرتے تھے کہ وہ ان علاقوں کے عوام کی تعلیم کا اہتمام کریں فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے مکہ کے والی (گورنر) حضرت عتاب بن اسیدؓ کو بنایا اور تعلیمی افسر حضرت معاذ بن جبلؓ کو بنایا (سیرت ابن ہشام) حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن اور حضرموت کا رسول اللہ ﷺ نے موجودہ لحاظ سے تعلیمی کمشنر مقرر کیا تو ان کو تاکید کی گئی کہ یمنی عوام کی تعلیم وتربیت کا انتظام کریں، طبری کے الفاظ ہیں: **وکان معاذ معلما یتنقل فی کل عامل بالیمن و حضرموت** (تاریخ طبری) معاذؓ بن جبل کمشنر تعلیم تھے اور حضرموت اور یمن دونوں ان کے دائرہ کار میں داخل تھا یہی بات طبقات فقہاء الیمن کے مصنف نے بھی کہی ہے کہ معاذ بن جبلؓ حضرموت اور یمن دونوں جگہ کی عوام کے لئے افسر تعلیم بنا کر بھیجے گئے تھے، اسی طرح عمرو بن حزم کی تقرری جب یمن کے علاقے میں ہوئی تو اللہ کے رسول نے ان سے دیگر ہدایتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کے لئے قرآن کی تعلیم کا بندوبست کریں (اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین: ۱/۱۳۹)

اولین مدرسہ کا قیام

مدینہ آمد کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد نبوی کے قیام کو ترجیح دی اور اسی مسجد نبوی کے ایک حصہ کو تعلیم کے لئے خاص کر دیا جس کو صفہ کہا جاتا ہے، یہ اسلام کا پہلا مدرسہ تھا جس میں ہاسٹل کا بھی نظم تھا اس میں لوگ رہتے تھے جن کے پاس اپنا گھر بار نہیں تھا ان لوگوں کا صرف ایک ہی کام تھا کہ آپ ﷺ سے تعلیم حاصل کریں اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا تھا صفہ میں تعلیم حاصل کرنے والے دو قسم کے افراد ہوتے تھے ایک تو وہ ہوتے تھے جو شہر سے آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے اور دوسرے وہ ہوتے تھے جو رات دن یہیں رہتے تھے اصحاب صفہ کو آپ ﷺ بھی براہ راست تعلیم دیتے تھے اور اہل علم صحابہ کو بھی اصحاب صفہ کی تعلیم وتربیت پر متعین فرماتے تھے، عبادہ بن صامت اور ابی بن کعب کو اصحاب صفہ کی تعلیم پر متعین کیا گیا تھا۔

یہ جان کر حیرت ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ نے اصحاب صفہ کی بانی تعلیم کے ساتھ ان کی نوشت خواند پر بھی پوری توجہ دی جاتی تھی اور اس کے لئے عبداللہ بن سعید بن العاص کو متعین کیا تھا جو غزوہ بدر میں شہید ہو گئے (الاصابۃ: ۳۴۴/۱) عبداللہ بن سعید بن العاص کی غزوہ بدر میں شہادت کی بھرپائی اس طرح ہوئی کہ مشرکین مکہ کے قیدیوں میں سے نادار اور تعلیم یافتہ افراد کا فدیہ یہ قرار پایا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں (مستدرک حاکم ۱۴۰/۲)

صفہ صرف تحصیل علم کا مقام ہی نہیں تھا بلکہ یہاں مستقبل کے معلموں کو بھی تیار کیا جاتا تھا ،اصحاب صفہ کو ہی مدینہ آنے والے وفود کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری سونپی جاتی تھی اور جو قبائل مسلمان ہو جاتے تھے ان کی تعلیم وتربیت کے لئے افراد بھی یہیں سے روانہ کئے جاتے تھے، ابو براء مالک بن عامر نے جب آپ ﷺ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھیج دیں جو اہل نجد کو اسلام کی دعوت دیں تو آپ نے جن افراد کو روانہ کیا تھا ان میں سے بیشتر اصحاب صفہ میں سے ہی تھے کہا جاسکتا ہے کہ صفہ بیک وقت تعلیم گاہ بھی تھی تو دوسری جانب نئے آنے والے معلمین کی تربیت گاہ بھی، یہاں ایک جانب طلبہ آپ ﷺ سے تعلیم حاصل کرتے تھے تو دوسری جانب نئے آنے والوں کو تعلیم دیتے تھے۔

مدینہ منورہ میں دیگر مدارس

صفہ پہلا مدرسہ ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ مدینہ میں دیگر مقامات پر بھی تعلیم کا نظم تھا حضرت ابن مکتومؓ کے تذکرہ میں ملتا ہے کہ جب وہ بدر کے کچھ دنوں بعد آئے تو انھوں نے ''دار القراء'' میں قیام کیا (طبقات ابن سعد) حضرت زید بن ثابتؓ کے بارے میں عبد اللہ بن مسعود ذکر کرتے ہیں کہ وہ بچوں کے ساتھ پڑھتے تھے، دکتور مصطفیٰ اعظمی کا خیال ہے کہ یہاں صفہ کے بجائے ''کُتّاب'' لفظ کا استعمال بتا رہا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے لئے الگ مکاتیب کا نظم قائم تھا (دراسات فی الحدیث النبوی وتاریخ تدوینہ: ۱/۵۴)

عورتوں کے لئے خصوصی تعلم کا انتظام

اسلام نے تعلیم کا حصول مرد اور عورت دونوں پر فرض قرار دیا ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کے باب میں عورتوں کا خاص خیال رکھا حضرت ابو سعید خدریؓ نقل کرتے ہیں کہ عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ مردوں کو آپ سے استفادہ کا ہر وقت موقع ملتا ہے آپ ہمارے لئے ایک دن مقرر فرما دیجئے تاکہ ہم اس دن آپ کے پاس آئیں اور آپ ہمیں اس چیز کی تعلیم دیں جو اللہ نے آپ کو بتایا ہے آپ ﷺ نے ان کے لئے ایک دن مقرر کیا اس دن عورتیں آئیں اور آپ نے ان کو تعلیم دی (بخاری حدیث نمبر: ۷۳۱۰)

اس زمانے میں غلام اور باندیوں کو مکمل انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن اسلام نے باندیوں کو تعلیم دینے کی فکر کی ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین اشخاص ایسے ہیں جن کو دوہرہ اجر دیا جاتا ہے اور اس میں سے آپ نے ایسے شخص کا ذکر کیا جس کی کوئی باندی ہو وہ اس کو تعلیم دلائے اور اچھی تعلیم دلائے اور پھر اس کی تربیت کا انتظام کرے پھر اس کو آزاد کرکے اس سے شادی کرلے (سنن ابوداؤد: حدیث نمبر ۳۸۸۷)

اجنبی زبان سیکھنے کی تاکید

رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کا حکم دیا حضرت زیدؓ نے نصف ماہ میں سریانی زبان سیکھ لی اور بعد ازاں وہی رسول پاک کی جانب سے یہودیوں کو مکتوب لکھا کرتے تھے اور یہودی جو مکتوب حضور پاک ﷺ کو لکھا کرتے تھے اس

سے رسول اللہ کو واقف کراتے تھے (بخاری: کتاب الاحکام) حضرت زید بن ثابت عربی اور سریانی کے علاوہ قبطیوں حبشیوں اور رومیوں کی زبان بھی اچھی طرح جانتے تھے (البدایۃ والنہایۃ: ۸/۸۸) حضرت مغیرہ بن شعبہ بھی فارسی زبان جانتے تھے اور انہوں نے ہرمزان اور حضرت عمرؓ کی بات چیت میں ترجمانی کی تھی (تاریخ طبری: ۴/۸۸) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سریانی زبان بخوبی جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کا معمول ایک دن تورات کی تلاوت کا بھی تھا۔

مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں:

''اجنبی زبانوں سے تعلیم، دعوت وتبلیغ کے میدان میں ضرورت کے وقت استفادہ کرنا رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ثابت ہے اور تعلیم کے باب میں رسول اللہ ﷺ کے اسلوب میں سے ایک ہے، پھر زبان کا علم دنیوی علوم کی کنجی ہے اور اس کا حصول آج کے دور میں ضروری ہے تاکہ عجمیوں اور فرنگیوں سے معاملات طے کئے جائیں اور ترقی کے میدان میں مختلف قوموں سے آگے بڑھا جائے، آج کے مخلوط سماج میں دوسری زبانوں کا علم زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے''۔(الرسول المعلم واسالیبہ فی التعلیم: ۲۱۵)

دنیوی علوم اور جدید ٹکنالوجی کے استعمال کی ترغیب

رسول اللہ ﷺ نے انصار کو تلقیح (گابھا لگانے سے منع کیا اور فصل کو نقصان ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: انتم اعلم بامور دنیاکم (تم دنیوی معاملات کے بارے میں زیادہ جانتے ہو) خود قرآن مجید میں تسخیر کائنات کا ذکر ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی ہر چیز تمہارے لئے مسخر کردی ہے، یہ تسخیر عصری اور دنیوی تعلیم کے حصول اور مہارت کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں بھی مختلف موقعوں پر تاکید فرمائی ہے غزوہ خندق کے موقع پر عجمیوں کے طریقہ کار کے مطابق حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر خندق کھدوایا (مغازی الواقدی: ۲/ ۴۴۵) رسول اللہ ﷺ نے طائف کو فتح کرنے میں دبابۃ کا استعمال کیا تھا جو خیبر میں یہودیوں کے قلعے سے ملا تھا (سیرت ابن ہشام) اور بعض روایات کے مطابق منجنیق کا استعمال کیا تھا (مغازی الواقدی:

۲/ ۶۷)اسی طرح آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ دیارِ غیر کے بنے ہوئے جبے وغیرہ استعمال کرتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب معاشرہ میں بلا واسطہ اور پوری دنیا میں بالواسطہ تعلیم کی ایسی روح پھونکی کہ پوری دنیا سے جہالت کے اندھیرے بتدریج چھٹنے لگے اور علم کی ضیا پاش کرنوں سے دنیا منور ہونے لگی وہی اونٹ کے چرواہے جنہیں دنیا خاطر میں نہ لاتی تھی تہذیب انسانی کے سفیر بن گئے اور مختلف علوم وفنون میں دنیا نے ان کی شاگردی اختیار کی اور اس شاگردی کا یوروپ کو بھی اعتراف ہے ،صرف اتنا ہی نہیں اسلام سے قبل سائنس محض ایک تصور تھا اسے عملی شکل دینے اسلام کے پیروکاروں نے ہی اہم کردار ادا کیا اور تجربہ کی اہمیت پر زور ڈالا اس کے علاوہ ہر طاقت ور چیز کے سامنے جھکنے کے ذہن نے انسانی قوت عمل کو مفلوج کر رکھا تھا اسلام نے پہلی بار یہ ذہن پیدا کیا کہ انسان صرف خدا سے کمتر ہے اور اس کے علاوہ بقیہ تمام مخلوقات میں سب سے بہتر ہے اس پیغام فکر و عمل نے پہلی بار انسانی تاریخ میں تسخیر کائنات کا جذبہ پیدا کیا چنانچہ آج دنیا میں ٹکنالوجی اور علوم وفنون کا جو دور دورہ ہے اور جس سے ہر ایک مستفید ہونا چاہتا ہے اس شجر سایہ دار کا بیج پیغمبر اسلام نے ہی بویا تھا جس کی آبیاری پیغمبر اسلام کے پیروکاروں نے جوش و جذبہ کے ساتھ کی آج دنیا میں تعلیم کو بنیادی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے ،قیدیوں سے تعلیم کی خدمت لی جاتی ہے، تعلیم کے لئے نئے وسائل و ذرائع استعمال کئے جا رہے ہیں اور اس سمت میں نت نئی ایجادیں ہو رہی ہیں ،لیکن یہ سب فیضان ہے اسی امی کا جس نے کتاب وقلم کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن دنیا میں تعلیمی انقلاب برپا کر دیا۔

مراجع و مصادر

(۱) قرآن مجید (۲) سنن ابن ماجۃ (۳) مسند احمد (۴) فوائد تمام (۵) مختصر صحیح البخاری (۶) سنن دارمی (۷) الترغیب والترہیب (۸) المدخل الفقہی العام للدکتور مصطفیٰ زرقاء (۹) معارف الحدیث: مولانا منظور احمد نعمانیؒ (۱۰) صحیح بخاری (۱۱) المغازی للواقدی (۱۲) تاریخ طبری (۱۳) اعلام السالکین عن کتب سید المرسلین (۱۴) الاصابۃ (۱۵) مستدرک حاکم (۱۶) طبقات ابن سعد (۱۷) دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ (۱۸) سنن ابو داؤد (۱۹) البدایۃ والنہایۃ (۲۰) الرسول المعلم واسالیبہ، للشیخ عبدالفتاح ابوغدۃؒ

مولانا عبدالمنان مظہر قاسمی ۔ (ناظم علاقہ مہاڈ) فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ممبئی

تعلیم برائے معاش یا تعلیم برائے تزکیہ

علم کی تعریف:

علم کا مادہ ''ع، ل، م'' ہے۔ اس کے لفظی معنیٰ ہوتے ہیں: ''کسی شے کی حقیقت کا ادراک کرنا، اس کے بارے میں جاننا''۔ یہ جہل کی ضد ہے، جس کے معنیٰ ''نہ جاننا، ان پڑھ ہونا'' کے آتے ہیں۔ اَلْعِلْمُ اِدْرَاکُ الشَّیْءِ بِحَقِیْقَتِہٖ یعنی ''علم کسی شے کو اس کی حقیقت کے حوالے سے جان لینے کا نام ہے''۔ انگریزی میں اسے Knowledge کہتے ہیں۔ یعنی علم ایک ایسا ذہنی قضیہ اور تصور ہے جو عالم خارج میں موجود کسی حقیقت کو جان لینے سے عبارت ہے۔ اسی سے متعدی ہے، ''تعلیم''، جس کے لغوی معنیٰ ہیں ''کسی کو چیزوں کی حقیقت بتانا، سکھلانا''۔

بعض لوگ تعلیم کو غلط فہمی میں تدریس کا ہم معنیٰ سمجھ لیتے ہیں۔ یعنی طلبہ کو مضامین یا کتب کا درس دینا یا انہیں لکھنا پڑھنا سکھانا اور حساب وغیرہ سکھا دینا۔ حالانکہ یہ بہت جامع لفظ ہے۔ اس کے مفہوم میں تدریس کے ساتھ ساتھ تدریب (فنون میں مہارت پیدا کرنا)، تادیب (ادب سکھانا) اور تربیت (شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگ نشوونما کرنا) بھی شامل ہے۔ (فن تعلیم و تربیت ص: ۱۹/۲۰)

انگریزی میں تعلیم کے لئے متبادل لفظ Education ہے، جو لاطینی زبان کے دو الفاظ Educere اور Educare سے ماخوذ ہے۔ Educere کے معنیٰ ہیں "To Bring Out" یعنی اظہار کرنا، باہر نکالنا یا بروئے کار لانا۔ جب کہ Educare کے معنیٰ ہیں "To Bring Up" یعنی پروان چڑھانا، نشوونما دینا، اجاگر کرنا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن جن صلاحیتوں سے نوازا ہے، تعلیم کا عمل نہ صرف یہ کہ ان تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور پروان چڑھانے کا فریضہ انجام دیتا ہے، بلکہ اس کی سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل کرتے ہوئے اسے معاشرے کا ایک کامیاب فرد بناتا ہے۔ تاکہ وہ ایک

معزز شہری کی حیثیت سے اپنی زندگی گذار سکے۔(علم التعلیم، باب اول)۔

ماہرین تعلیم نے تعلیم کے مفہوم کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔کوئی کہتا ہے کہ تعلیم دماغی نشو ونما کا نام ہے۔کسی نے کہا کہ بچے کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور سدھارنے کے عمل کو تعلیم کہتے ہیں۔کسی کے نزدیک معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے ، چند مہارتیں پیدا کرنے یا اخلاق سدھارنے کے عمل کا نام تعلیم ہے۔(تعلیم: نظریہ اور عمل ص ۱۱)۔

سقراط نے اسے سچائی کی تلاش، ارسطو نے جسمانی و اخلاقی نشو ونما کا عمل، اور افلاطون نے صحت مند معاشرے کی تنظیم کا عمل قرار دیا ہے۔Jhon Devi اسے تجربے کی مسلسل تعمیر نو کا نام دیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تعلیم انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی مسلسل نشو ونما اور بالیدگی کا عمل ہے جو انسان کی شخصیت کے نکھار اور اعلیٰ کمال کے حصول کا باعث بنتا ہے۔(علم التعلیم، باب اول)۔

علم کی تقسیم:

موقع ومحل کے اعتبار سے علم کی تقسیم مختلف انداز سے کی جاتی ہے۔کوئی اسے رسمی و غیر رسمی سے معنون کرتا ہے،تو کبھی اس کی تقسیم دینی ودنیاوی علم کے طور پر کی جاتی ہے،اور کبھی آرٹ اور سائنس کے زمروں میں اسے تقسیم کیا جاتا ہے۔

اسلام نے علم کی جامعیت اور مقصدیت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے نافع اور غیر نافع کے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔علم خواہ کسی بھی ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہو؛ رسمی ہو کہ غیر رسمی، مدرسہ میں حاصل کیا گیا ہو یا گھر پر، یا اطراف کے مشاہدات ومسموعات وتجربات کی بنا پر حاصل ہوا ہو، وہ یا تو بنی نوع انساں کے لئے نفع بخش ہوگا یا پھر غیر نافع ہوگا۔نافع ہونے کی صورت میں اس کی قدر و قیمت ہے بصورت دیگر وہ بے قیمت ہے۔اسی بات کو پیارے نبی ﷺ نے واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ ’’حکمت ودانائی کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے، جہاں بھی اس کو پائے وہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے‘‘۔(سنن ابن ماجه / ٤١٠١)۔چنانچہ علم کو دینی ودنیاوی خانوں میں بانٹنا صحیح نہیں ہے۔علم جس میدان کا بھی ہو اگر وہ انسان کے دین وایمان، اخلاق وکردار اور صحت وتندرستی کے لئے نفع بخش ہے تو اسلام میں اس کی قدر وقیمت ہے، خواہ فی زمانہ اسے دنیاوی علوم میں شمار کیا

جاتا ہو۔مثلاً طب اور دفاع دو ایسے شعبے ہیں جس میں رسول پاک ﷺ کی بہت واضح ہدایات اور رہنمائی ملتی ہے۔اسی لئے احادیث کی کتابوں میں باقاعدہ کتاب الطب کاعلیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔ طب نبوی میں خصوصی دلچسپی کی بنا پر مسلمان اطباء نے اس فن کو اس قدر وسعت دی ہے کہ جدید میڈیسن کی بنیاد میں ان کا خصوصی کردار رہا ہے۔ بوعلی سینا کی القانون، الزہراوی کی التصریف، زکریا الرازی کی الحاوی اور ابن الہیثم کی کتاب المناظر ایک زمانے تک یوروپ کے میڈیکل کالجوں میں داخل نصاب رہی ہیں۔اسی طرح فلکیات کے ایک بڑے حصے کا ذکر خود قرآن پاک میں ہے، جس میں سورج و چاند کی گردش اور کرۂ ارضی کی آب و ہوا پر خاصی بحث کی گئی ہے۔ ڈیفینس کے شعبے میں قرآن کی واضح ہدایت "وَ اَعِدُّوا لَهُم مَا اسْتَطَعْتُم مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ" (**الانفال-٦٠**)۔اور فرامین رسول: "اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ" (سنو! طاقت وقوت تیراندازی میں ہے)۔**الصحیح للمسلم/٤٩٤٤، ابن ماجه/ ٢٨١٣** ، اور "اِرْمُوْا وَ ارْكَبُوْا" (تیراندازی کرو اور سواری کا فن سیکھو)، **ابن ماجه/ ٢٨١١** ، سے کون انکار کرسکتا ہے۔ہمارے زمانے میں Physical Education نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔اسکولوں اور کالجوں میں باقاعدہ اس کے شعبے ہوتے ہیں۔حکومتیں اپنے بجٹ کا ایک معتدبہ حصہ اس پر خرچ کرتی ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد میں قوم کو اس کا احساس دلایا تھا۔مدینۃ النبی میں مسجد نبوی کے صحن میں کھیل کود کے مقابلے ہوتے تھے۔کشتی اور گھوڑسواری کا مقابلہ ہوتا تھا۔تاکہ جسم انسانی چست و درست رہے۔اور پیارے نبی ﷺ نے اسے بھی دین و ایمان کا حصہ بناتے ہوئے اعلان فرمایا: "اَلْمُؤمِنُ الْقَوِیُّ خَيْرٌ وَّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ" (طاقتور مومن، کمزور مومن کے مقابلے میں اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے)۔**الصحیح للمسلم/٦٧٧٤، ابن ماجه/٧٩-**

قرآن و حدیث کے ان صریح پیغامات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ علم دینی ہے جو بنی نوع انساں کے ایمان وعقیدہ، اخلاق وکردار اور صحت وتندرستی کے لئے نفع بخش ہو۔اور ایسے علوم کی تحصیل میں لگے رہنا چاہئے۔اور جو علوم خواہ ظاہر میں اچھے معلوم ہوتے ہوں لیکن انسان کے عقیدہ وعمل اور ذہن وجسم کے لئے غیر نافع یا نقصاندہ ہوں تو وہ

غیر دینی ہیں، ان کی تحصیل سے دور رہنا چاہئے۔

پیارے نبی ﷺ نے علم نافع اور عمل صالح کی دعا مانگی ہے۔ اور اس علم سے اللہ کی پناہ چاہی ہے جو بے نفع ہو۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ (اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو بے نفع ہو) **ابن ماجہ/ ۲۵۰** ۔اور "اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ وَ زِدْنِیْ عِلْماً" (اے اللہ! میرے لئے اس چیز کو نفع بخش بنادے جو تو نے مجھے سکھایا، اور وہ علم عطا کر جو نفع بخش ہو اور میرے علم میں اضافہ کر) **ابن ماجہ/۲۵۷** ۔اور ان طالبان علوم کو خبر دار کیا ہے جو کسی بھی طرح کا علم محض دنیاداری کے لئے حاصل کرتے ہیں۔ "عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃؓ : مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً یُبْتَغٰی بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا یَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِیُصِیْبَ بِهٖ عَرَضاً مِّنَ الدُّنْیَا، لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَعْنِیْ رِیْحَھَا" (وہ علم جس سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے (یعنی کتاب وسنت کا علم)، اگر اس کو کوئی شخص دنیا کی دولت کمانے کے لئے حاصل کرے تو وہ قیامت میں جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا) **مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ بحوالہ : معارف الحدیث ص۳۸، ج۸**۔ اور ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا "عَنِ ابْنِ عُمَرؓ : مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰهِ وَ اَرَادَ بِهٖ غَیْرَ اللّٰهِ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ" (جس کسی نے اللہ کے لئے نہیں، بلکہ غیر اللہ کے لئے علم حاصل کیا وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے) **ترمذی/معارف الحدیث ص۳۸، ج ۸**۔

تعلیم کی اهمیت:

علم روشنی ہے، جب کہ جہالت تاریکی ہے اور موت ہے۔ یہ موت جسم وجان کی نہیں بلکہ روح کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "اَوَمَنْ کَانَ مَیْتاً فَاَحْیَیْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْراً یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمَاتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَا" (بھلا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی، اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے؛ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو۔) **الانعام/۱۲۲** ۔اسی فرق کو دوسری جگہ واضح کرتے ہوئے قرآن نے صاف کیا ہے کہ: "اے نبی ﷺ! ان سے پوچھئے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں۔ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔" (**الزمر/ ۹**)۔ یہ وہ عظیم دولت ہے کہ

حضرت انسان کی تخلیق کے بعداولاً اسی دولت سے اسے سرفراز کیا گیا۔ " وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا" (اوراللہ نے آدمؑ کوساری چیزوں کے نام سکھائے) البقرۃ/ ۳۱۔اوراسی بنیاد پراسے فرشتوں پرفوقیت نصیب ہوئی۔شریعت محمدی کا نقطۂ آغاز ہی پڑھنے پڑھانے سے ہوا۔اورقرآن کی ابتدائی وحی کا پہلا لفظ ہی ہے" اِقْـرَأْ " ، جس کے معنیٰ ہیں: پڑھ۔اورانہیں ابتدائی پانچ آیا ت میں دوجگہ تعلیم وتعلم کا ذکر ہے:" وَعَلَّمَ بِالْقَلَمْ " اور" عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ "۔

علم اپنے حامل کو جوفضیلت اور بزرگی عطا کرتا ہےاس کا اندازہ پیارے نبی ﷺ کےاس قول سے کیاجاسکتاہے:" فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَا بِدِ کَفَضْلِ الْقَمرِعَلیٰ سَائِرِ الْکَوَاکِبِ "(عالم کی فضیلت عابد پرایسی ہی ہے جیسے چاند کی فضیلت سارے ستاروں پر) جامع ترمذی/ ۲۶۸۲، سنن ابی داؤد/ ۳۶۴۱ ۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ہرمردوعورت پر حصول علم کوفرض قرار دیا۔اور یہ علم کی اہمیت ہی تھی کہ جنگ بدر کے اختتام پر، گوکہ اس وقت مسلمان بڑی کسمپرسی کی زندگی گذار رہے تھے،کئی کئی دن چولہے نہیں جلا کرتے تھے،لیکن فدیے میں دولت دنیا کے مطالبے کے بجائے خصوصی طور پرجس چیز کا مطالبہ کیا گیاوہ دولت علم تھی، کہ تم میں جوبھی پڑھنا لکھنا جانتا ہووہ ہمارے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھادے،(سیرۃ النبی ص ۱۹۴/ج ۱)۔امام شافعیؒ علم کی اہمیت پراس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں:

مَن لم یذق مُرَّ التعلیمِ وقتَ شبابِه ۔۔۔ یتجرَّع ذُلَّ الجهل طول حیاته

و من فاته التعلیم وَقتَ شبابِه ۔۔۔ کَبِّر علیه اربعاً لِوَفاته

(جس نے جوانی میں تعلیم کی کڑواہٹ کونہیں چکھا، وہ زندگی بھر جہالت کی ذلت کے گھونٹ پیتا رہیگا۔اورجس نے جوانی میں تعلیم حاصل نہیں کی اس پر جنازے کی چارتکبیریں پڑھوکہ وہ مرچکاہے)، رسول کریم کی تعلیمی تحریک/ص ۱۶۔

حصول تعلیم کا مقصد:

علم کی عظمت اوراس کی منزلت کے اعتراف کے باوجود دنیااس کے حصول کی متفقہ غرض وغایت طے کرنے میں ناکام رہی ہے۔ حالانکہ ہردور میں مفکرین نے اس کومتعین کرنے کی اپنی کوششیں کیں ہیں۔اورایسااس وجہ سے ہے کہ اس کی تعیین فرد، قوم اورملکی حالات ومصالح

کے تحت کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔والدین اپنے بچوں کواس لئے زیورِتعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کھانے کمانے کے قابل ہو جائیں، ''تعلیم برائے معاش'' ان کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔حکومتیں اس لئے تعلیم کا انتظام کرتی ہیں تا کہ انھیں اچھے شہری فراہم ہوسکیں جو سماج کی بے لوث خدمت انجام دے سکیں، گویا ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد ''ملک وقوم کی خدمت'' ہے۔ برطانوی دور حکومت میں تعلیم کا مقصد سرکاری دفتروں کے لئے کلرک یا کارندے پیدا کرنا تھا، جو سرکاری افسران کے احکام کی تعمیل میں بے چوں و چرا دفتر کا کام کرتے رہیں۔فی زمانہ اسکول اور اس کے اساتذہ کی بیشتر تعداد عملاً ''تعلیم برائے تعلیم'' کی قائل نظر آتی ہے۔ان کی مکمل توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ ان کے طلباء کس طرح زیادہ سے زیادہ نمبرات سے پاس ہو جائیں۔ پروفیسر عطیہ ابراشی لکھتی ہیں کہ: ''آج کل کے دور میں یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مدرس اپنی ترقی اور طالب علم کے امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کرتا۔اس کے نزدیک بدن کی، جسم کی، عقل کی، روح کی، ذہن کی، دماغ اور اخلاق کی تربیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی''۔(**فلسفۂ تعلیم و تربیت**، ص ۳۷)۔اسی طرح کسی کے نزدیک ''تعلیم برائے شخصیت کا ارتقاء'' قرار پایا۔ بعض نے تعلیم کا مقصد ''صحت مند جسم اور صحت مند دل و دماغ کی پرورش'' بیان کیا۔غرض ہر ایک نے اپنے گرد و پیش کے حالات اور مخصوص فکر کے نتیجے میں تعلیم کے مقاصد واضح کئے ہیں۔

فی الوقت انسانی خودغرضیوں نے تعلیم کو ایک تجارت بنا کر رکھ دیا ہے۔ بھاری بھرکم تعلیمی فیس، بار بار یونیفارم اور کتابوں کی تبدیلی اور اسکول ہی سے اس کی فراہمی، مختلف نئے نئے ناموں سے سال بھر الگ الگ فیسوں کی وصولی اور ڈونیشن کے نام پر لوٹ کھسوٹ۔اب ایک بچہ جو .K.G سے لے کر ڈگری حاصل کرنے تک تعلیمی اداروں سے علم کو خرید رہا ہے اور گھر بار بیچ کر، سودی قرضے لے کر، مختلف خیراتی اداروں کے سامنے دست سوال دراز کر کے علم کی قیمت ادا کر رہا ہے؛ جب وہ پڑھ لکھ کر ایک انجینئر بنتا ہے، ایک ڈاکٹر بنتا ہے، صحافی یا استاذ بنتا ہے تو جلد از جلد وہ ساری قیمتیں مع سود واپس پانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے جسے اس نے بڑے جتن سے ادا کیا تھا۔اب وہ انسان نہیں بلکہ پیسہ کمانے کی مشین ہے۔ایک اچھا شہری اور سماج کا خادم نہیں بلکہ ایک بنیا ہے۔(دینی وعصری تعلیم مسائل اور حل، ص ۲۰۴)۔

ایسا ہونا فطری ہے اس لئے کہ تعلیمی مقاصد میں جھول ہے۔ باپ کو پیسہ چاہیئے، ملک کو اچھا شہری چاہیئے، معاشرے کو ایک تندرست وتوانا فرد چاہیئے۔ یقیناً ان کی ضرورت و اہمیت مسلّم ہے، لیکن یہ مقصد نہیں ہیں بلکہ وقت کی ضرورت ہیں۔ انہیں فرد یا ملک وقوم نے اپنے تقاضوں کے لحاظ سے متعین کیا ہے۔ یہ انسان کے ظاہر سے تو بحث کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باطن جو کہ اصل انسان ہے، سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا جسم اور اس کے دل ودماغ تو آلے ہیں، کام کرنے کے ذرائع ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتے، اصلا یہ خادم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا گراف مسلسل بڑھتے رہنے کے باوجود دنیا انسانوں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ تمام ترقیات وسہولیات کے باوجود انسان نما حیوانوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ کسی شاعر نے بہت خوب عکاسی کی ہے:

چشم فلک نے یہ دن دکھائے — گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے یہ سارے تعلیمی مقاصد ناتمام۔ ادھورے اور ناکام ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں کہ ان کی تعیین لوگوں نے اپنی عقلوں سے کی ہے اور انسانی عقلیں محدود ہیں۔

وطن عزیز ہندستان جب آزاد ہوا تو ۱۹۵۱ء کے تعلیمی سروے کے مطابق ملک میں خواندگی کی شرح 18.33% تھی۔ جب کہ ۲۰۱۱ء میں یہ گراف مختلف کوششوں سے آگے بڑھ کر 74.04% تک پہنچ گیا۔ یعنی 55.71% کا اضافہ درج کیا گیا۔ اس کے بالمقابل بے روزگاری کی شرح 1983-2013 کے درمیان 7.32% رہی ہے، جو کہ ایک بڑی تعداد بنتی ہے۔ جرائم کی دنیا میں یہ شرح انتہائی قابل تشویش ہے۔ ۱۹۵۳ء میں ہر ایک لاکھ آبادی میں 5,000 اغوا، 2500 زنا اور 10,000 قتل کی واردات رونما ہوئیں۔ جب کہ ۲۰۰۳ء میں یہ گراف 20,000 اغوا، 16,000 زنا اور 27,000 قتل کی واردات تک پہنچ گیا۔ کم وبیش اکثر دنیا کا یہی حال ہے۔ دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک امریکہ کی بات کریں تو وہاں ۲۰۱۶ء کے ایک سروے کے مطابق آبادی کا 84% حصہ خواندہ ہے۔ پھر بھی شکاگو شہر میں گذشتہ دو سالوں میں قتل کے واقعات میں 29% کا اضافہ درج کیا گیا۔ جہاں صرف سال ۲۰۱۵ء

میں سات سو قتل کے واقعات رونما ہوئے۔ مرکزی شہر نیویارک میں صرف ۲۰۱۳ء میں ایک ہزار تین سو شوٹنگ کے واقعات درج کئے گئے، جن میں قریب 350 / افراد کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اپریل ۲۰۱۷ء کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں بے روزگاری کی اوسط شرح 4.40% ہے، جو اس جیسے ترقی یافتہ ملک کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔

مذکورہ بالا رپورٹس کی بنیاد پر یہ بات بہت یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تعلیمی گراف بڑھتے رہنے کے باوجود والدین کو نہ تو اپنی امنگوں کے مطابق پیسے کمانے کی مشین مل پا رہی ہے۔ اور ملک بھی اپنی ہزار کوششوں کے باوجود ایک اچھا شہری اور سماج کا بے لوث خادم حاصل کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔ پوری دنیا میں بدعنوانی اپنے پاؤں پسار چکی ہے۔ کیا دفتر کا ادنیٰ ملازم اور کیا سربراہان مملکت؛ سبھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ جو جتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس کی بدعنوانی بھی اسی قدر بڑی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیا تعلیم کے صحیح مقصد کو طے کرنے میں ناکام رہی ہے۔ وہ افراد کو صرف خواندہ بنا رہی ہے، جب کہ ان کی روحوں کی تربیت کا اس کے پاس کوئی روڈ میپ نہیں ہے۔ اور روحانی تربیت کے بغیر انسانیت کی جلوہ گری ایک فریب ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم میں اخلاقی اور روحانی اقدار کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ حالانکہ اس سے ہونے والے نقصانات کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر ہیرالڈ ایچ فیٹس لکھتا ہے: ”تعلیم نے اپنے آپ کو روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے۔ مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے۔ نتیجۃً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے، زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطۂ نظر سے عاری ہیں“۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تعلیم کا صحیح مقصد کیا ہے؟ وہ کیا خطوط ہیں جن پر تعلیم کی بنیادوں کو کھڑا کیا جانا چاہئے، تا کہ دنیا انسان نما حیوانوں سے نہیں، بلکہ اصل انسانوں سے جو کہ انسانیت نواز ہوں معمور ہو سکے۔ مشہور ماہر تعلیم مولانا افضل حسینؒ لکھتے ہیں کہ: ”تعلیم کا صحیح مقصد اللہ کا صالح بندہ بنانا ہے۔ یعنی طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی و جسمانی، عملی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گذار بندے بن کر رہیں۔ کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں

‘‘۔ (فن تعلیم و تربیت، ص/ ۳۰)۔ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: ’’طالب علم کو چاہئیے کہ وہ اپنے آپ کو علم کے لئے وقف اور خالص کر لے۔ اور اس علم کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور دار آخرت کا حصول ہو‘‘۔(رسول اکرم اور تعلیم، ص/ ۱۵۰)۔

پروفیسر عطیہ محمد الابراشی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے: ’’نظام تعلیم میں ہم جو اصلاح چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ معلم، مربی بن جائے۔ وہ تربیت کا کوئی گوشہ تشنۂ توجہ نہ چھوڑے۔ اگر ہم یہ مقصد حاصل کر لیں تو ہم اس منزل تک پہنچ جائیں گے جہاں تک ہم پہنچنا چاہتے ہیں۔(فلسفۂ تعلیم و تربیت، ص ۳۷/)۔اسی بات کو قدرے وضاحت سے ڈاکٹر سعود عالم قاسمی یوں رقم کرتے ہیں: ’’اساتذہ کے ذہن میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ تعلیم کا مقصد ایک اچھا شہری، ذمہ دار اور خدا ترس انسان پیدا کرنا ہے۔ معلّمی دراصل انسان سازی ہے۔ اور یہی کار پیمبری ہے۔‘‘(رسول کریم کی تعلیمی تحریک، ص ۷۳/)۔

واضح یہ ہوا کہ جسم انسانی کی نشو ونما کے ساتھ ہی اس کی روحانی تربیت لازمی شے ہے، بلکہ یہی اصل ہے۔ جسے اسلام نفس کے تزکیہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اسے کامیابی و ناکامی کا معیار قرار دیتا ہے۔ ’’یقیناً فلاح پا گیا ہے وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا‘‘۔(سورۃ الشمس/ ۱۰-۱۱)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تزکیہ کا مفہوم کیا ہے۔ لغوی اعتبار سے تزکیہ کا معنیٰ ہے: ’’کسی چیز کو پاک کرنا، اس کی نشو ونما کرنا، اسے صالح بنانا‘‘۔(مصباح اللغات، ص/ ۳۴۲)۔ البتہ اپنی وسعت کے اعتبار سے یہ ایک بہت ہی جامع لفظ ہے، جس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ رقمطراز ہیں: ’’نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں، ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں۔ جاہلی اخلاق و عادات نے اس کے اندر جو ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں ان کو درست کیا جائے۔ تقلید اور رسوم کی پرستش نے اس میں بے حسی اور جمود کے جو روگ پیدا کر رکھے ہیں، ان کو دور کیا جائے۔ فانی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے، اس کا علاج کیا جائے۔ تاکہ اس کی آنکھیں کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر

سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں۔ اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس بلند مرتبے تک پہنچ سکے، جس مرتبے پر پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے''۔(تزکیہ نفس، ص/۳۸)۔

چناچہ یہی وہ مقصد اصلی ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کو مبعوث کیا۔ اور آغاز سلسلہ میں ہی حضرت آدمؑ کو دنیا میں بھیجتے وقت کہہ دیا تھا: ''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا''۔(سورۃ البقرۃ ۳۸)۔ حضرت ابراہیمؑ نے نبی آخر کی بعثت کی دعا مانگتے ہوئے عرض کیا تھا: ''اے ہمارے رب! ان میں انھیں میں سے رسول بھیج، جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب وحکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبے والا اور حکمت والا ہے''۔(سورۃ البقرہ / ۱۲۹) اور آخر میں جب جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہوا تو ان کے متعلق ارشاد ہوا: ''وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول انہیں میں سے اٹھایا؛ جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''(سورۃ الجمعۃ/۲)۔

ان آیات میں وضاحت کے ساتھ اس بات کا ذکر ہے کہ انبیاء کے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ شمار کرنے کے لئے تو وہ چار ہیں؛ تلاوت آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔ لیکن غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں اصل حیثیت تزکیہ کی ہے، اور بقیہ چیزیں تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت بذات خود مطلوب نہیں ہیں؛ بلکہ تزکیہ کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ایک آیت میں تزکیہ کا لفظ آخر میں جبکہ دوسری میں آغاز میں لاکر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اول وآخر مقصد یہی تزکیہ ہے اور بقیہ چیزیں اس کے حصول کے ذرائع ہیں۔ قرآن مجید کی دیگر آیات سے بھی اس کے اصل مقصود ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

جب حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی غرض وغایت تزکیہ ہی بتلائی تھی: ''فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اور اس سے کہہ، کیا تو اس کے لئے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے''(سورۃ النازعات/۱۷، ۱۸)۔ اسی طرح ایک موقع پر خود حضور

ﷺ کے پاس اسی غرض وغایت سے آنے والے کی طرف بعض اسباب سے تھوڑی بے توجہی ہوگئی تو تنبیہ کرتے ہوئے کہا گیا: ''ترش رو ہوا اور بے رخی برتی، اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر، شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو'' ۔(سورۃ عبس/۱-۳)۔

خلاصہ یہ نکلا کہ تعلیم کا مقصد اصلی وہ نہیں ہے جسے دنیا نے مختلف انداز میں مقرر کر رکھا ہے۔ جو محض جسم انسانی کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ بلکہ مقصد اصلی وہ ہے جس کی خاطر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کو مبعوث کیا۔ جو انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ ضرورت پوری ہوگئی تو اس کی دیگر ضروریات بھی پوری ہو جائیں گی۔ بالفاظ پروفیسر خورشید احمد صاحب:

''اسلام کہتا ہے کہ علم برائے تزکیہ ہونا چاہئے۔ حصول علم کا مقصد راہ ہدایت پانا اور اسے اختیار کرنا ہے۔ حصول علم کے اس تصور سے معاشی فراوانی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور انسانوں کی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ قرآن نے شہادت دی ہے کہ زمین ایسے صالح معاشرے کے لئے اپنی دولت اگل دیتی ہے۔ آسمان اس معاشرے کے اوپر برکت کی بارش برساتا ہے۔ اور پھر اس قوت کے ذریعہ مسلمان دنیا میں حق کو غالب کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے'' ۔(اسلام کا نظریۂ تعلیم)۔

لہٰذا اس حقیقت کو سمجھنے اور اسے اپنانے کی ضرورت ہے، کہ انبیاء کرامؑ جو نظام زندگی لے کر آئے ہیں اسی میں اصل کامیابی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: ''فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی'' ۔(سورۃ الاعلیٰ/۱۴)۔ انسانی زندگی صرف اس دنیا تک محدود ہے، جب کہ اس کے بعد ایک اور دنیا آنے والی ہے جو لامحدود ہے اور جسے آخرت کہتے ہیں۔ انسان کی اصل کامیابی یہی ہے کہ آنیوالی لامحدود زندگی عیش وآرام سے بسر ہو، خواہ اس کے لئے اس دنیا کی عارضی زندگی میں، جو کہ دارالامتحان ہے اور جہاں خیر وشر برابر برسرپیکار ہیں؛ دشواریاں اٹھانی پڑیں، کہ یہ تو چند روزہ ہے گذر ہی جائیگی۔ چنانچہ عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے دائمی سکون کی فکر کرے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے نظام اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گذارے۔ ایک اللہ کا ڈر اس کے دل میں جاگزیں ہو، اور کوئی قدم اس کی مرضی کے خلاف نہ

جائے تو پھراس کے لئے خوشخبری ہے: ’’اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی‘‘۔(سورۃ النازعات / ٤١،٤٠)۔ پر جس نے اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کیا اور دنیا کی چندروزہ زندگی کو ہی سب کچھ جانا تو اس کے حق میں نامرادی اور خسران مقدر کی جا چکی ہے: ’’تو جس نے سرکشی کی تھی، اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی‘‘۔(سورۃ النازعات / ٣٧-٣٩)۔

لوگوں کا شعور بیدار کرنا ہوگا۔ دنیا کی چندروزہ منفعت کے بجائے آخرت کے دائمی سکون سے واقف کرانا ہوگا۔ نفس کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لئے، لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری پر کھڑا کرنا ہوگا۔ ایک طالب علم کے ذہن میں یہ بات بٹھانی ہوگی کہ تعلیم کا مقصد محض اپنی ذات کا فائدہ نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت ہے، ایسے علم سے پیارے نبی نے پناہ مانگی ہے جو دوسروں کو نفع نہ پہنچائے۔ اساتذہ کو یہ بات سمجھانی ہوگی کہ کارِ پیمبری کی عظیم ذمہ داری ان کے سر ہے اور بُعِثۡتُ مُعَلِّماً لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الۡاَخۡلَاقِ (مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے تا کہ میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کردوں) کے تقاضے کے تحت انہیں اپنی دکانیں چمکانے کے بجائے سامنے پڑے پتھروں کو تراش کر ہیرے کی شکل دینا ہے۔ اسکولوں کی انتظامیہ کو بھی یہ باور کرانا ہوگا کہ وہ تعلیم کی دوکان کھول کر نہیں بیٹھے ہیں، بلکہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعۡطِی (میرا کام تو بس بانٹتے جانا ہے، دینے والی ذات اللہ کی ہے) کے تقاضے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ لازم ہے کہ وہ اسکولوں میں طلبہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا بھی انتظام کریں۔

اگر ایسا ہوتا ہے تو وہ دن دور نہیں جب ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ ہمارے تعلیمی ادارے دانش گاہوں میں بدل جائیں گے۔ اور ان دانش گاہوں سے تاجروں اور بدعنوان کارندوں کی فوج نہیں بلکہ انسانیت کے خادم، ملک کے مثالی شہری اور اللہ کے سچے بندوں کا لشکر تیار ہوگا۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ آہوں کراہوں والی دنیا، ظلم و بربریت و ناانصافی اور نابرابری کی آماجگاہ دنیا؛ عدل و انصاف کے سانچے میں ڈھلی، امن وسکون والی دنیا بن جائے گی۔

آیئے! ہم عہد کریں کہ سب مل کر اس کے لئے کوشش کریں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین!

مراجعات

نمبر شمار	اسماء کتب	مؤلفین	ناشرین
۱۔	القرآن الکریم		
۲۔	الجامع الصحیح للمسلم	امام مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ	نعمانی کتب خانہ، لاہور
۳۔	الجامع للترمذی	امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ	مکتبۃ العلم، لاہور
۴۔	تزکیۂ نفس	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
۵۔	تعلیم، نظریہ اور عمل	محمد اکرام خان	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
۶۔	دینی وعصری تعلیم، مسائل وحل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	فرید بکڈپو، نئی دہلی
۷۔	رسول اکرم ﷺ اور تعلیم	علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی	فرید بکڈپو، نئی دہلی
۸۔	رسول کریم ﷺ کی تعلیمی تحریک	پروفیسر ڈاکٹر سعود عالم قاسمی	علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ
۹۔	سنن ابن ماجہ	امام ابن ماجہ القزوینیؒ	دارالسلام، ریاض
۱۰۔	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سجستانیؒ	دارالسلام، ریاض
۱۱۔	سیرۃ النبی ﷺ	شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ	مکتبہ مدنیہ، لاہور
۱۲۔	علم التعلیم	وزارت معارف، ریاست دارالتالیف	مطبوعہ ۲۹۱۵ء، پنجاب (حال پاکستان)
۱۳۔	فلسفۂ تعلیم وتربیت	پروفیسر ڈاکٹر عطیہ محمد الابراشیؒ	سدھارتھ نگر، اتر پردیش
۱۴۔	فن تعلیم وتربیت	مولانا افضل حسینؒ (ایم اے ایل ٹی)	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
۱۵۔	مصباح اللغات	ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاویؒ	مکتبہ برہان، دہلی
۱۶۔	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانیؒ	دارالاشاعت، کراچی
۱۷۔	Literacy in India	Wikipedia	www.google.co.in
۱۸۔	Unemployment in India	Wikipedia	www.google.co.in
۱۹۔	Crime in India	Wikipedia	www.google.co.in
۲۰۔	Literacy in U.S.A	Wikipedia	www.google.co.in
۲۱۔	Unemployment in U.S.A.	Wikipedia	www.google.co.in
۲۲۔	Crime in U.S.A.	Wikipedia	www.google.co.in

مولانا مفتی محمد صادق مبارک پوری۔ صدر المدرسین جامعہ نور الاسلام ولید پور، ضلع مئو

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات

اار نومبر ۱۸۸۸ء کو سرزمین عرب کے شہر مکہ معظّمہ میں پیدا ہونے والا ننھا سا بچہ جس کا نام نامی محی الدین احمد تھا، جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے متعارف ہوئے، گیارہ سال کی عمر میں اپنے والدین کی رفاقت میں ہندوستان کے مشہور ومعروف شہر کلکتہ میں مقیم ہو گئے، جب کہ آپ کے والد مکرم نے اپنے مریدوں کے بے حد اصرار پر ہندوستان آنا منظور کیا۔

مولانا آزاد کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر کلکتہ میں ہوئی، ان کا تعلق ایسے خاندان سے تھا، جو صدیوں سے علم وحکمت اور فلسفہ وروحانیت کا مرکز رہا ہے، والد مکرم مولانا خیر الدین صاحب بہترین عالم اور فاضل دینیات تھے، والدہ محترمہ مکہ مکرمہ کے ایک دینی وعلمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، والد محترم کے ہزاروں مرید تھے، ان کے علم وفضل کے چرچے ہند وبیرونِ ہند میں تھے، دادا محترم محمد ہادی کا تعلق دہلی کے مشہور خاندانِ علم وفضل سے تھا۔

بہرحال مولانا آزاد بے پناہ فضائل وکمالات کے مالک تھے، ہم ان کی کن کن خوبیوں کو یہاں ذکر کریں۔

علم وفن، فلسفہ وحکمت، فقہ وحدیث، قرآنی علوم ومعارف، مذہبی اسرار ورموز متعدد زبانوں پر دسترس کتنی اہم باتیں مولانا آزاد کی شخصیت میں شامل تھیں، گویا متعدد فضائل وکمالا ت اللہ تعالیٰ نے ایک انسانی ڈھانچہ میں اتار دیا۔

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں، تقریروں اور اپنے عمل سے مسلمانانِ ہند کی آبیاری

کی کوشش کی ،ایک جانب وہ مسلمانوں کوقرآن وسنت کے مطابق چلانے میں منہمک ہوگئے ،تو دوسری طرف تحریک آزادی ہند سے مسلمانوں کو جوڑا۔

وہ ملک کی آزادی کی تحریک میں اگلی صفوں میں تھے ،مولانا آزاد خلوت نہیں ،جلوت کے آدمی تھے،۱۹۱۲ء میں اخبار ''الہلال'' اس کے بعد ''البلاغ'' نکالا ،جس کا اہم مقصد مسلمانوں کی دینی ،سماجی آبیاری کے ساتھ مسلمانانِ ہند کوتحریک آزادی سے جوڑنا تھا ،دونوں اخبارات اپنے وقت کے کثیر الاشاعت اخبار تھے،مسلمانوں میں بے پناہ مقبول تھے ،ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

مولانا آزاد نے اپنا زیادہ تر وقت مسلمانوں میں دینی اصلاحات کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی میں دیا ،ایک طرف وہ امام الہند کہلائے تو دوسری طرف جنگِ آزادی کے معروف سرخیل کہلائے۔

ملک کی آزادی میں حصہ لینے والی سب سے بڑی واحد پارٹی کانگریس کے چیدہ اہم لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا ،وہ بہت کم عمری میں ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے ،اس کے بعد کئی بار کانگریس کے صدر رہے۔

ملک آزاد ہوا ،مولانا ابوالکلام آزاد ملک کے سب سے پہلے وزیر تعلیم منتخب کیے گئے ،ہمیں آج اس عظیم الشان قوتِ تعلیم انٹرنیشنل کانفرس میں مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات پیش کرنے ہیں۔

۱۸ر فروری ۱۹۴۷ء کی پریس کانفرس میں مولانا آزاد نے تعلیم کے حوالہ سے اپنے بنیادی نظریات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''صحیح طور پر آزادانہ کردار اور انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم لوگوں میں زبردست تبدیلی کا باعث ہوسکتی ہے اور انھیں ترقی کی طرف لے جاسکتی ہے۔''

چنان چہ مولانا آزاد نے تعلیم وثقافت کے تعلق سے جو کام کیے ،ان میں سب سے اہم کوشش لکھنؤ میں دینی مدارس ،مکاتب ،اور دارالعلوم کے سربراہوں کی کانفرنس بلائی ،جس میں

انھوں نے سائنس اورٹیکنالوجی کی جدید معلومات کو اپنے نصابِ تعلیم میں داخل کرنے پر زور دیا۔

نیز انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا:

’’تعلیم کا واحد مقصد روزی روٹی کمانا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تعلیم سے شخصیت سازی کا کام لینا چاہیے، اور یہی تعلیم کا سب سے مفید پہلو ہے اور اسی سے معاشی اور تمدنی نظام میں بہتری آسکتی ہے۔‘‘

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات چار بنیادوں پر قائم تھے:

(۱) ذہنی بیداری۔ (۲) اتحاد و ترقی۔ (۳) مذہبی رواداری۔ (۴) عالمی اخوت۔

مولانا آزاد کے خیال میں آزاد ہندوستان میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد نئی نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنا ہونا چاہیے۔

کیوں کہ انگریزوں کے طریقہ تعلیم نے نوجوان نسل کے لیے دو زہریلے نظریات پیدا کر دیئے تھے، (۱) غلامی (۲) علیحدہ پسندی۔

انگریزوں کے تعلیمی نظام کا مقصد حکومت کے لیے ایسے کارندے پیدا کرنا تھا، جو ان کے لیے کام آئیں، اسی مقصد کے لیے انھوں نے علیحدہ پسندی کا بیج بویا، اور طریقہ تعلیم کو سب سے موثر وسیلہ بنایا۔

لہذا سب سے پہلے اس زہر کو جدید نسل سے نکالنا چاہیے، اس کے بعد ملک کے تعلیمی مقاصد میں غلامی کی جگہ آزادی، اور تعصب کی جگہ مذہبی رواداری کو ملنا چاہیے، جس کے نتیجہ میں ہم سب مغربیت کے بجائے اپنے شان دار ماضی پر فخر کر سکیں۔

مولانا آزاد تعلیم کو صرف ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتے تھے، بلکہ اس کے ذریعہ سے ذہنوں میں بیداری لانے اور انھیں آئندہ زندگی میں خود کفیل بنانے پر زور دیتے تھے۔

تقریباً دو صدیوں تک مغربی اور انگریزی طرزِ تعلیم نے نئی نسل کو جس غلامانہ ذہنیت اور تنگ نظری کا شکار بنا دیا تھا، لوگ برطانیہ جا کر تعلیم حاصل کرنا باعث فخر سمجھتے تھے

،اور ملک کے علمی سرمایہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے،اس صورت حال میں تبدیلی لانا ضروری تھا، پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا:

''سوال یہ ہے کہ اب تک تعلیم پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا،اس پر غیر ملکی حکومت کا قبضہ تھا، جو کچھ انھوں نے پڑھایا ممکن ہے، صحیح ہو،جس طرح پڑھایا،اس نے ہمارے ذہنوں کو بجائے کھولنے کے بند کر دیا۔''

مولانا آزاد نے ہر موقع اور ہر فکر و عمل میں درمیان کی راہ اپنانے کی تلقین کی،ان کے خیال میں آزاد ہندوستان کے لیے مغربی طرزِ تعلیم اور مشرقی طرزِ تعلیم کے درمیان کی راہ ہی مفید ہوگی ،اس لیے آئندہ ہمارا طرزِ تعلیم ایسا ہو کہ دل دماغ اور عقلیت و روحانیت میں توازن قائم رہے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی اور توازن پر مشتمل تھی ،تاکہ نئی نسل میں جہاں سائنس کا صحیح استعمال آجائے ،وہیں اس کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول بھی ممکن ہو ،جو انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہیں ،ایک عالم اور مشرقی اقدار کے علم بردار ہونے کے باوجود مولانا آزاد نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو ملک کی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھا،ان کے خیال میں جو اچھا ہے، جہاں سے ملے ،لے لو،اور جو خراب ہے، جہاں بھی ہو،اسے چھوڑ دو،مولانا آزاد زندگی بھر اسی نظریہ پر کاربند رہے، یہ ملک سماجی ،لسانی اور مذہبی لحاظ سے دنیا کا واحد ملک ہے،جس کا دامن گلہائے رنگارنگ سے مزین ہے، بہ الفاظ دیگر اوتاروں ، رشیوں اور خدا ترس رنگ سے مزین ہے، بالفاظ دیگر اوتاروں، رشیوں اور خدا ترس لوگوں کا ملک ہے،اس ملک میں تقریباً اناسی مذاہب اور سات تین ذات و برادری اور قبائل کے لوگ آباد ہیں۔

مولانا آزاد کی ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کی وہ تقاریر جو انھوں نے تعلیمی پروگراموں میں کی تھیں،اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مولانا

آزاد کے ذہن میں تعلیم کا وسیع اور کافی گہرا مفہوم تھا، انھوں نے انفرادی تعلیم کے بجائے قومی تعلیم کا تصور کا پیش کیا، وہ تعلیمِ نسواں کے بھی زبردست حامی تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس سے ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہو جائیں گے، وہ سکنڈری سطح کی تعلیم کو مفت رکھنا چاہتے تھے، جس پر آزادی کے پچاس سال بعد عمل شروع ہوا، اسی طرح انھوں نے تعلیم کے لیے مخصوص بجٹ ایک فیصد کو بڑھا کر دس فیصد کرنے کی تجویز رکھی۔

وزارتِ تعلیم کا عہدۂ جلیل سنبھالتے ہی ملک میں تعلیم و تعلم کی ایسی پختہ بنیادیں ڈالیں کہ جس پر آئندہ نسلیں خوب صورت محل تعمیر کر سکیں۔

علاوہ ازیں پروفیشنل تعلیم، تعلیمِ صنعت و حرفت اور تعلیمِ نسواں باشندگانِ وطن کے لیے ضروری قرار دیا، انھیں کی مساعی جمیلہ سے ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی آف ایجوکیشن کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد ملک میں اعلیٰ تعلیم کی سہولیات مہیا کرنا تھا، جو اس زمانہ میں نہیں تھیں۔

۱۹۵۱ء میں کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کو قائم کیا، جو بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ ٹیکنالوجی کھڑک پور کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۹۵۲ء میں U G C کو قائم کر کے اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسائل عطا کیے۔

مولانا آزاد نے دیگر علوم و فنون کے ساتھ فنی تعلیم کے لیے بھی جدوجہد کی، آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیل ایجوکیشن کے نام سے ایک مرکز قائم کیا اور پورے ملک میں ٹیکنیکی تعلیم کے لیے جدید شعبے قائم کیے۔

ملک کے تہذیبی اور ادبی ورثہ کی حفاظت کے لیے مختلف شہروں میں ایجوکیشنل لائبریریاں قائم کیں، جہاں لوگ بیٹھ کر رسائل و اخبارات سے مستفید ہوں۔

تعلیم کے بارے میں پانچ پروگرام پیش کیے:

(۱) اسکول جانے والے تمام بچوں کے لیے بیسک ایجوکیشن کی فراہمی۔

(۲) ناخواندہ بالغوں کے لیے سماجی تعلیم۔

(۳) سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کو اونچا کرنے کے لیے سہولتوں کی فراہمی۔

(۴) قومی ضروریات کے حصول کے لیے فنی اور سائنسی تعلیم۔

(۵) فنون لطیفہ کے فروغ اور دیگر تفریحات کی فراہمی کے لیے ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ۔

ان کے زمانہ میں وزارتِ تعلیم نے مختلف شعبوں میں رہنمائی کی، اور بتایا کہ تعلیم صرف کتابی علم کا نام نہیں، اس زمانہ میں سائنٹیفک اور ٹیکنیکل ایجوکیشن، ٹیچر ٹریننگ، زبان کو پڑھانے کی ٹریننگ، شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لیے اسکالرشپ کا آغاز ہوا۔

ملک کے پس ماندہ طبقات کی ترقی کی اسکیمیں شروع ہوئیں، فروغ انسانی وسائل کے نام کی اصطلاح کا اگرچہ استعمال نہیں ہوا، لیکن وزارتِ تعلیم کی اس طرح تنظیم کی گئی کہ تعلیم کو انسانی وسائل کے فروغ کا ذریعہ بنانے کی سمت میں وزارت تعلیم کی توجہ مبذول ہوئی، ملک کی تعلیمی وسائنسی ترقی کے لیے مولانا آزاد کی قیادت میں وزارتِ تعلیم نے گراں قدر کام کیا، جس میں فنی تعلیم کی کل ہند مجلس کی تنظیم جدید، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا قیام، کونسل فار سائنٹیفک اینڈ ریسرچ، اور اس کے ماتحت سائنسی تحقیقات کے قومی اداروں کا قیام، جس سے ہمہ جہت کام انجام پائے، خاص طور پر یو جی سی کی تشکیل سے ملک میں تعلیم کا جال سا بچھ گیا، اور تعلیمی اداروں کو فراخ دلی کے ساتھ مالی امداد فراہم ہونے لگی، ان کی رفتار ترقی کے ساتھ سمت ومعیار کو سمجھنے میں مدد ملی۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ہندوستان میں تعلیم کا جو غلغلہ نظر آتا ہے، دوسو کے قریب یونیورسٹیاں، آئی، ٹی، آئی، سائنسی انسٹی ٹیوٹ،

فنون لطیفہ کی اکیڈمیاں قائم ہیں، وہ روشن دماغ اور وسیع النظر وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی ہی دین ہے۔

مولانا نسیم ظہیر اصلاحی۔ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نظریۂ تعلیم

علامہ حمید الدین فراہی چودہویں صدی ہجری کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے جنکی نظیر اس بزم گیتی میں کم ہی نظر آئی، یوں تو آپ کی شہرت نظم قرآن کے داعی و مبلغ بلکہ اس کے معلم کی حیثیت سے زیادہ ہے اور قرآنی علوم و معارف کی تلاش و تحقیق ان کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم و جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے فہم و ادراک میں بھی وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مولانا کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ ہماری قوم کے ایسے فرد ہیں جس کی اس وقت نظیر نہیں۔ آپ میں مشرقی و مغربی دونوں فضیلتیں موجود ہیں اور پھر خدا نے دل و دماغ ایسا دیا ہے کہ باید شاید'' (ذکر فراہی، ص۲۹۹)

فکر و تدبر مولانا کا مستقل مشغلہ رہا، اس لیے جو کچھ بھی کہا اور لکھا اس میں نقل و روایت پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ کو بنیاد بنایا اور اپنی الگ راہ نکالی۔ مولانا فراہی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس سے تاحیات وابستہ رہے۔ مدرسۃ الاسلام کراچی ۱۸۹۷ تا ۱۹۰۴۔ ایم اے او کالج علی گڑھ ۱۹۰۷ تا ۱۹۰۸۔ میور سینٹرل کالج الہ آباد ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۴۔ دار العلوم حیدرآباد ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۹۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ۱۹۱۹ تا ۱۹۳۰، سے ان کی وابستگی اور وہاں کے تجربات اور حالات زمانہ کے اقتضاءات نے مولانا کی فکر و تخیل کو مہمیز کیا اور تعلیم کا ایک نیا تصور منصۂ شہود پر آیا۔

غدر ۱۸۵۷ کے بعد اسلامیانِ ہند پر جو قیامت صغری برپا ہوئی، اس سے نہ صرف مسلمانوں کا نظام تعلیم درہم برہم ہوا بلکہ ایک زندہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے

اپنے وجود و بقا کا نہایت نازک اور اہم مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ چونکہ تعلیم کے بغیر کسی زندہ قوم کے وجود کا تصور نہیں ہو سکتا اس لیے مسلمانوں نے اپنی انتہائی پریشانی اور شکستہ حالی کے باوجود سب سے پہلے اپنا الگ نظام تعلیم برپا کرنے کی کوشش کی اور علی گڑھ تحریک اور دیوبند تحریک وجود میں آئی اور دونوں نے تعلیم کی الگ الگ راہ اختیار کی۔ بلا شبہ یہ دونوں کاوشیں اپنی بعض کمیوں اور کمزوریوں کے باوجود نہایت نیک اور مبارک تھیں تاہم اس سے مسلمانوں کی علمی و فکری پستی و کجی کی مکمل اصلاح شاید ممکن نہ تھی اور نہ تعلیم کے مطلوبہ نتائج کی ان سے توقع تھی ،اس لیے بعض روشن خیال اور بیدار مغز علماء نے اصلاح نصاب کی ایک نئی تحریک برپا کی۔ اس تحریک سے تعلیم کا ایک نیا اور وسیع تصور سامنے آیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اس تحریک کے روح رواں اور صف اول کے قائدین میں تھے۔ علامہ شبلی اپنی قومی، علمی اور تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں میں اپنے جن خوردوں اور شاگردوں کو شامل کرتے اور ان سے مدد لیتے تھے ان میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نام نامی اسم گرامی سرفہرست ہے۔ شبلی و فراہی کے مابین فکری اتحاد کے باوجود بعض علمی و تعلیمی مسائل میں توافق نہیں پایا جاتا۔ علامہ شبلی کا تصور تعلیم تحلیل و تجزیہ کے عمل سے بارہا گزر چکا۔ جبکہ مولانا فراہی کے نظریہ تعلیم پر کام بالکل نہیں ہوا۔ حالانکہ دونوں کے تصور تعلیم کا موازنہ و جائزہ ایک اہم علمی موضوع ہے۔ جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام اس لیے مشکل ہے کہ مولانا فراہی کا تصور تعلیم ابھی تک پوری طرح سامنے نہیں آ سکا۔

دارالعلوم حیدرآباد سے پہلے جن تین اداروں سے مولانا فراہی منسلک رہے وہاں ان کی مصروفیت صرف درجوں میں تدریس تک محدود رہی باقی اوقات اپنے تحقیقی و تصنیفی کام میں صرف کرتے رہے۔ تعلیمی امور و مسائل سے ان کا باقاعدہ ذمہ دارانہ تعلق نہیں تھا۔ اس لیے وہاں مولانا کی معلوم سرگرمیوں میں کسی ایسی سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا جس سے ان کے تصور تعلیم کا کچھ اندازہ ہو۔ البتہ دارالعلوم حیدرآباد وہ صرف ملازمت کے لئے نہیں گئے تھے بلکہ ایک خاص تعلیمی منصوبہ کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے تھے اس منصوبہ کے اصل خالق علامہ شبلی نعمانیؒ تھے جن کا تخیل یہ تھا کہ دارالعلوم حیدرآباد کو جدید قسم کی مشرقی یونیورسٹی بنایا جائے اور اس میں عربی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی بھی بقدر ضرورت تعلیم

دی جائے۔(ذکر فراہی،ص ۲۵۶)

مولانا فراہی نے وہاں پہنچ کر ''تشکیلِ ہیئت دارالعلوم'' کے نام سے ایک اسکیم بنائی اور پھراس کی روشنی میں اردو ذریعۂ تعلیم کی ایک یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ مرتب کیا اوراس کوروبہ عمل لانے میں بڑی محنت وکاوش اور استقلال سے کام لیااورایک حدتک اس کے نفاذ کی راہ بھی ہموار کرلی مگر مخالفین کی طرف سے روکاوٹیں کھڑی کی گئیں اور بالآخر مولانا کی تعلیمی اسکیم کوتقریبا سبوتاژ کر دیا گیا جس سے مولانا دل برداشتہ ہوگئے اور وہاں سے مستعفی ہوکر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر آگئے ۔یہاں ان کونہایت سازگار فضا میسر آئی جو مدتوں سے ان کی راہ تک رہی تھی ۔چنانچہ اپنے علمی وتعلیمی تصور کے مطابق انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کی صورت گری کی اور نظریۂ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے اعتبار سے اس کو مدارس ہند میں ایک منفرد اور ممتاز ادارہ کی حیثیت متعارف کرایا۔

مولانا فراہی کے تصورتعلیم کی تلاش وتحقیق کے لیےانہی دواداروں کے عہدفراہی کی رودادِعلمی وتعلیمی اورفراہی سرگرمی کا مطالعہ وجائزہ درکار ہے۔ڈاکٹرشرف الدین اصلاحی مرحوم نے ''ذکرفراہی''میں مدرسۃ الاصلاح سے متعلق دستیاب تقریباتمام موادجمع کر دیا ہے۔جبکہ دارالعلوم حیدرآباد یا عثمانیہ یونیورسٹی سے متعلق مولانا کے تعلیمی تصورات کا بہت مجمل ذکرکیا ہے اورنہایت اختصار کے ساتھ اہم اورممتاز نکات کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے۔اصل مواداور ضروری نکات اپنے مستقل مضمون''مولانا فراہی کے تعلیمی نظریات'' کے لیےاٹھارکھا ہے۔

<u>مقصدِتعلیم:</u>

مولانا فراہی کے تصورتعلیم کا سراغ دینے والےان ذرائع پرگفتگوکرنے سے پہلے یہ جان لینا مناسب ہوگا کہ مولانا کے نزدیک تعلیم کا مقصد کیا ہے؟اس کی وضاحت کرتے ہوئےان کے شاگردرشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

دارالعلوم حیدرآباد:

مولانا حمیدالدین فراہی کے حیدرآباد جانے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے

علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''حیدرآباد دکن میں دارالعلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا، جس نے حیدرآباد کی علمی وتعلیمی ترقی میں کارنمایاں انجام دیا تھا۔اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ شرقیات سے تھا۔غالبا ۱۹۰۸ میں مدراس یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ داران کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات وتغیرات کی فکر لاحق ہوئی اور اس کے لیے نواب عماد الملک مرحوم سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن اور المالطیفی آئی۔سی۔ایس، جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی ایک مجلس بنائی، جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے۔مولانا نے اس کے لئے ایک اسکیم مرتب کی اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی ۔۔۔۔۔۔مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی یہ ایک یونیورسٹی ہوگی ،جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی ۔یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی۔اس اسکیم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لیے مولانا حمید الدینؒ کا انتخاب ہوا اور وہ اس کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے'' (بحوالہ ذکر فراہی ص ۲۵۶)

مولانا جب دارالعلوم کے پرنسپل مقرر ہوگئے اور اصلاح دارالعلوم کی اسکیم کو جس کا ذکر گذر چکا نظام حیدرآباد نے منظوری دے دی تو اس کے بعد دارالعلوم کا درجہ اورینٹل کالج کا ہوگیا۔اس کالج کے جو اغراض ومقاصد طے کیے گئے ان کے حصول کے لیے تین مفصلہ ذیل طریقے اختیار کئے گئے:

(۱) مشرقی علوم کی تعلیم زیادہ کامل اور مذہبی بنائی

(۲) انگریزی زبان کو بطور زبان دوم لازمی قرار دیا

(۳) نصاب تعلیم میں علوم جدیدہ کو داخل کیا گیا (ذکر فراہی ص ۲۶۱)

مولانا کو حیدرآباد آئے ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ دارالعلوم کا ساٹھ سالہ جشن منایا گیا نواب سالار جنگ نے اپنے خطبۂ صدارت میں مولانا فراہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ امر بھی بڑی خوشی کا باعث ہے کہ قدیم علوم کے ساتھ جدید تعلیم کو بھی شریک

کرنے یعنی زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے طلبہ کو جدید علوم وفنون سے باخبر بنانے کا التزام رکھنے کی کوشش اس مدرسے میں ہو رہی ہے۔اس لحاظ سے اس مدرسہ کی صدر مدرسی کی خدمت پر مولوی حمید الدین صاحب کا تقرر عمل میں آیا جو علوم قدیمہ کے عالم ہونے کے علاوہ بی اے کی ڈگری بھی رکھتے ہیں'' (ذکر فراہی، ص ۲۸۶)

مولانا فراہیؒ نے دارالعلوم حیدرآباد کے پرنسپل مقرر ہونے کے بعد دارالعلوم کی اصلاح وترقی کے لیے ''تشکیل ہیئت دارالعلوم'' کے نام سے جو اسکیم تیار کی تھی، اس میں بقول ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم:

''دوررس نتائج کی حامل کئی انقلابی تبدیلیاں تجویز کیں۔اس اسکیم سے تعلیم کے باب میں مولانا کے تخیلات کا واضح طور پر علم ہوتا ہے۔اس اسکیم کا مقصد دارالعلوم کو اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ بنانا تھا'' (ذکر فراہی، ص ۲۹۳)

اس اسکیم کا اصل متن ہمارے سامنے نہیں ہے۔ڈاکٹر شرف الدین صاحب مرحوم کے پاس محفوظ ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اس کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس کی ضروری اور اہم باتیں ملاحظہ ہوں:

''اس اسکیم میں بنیادی اہمیت کی حامل صرف دو باتیں تھیں۔اول یہ کہ نہ صرف قدیم و جدید بلکہ ان دونوں کے نظام تعلیم اور طریق تعلیم کی خوبیوں کو جمع کرنے کی اس طرح کوشش کی جائے کہ اس سے ایک مسلمان معاشرہ کی جملہ ضرورتیں بوجہ احسن پوری ہوں۔دوم یہ کہ کسی غیر ملکی زبان کے بجائے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔اس اسکیم کی موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی رائے اور ردعمل کا اظہار کیا گیا'' (ذکر فراہی، ص ۲۹۳)

آگے لکھتے ہیں:

''اس اسکیم میں تعلیم کے جن بنیادی مسائل سے تعرض کیا گیا ہے اور ان سے متعلق تجاویز پیش کی گئی ہیں ان کی اہمیت وافادیت آج بھی مسلم ہے تقریبا ایک قرن گزرنے کے بعد بھی آج بھی برصغیر پاک وہند ہی نہیں دنیا کے تمام مسلم ممالک میں تعلیم کے یہ مسائل موجود ہیں اور اپنا حل چاہتے ہیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصل اسکیم

سے چند فقروں کا ایک اقتباس نقل کر دیا جائے جو پوری اسکیم کا ماحصل ہے۔۔۔۔:

''دارالعلوم نے جو اعلیٰ مطمح نظر یعنی جامعیت علوم قدیمہ وجدیدہ وتعلیم بزبان اردو قرار دیا ہے اس سے ہرگز انحراف نہ کیا جائے، کیونکہ اس اصلاح کی یہی روح ہے''(ذکر فراہی، ص۲۹۴)

دارالعلوم جس کے مولانا فراہی پرنسپل تھے، اس کی کمیٹی برائے ''اصلاح نصاب'' کے بھی مولانا صدر تھے یہ کمیٹی چودہ افراد پر مشتمل تھی۔اس کمیٹی اور اس کی سفارشات کے متعلق ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم لکھتے ہیں:

''اس کمیٹی نے دو برس سے کچھ زائد عرصے میں اصلاح نصاب سے متعلق اپنی سفارشات تیار کر کے پیش کر دیں۔لیکن چونکہ اس دوران عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہو گیا اور دارالعلوم کو اس کا حصہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے یونیورسٹی کے نصاب کی تیاری میں مدد لینے کے لیے ان سفارشات کو محفوظ تو کر لیا گیا، لیکن خود دارالعلوم کی اصلاح وترقی کے سلسلہ میں جو منصوبے تھے اس کے بعد وہ کالعدم ہو گئے''(۲۹۴)

مولانا فراہی کی آمد کے بعد دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں کیا انقلابی تبدیلیاں ہوئیں اور کون سے جدید علوم داخل نصاب ہوئے؟ اس کا بہت زیادہ سراغ نہیں ملتا۔تاہم اتنا معلوم ہے کہ اب وہاں انگریزی کے علاوہ سائنسی علوم، طبعیات، کیمیا اور اقلیدس کی تعلیم اس کے نصاب کا حصہ بن گئی، مولانا فراہی کی ایک مختصر تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس وقت ''عالم'' کو سائنس بطور اختیاری مضمون ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے نصاب کے نمونے پر پڑھائی جاتی ہے۔لیکن ''دبیر'' کو طبعیات اور کیمیا کے چھوٹے رسالے پڑھائے جاتے ہیں۔''دبیر'' کے لیے سائنس لازمی مضمون ہے اور اقلیدس کے ساتھ ایک پرچہ تین گھنٹے کا ۱۰۰ نمبر کا دیا جاتا ہے۔جس میں قریب نصف کے سائنس کے سوالات ہوتے ہیں۔امتحان مولوی ومنشی کے لیے بھی دونوں رسالے مقرر ہیں''(۲۹۹،۲۹۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم جہاں کبھی صرف درس نظامیہ کا مروجہ نصاب

پڑھایا جاتا تھا وہاں مولانا کے زمانۂ صدارت میں سائنسی علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔اسی طرح تاریخ بھی اس کے نصاب میں ایک اہم مضمون کی حیثیت سے داخلِ نصاب ہوئی۔اسکی تعلیم سے متعلق مولانا کا خیال جاننے کے لیے ہم ان کی ایک تحریر نقل کرتے ہیں۔جوانہوں نے تاریخ کے ایک استاذ کے انتخاب کے وجوہ جواز پر محکمۂ تعلیم کے استفسار کے جواب میں لکھی تھی۔اس تحریر سے تعلیم کے باب میں مولانا کی بلند نگاہی اور مغربی علوم سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے:

''دارالعلوم میں اس وقت فن تاریخ۔۔۔۔۔تا جماعت ''کامل'' داخل نصاب ہے اور محض جدید کتابوں کا درس دینا مقصود نہیں بلکہ ایک وسیع مطالعہ سے جو سرمایۂ آگہی حاصل ہو اس سے طلبہ کو مستفید کرانا مطمح نظر ہے۔فارسی اور عربی میں جو تاریخی تصانیف ہیں وہ بیشتر بطور روز نامہ کے لکھی گئی ہیں اور واقعات پر محض سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور سیاسی، تمدنی، مذہبی ،اخلاقی حالات سے بہت کم بحث کی گئی ہے اور علل واسباب کی تفتیش بالکل مفقود ہے۔بر خلاف اس کے یورپ میں فن تاریخ ایک نہایت وسیع فن ہو گیا ہے۔اس کے تحقیقات و انکشافات، میں مختلف علوم سے کام لیا گیا ہے۔جن کے نام بھی ہمارے یہاں موجود نہیں ان پر تصانیف کا تو کیا ذکر۔مزید برآں نصاب زیر تجویز میں فن تاریخ کے ساتھ علم التمول (پولیٹیکل اکانومی) بھی منظّم ہوگیا ہے جو نہایت طویل اور معرکۃ الآرا، مباحث پر مشتمل ہے۔اس کے ساتھ ہمارے یہاں کتب تاریخ کو انشا پردازوں کی جولانگاہ بنایا گیا ہے۔۔۔۔۔ان وجوہ پر نگاہ کر کے استاذ فن تاریخ کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب ضروری قرار دیا گیا جو ایک طرف مغربی سرمایۂ تاریخ سے بہرہ اندوز ہو اور دوسری طرف عربی ادب میں بھی اچھی دستگاہ رکھتا ہو اور اس کے ساتھ علم التمول میں بھی کافی مہارت رکھتا ہو''(۲۸۰)

اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شرف الدین صاحب لکھتے ہیں:

''اس مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا تاریخ کے استاذ کے لیے کن اوصاف کو ضروری سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک تاریخ پڑھانے کا صحیح طریقہ کیا تھا اور خود یہ فن اپنے تاریخی پس منظر میں اب کن امور کا متقاضی ہے اور اس وقت تاریخ کا قدیم اور جدید جو سرمایہ موجود ہے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور اس سے کس طرح استفادہ کرنا چاہیے اور خود استفادہ کر کے طلبہ کو مستفید کرنے کا صحیح

طریقہ کیا ہے۔اس نوٹ سے علم تاریخ پر مولانا کی وسیع اور ناقدانہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے‘‘(۲۸۰)

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے بعض مضامین میں جس مشرقی یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا تھا ،اسی میں رنگ بھرنے کے لیے مولانا فراہی الہ آباد سے حیدرآباد گئے تھے۔چنانچہ اس کے ابتدائی منشور کی تیاری میں جن چار عہدیداروں نے حصہ لیا ان میں ایک نام مولانا فراہی کا بھی تھا۔اسی طرح اس کے نصاب کی تیاری کے لیے گیارہ افراد پر مشتمل ایک مجلس بنائی گئی ۔ممبران کی اس فہرست میں مولانا فراہی کا نام چوتھے نمبر پر ہے( )

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی صورت گری میں شبلی وفراہی کے تصورات کو بھی دخل ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا جامعہ عثمانیہ کے نظام تعلیم کو ان خطوط پر استوار نہ کر سکے جو ان کے پیش نظر تھے۔ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

’’مولانا حمیدالدین صاحب ہی تھے جنھوں نے عصری علوم وفنون کی اردو زبان میں تعلیم کی تجویز پیش کی اور اس کا خاکہ تیار کیا۔ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھائی جائے ،لیکن راس مسعود صاحب اور نواب سر حیدر نواز جنگ حیدری صاحب نے ان کے اس تخیل کو کہ علوم کی تعلیم کی زبان اردو ہو قبول کیا مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو در اصل دینیات کی عربی تعلیم دی جائے قبول نہیں کیا۔اور یہی درحقیقت حیدرآباد سے ان کی دل برداشتگی کا سبب ہوا‘‘(۳۲۲)

آگے پھر لکھتے ہیں:

’’مولانا فراہی اور مخالفین کے درمیان اختلاف فقط ذریعۂ تعلیم یعنی اردو یا عربی نہیں تھا بلکہ اس سے بڑھ کر اختلاف طرز تعلیم اور نصاب تعلیم بلکہ خود مقصد تعلیم تک پہونچ چکا تھا۔حریفوں نے جامعہ کی سمت قبلہ ہی بدل کر رکھ دی۔شبلی کی مجوزہ مشرقی یونیورسٹی نے مغربی یونیورسٹی کا جامہ پہن لیا،جس کا مابہ الامتیاز صرف یہ رہ گیا کہ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا‘‘(۳۲۲،۳۲۳)

مزید لکھتے ہیں:

’’جامعہ میں دینی ومشرقی علوم کی اولیت اور برتری کو یہ صدمہ پہنچا کہ ان کی حیثیت

ثانوی ہوگئی ۔دارالعلوم کے لیے انہوں نے جو اسکیم تیار کی تھی اور جس کو پوری طرح یونیورسٹی پر حاوی اور اثر انداز ہونا تھا سرد خانے میں چلی گئی‘‘ (۳۲۳،۳۲۴)

یہ تفصیل میں نے اس لیے کر دی کہ اس کے ملاحظہ سے مولانا کا تصور تعلیم سمجھنے میں مدد ملے گی اور اس کا ایک ہلکا سا خاکہ کسی قدر سامنے آ جائے گا۔تعلیم کے جو نکات اس تفصیل سے سامنے آتے ہیں،ان کو بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے متعلق ان کا جو تخیل تھا اسے بھی پیش کر دیا جائے۔

مدرسۃ الاصلاح

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر مشرقی یوپی کا بہت قدیم اور نہایت معروف ادارہ ہے ۔قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ،جدید و قدیم کی آمیزش اور مسلکی رواداری اور غیر جانب داری اس کا نشانِ امتیاز ہے۔

جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی بنیادوں میں شبلی و فراہی کے تعلیمی نظریات کی اگر تھوڑی بہت آمیزش ہے تو مدرسۃ الاصلاح کے علمی و فکری رخ کے تعیین اور اس کے نظام تعلیم کی صورت گری میں ان دونوں بزرگوں کے علمی و تعلیمی تصورات کا بھرپور انعکاس پایا جاتا ہے۔اس لیے مولانا فراہیؒ کے تصور تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے جہاں ان کے وسیع لٹریچر کا مطالعہ ضروری ہے وہیں مدرسۃ الاصلاح کے نصاب تعلیم اور اس کے نظریہ تعلیم کا جائزہ بھی ضروری ہے۔

مولانا فراہی مدرسۃ الاصلاح کو جن خطوط پر چلانا چاہتے تھے،انکو بقول مولانا امین احسن اصلاحیؒ ’’خود اپنے قلم سے انہوں نے مدرسہ کے دستور میں ان لفظوں میں لکھ دیا ہے‘‘:

’’اصل مقصد اس مدرسہ کا مسلمانوں کی مذہبی و دنیوی تعلیم ہے۔اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔

انتظام تعلیم میں یہ مدرسہ خصوصیات ذیل ہمیشہ پیش نظر رکھے گا:

الف: قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتناء

ب: اصل علم و قابلیت کو مطمح نظر رکھنا نہ کسی محدود نصاب کتب کو الا قرآن ومتون

حدیث

ج: درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع وروحانیت اسلام

و: آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت

ہ: کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ

شرح: (خصوصیات الف و با بنیادی ہیں، ج ان کا ثمر ہے اور د، ہ، ان کے ذرائع ہیں اور ان کی اہمیت میں باہمی فرق و تفاوت ان کی ترتیب سے سمجھنا چاہیے ۔)''(۳۷۷)

مولانا فراہیؒ کے قلم سے مدرسۃ الاصلاح کے اغراض ومقاصد اور اس کے نظریۂ تعلیم کے تعلق سے مذکورۃ الصدر تحریر کے علاوہ اور کوئی تحریر شاید نہیں ہے۔اس تحریر میں انتہائی اجمال واور اختصار ہے۔یقیناً اس اجمال کی تفصیل مولانا نے اپنی مجلسوں میں اساتذہ اور ذمہ داروں کے سامنے اور مدرسہ کی مختلف مجالس میں فاضل ممبران کے سامنے ضرور کی ہوگی ۔چنانچہ مولانا کے فکر وخیال سے آگاہی رکھنے والوں نے اپنے اپنے طور پر اس اجمال کی تفصیل کی ہے مگر مدعا سب کا ایک ہی ہے۔مولانا اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس مدرسہ کے متعلق جو باتیں اصول کی حیثیت سے ان (مولانا فراہی) کے سامنے تھیں وہ بار بار چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔مدرسہ کے مطبوعہ کاغذات سے ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

۱۔مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ غریبانہ اور مذہبی زندگی بسر کریں اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں کفاف پر قناعت کریں

۲۔اس مدرسہ کو غرباء مسلمین کی اعانت سے چلایا جائے۔سرکاری اثر سے آزاد رکھا جائے۔آزادی اور دینی روح کا تحفظ اصل الاصول ہے

۳۔قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو۔اس کے بعد حدیث و فقہ پر زور دیا جائے۔منطق وفلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں۔ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دی جائے۔حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو

۔فقہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے ۔تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو ۔تکفیر وتفسیق کا ولولہ نہ ابھرے ۔صرف ونحو کی تعلیم عملی ہو۔فنون کی تعلیم میں امہات فن پیش نظر رہیں اور لکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے ۔بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے ۔۔۔۔حصول معاش کے لیے صنعت کی تعلیم دی جائے ۔مدت تعلیم کم سے کم ہو اور نرخ تعلیم انتہائی ارزاں

۴۔یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو۔یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں ندوی و دیوبندی اصلاحی سب تعلیم دیں ۔جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر آپس میں شیر وشکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں'' (۳۸۰)

مولانا اصلاحیؒ کی ہی ایک تحریر کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو، جو مولانا فراہی کی حیات میں مدرسہ کی روداد میں چھپی تھی جس کو بعض لوگوں نے مولانا فراہی کی تحریر سمجھ لیا ہے ۔حالانکہ وہ مولانا اصلاحی کی تحریر ہے۔البتہ ان کے اپنے الفاظ ہیں ''لیکن بہر حال اس میں مو لانا فراہی کے ذہن کی ترجمانی ہے'' (۳۷۹)

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''مدرسۃ الاصلاح کا دعوی ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پالیا ہے۔اس نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے۔۔۔۔۔

وہ مقصد اساسی اور صراط مستقیم کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی ''میں تمہارے لیے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں جب تک اسے مضبوط پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے'' مدرسۃ الاصلاح کا دعوی ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی اصلی تعلیم کو کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن کے لیے آلہ ووسیلہ ہو سکتے تھے ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ وہ مقصود بالذات بن گئے ۔یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس وتدریس کے لیے انہوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب حالت یہ ہو

گئی کہ محض تلاوت وحفظ الفاظ پر اکتفا کرلیا گیا اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی: یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔لیکن اللہ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت وترقی تسلیم کرکے جملہ علوم کی تعلیم کو اس کی تعلیم کے ماتحت کردی۔وہ ادب،فقہ،حدیث،تاریخ،سیر منطق وحکمت کی تعلیم دیتا ہے،لیکن اسطور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن مجید کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔''(۳۷۸)

مذکورۃ الصدر دونوں تفصیلات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا اپنا ایک منفرد تعلیمی نظریہ تھا۔جس کے تحت وہ ایک الگ نظام تعلیم برپا کرنا چاہتے تھے اور درجہ ذیل نکات اس نظام کی روح اور شناخت ہیں:

۱۔تعلیم میں جدید وقدیم کی تفریق نہ کی جائے بلکہ دونوں علوم ایک ساتھ پڑھائے جائیں۔البتہ قدیم مشرقی علوم کو ہر حال میں اولیت اور برتری حاصل ہونی چاہیے۔

۲۔نظام تعلیم وطریق تعلیم میں قدیم وجدید دونوں نظاموں کی خوبیوں کو اس طرح جمع کرنے کی کوشش کی جائے کہ ایک مسلم معاشرہ کی جملہ ضرورتیں باحسن وجوہ پوری ہوسکیں۔

۳۔نصاب تعلیم میں قرآن مجید کی حیثیت اصل واساس کی ہو اور دیگر علوم کو اس کے تابع بنا کر اس طرح ان کی تعلیم دی جائے کہ وہ فہم قرآن کے لیے معین ومددگار ثابت ہوں نہ کہ وہ اصل بن جائیں۔

۴۔قرآن مجید کی تعلیم سرسری اور تفسیروں کا تابع ہو کر نہ دی جائے بلکہ نہایت عالمانہ اور محققانہ ہوتا کہ قرآن مجید سے اخذ واستنباط کی صلاحیت طلبہ میں پیدا ہو اور ان کے اندر قرآنی حکم ومعارف اس طرح رچ بس جائیں کہ ان کے رد وقبول کا معیار قرآن ہی ہو جائے۔

۵۔احادیث کی تعلیم مسلکی عصبیت سے بلند ہو کر دی جائے اور ان کو قرآن مجید کی محکمات کی روشنی میں اور ان کے تابع لاکر سمجھنے اور سمجھانے کا انداز اختیار کیا جائے۔

۶۔فقہ میں کسی خاص فقہ کی تعلیم کے بجائے فقہ اسلامی یعنی تمام معروف فقہی

مدارس کے فقہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ طلبہ کو اقوال ائمہ کے دلائل و وجوہ کا علم ہو سکے اور ان کے اندر وسعت نظر، رواداری، اعتدال اور تحقیق کا مذاق پیدا ہو۔

۷۔ منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں اور ان کی جگہ ادب عربی اور جدید علوم کی تعلیم دی جائے۔

۸۔ عربی ادب میں ادب جاہلی پڑھایا جائے اس لیے کہ فہم قرآن کے لیے جاہلی ادب، اموی، عباسی اور بعد کے ادب سے زیادہ مفید و معاون ہے۔ قرآن مجید جاہلی ادب کے مطابق نازل ہوا ہے۔ جبکہ بعد کے ادب میں جاہلی ادب سے انحراف اور عجمی اثرات کی بہتات ہے۔

۹۔ قرآن مجید اور متون حدیث کے علاوہ کسی خاص نصاب یا کتاب کی تعلیم مقصود نہ ہو بلکہ نفس مضمون و موضوع پیش نظر ہو اور استاذ لکچرز کے ذریعہ زیر درس مضمون کے تمام پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ فن یا مضمون اپنی تمام جہتوں اور وسعتوں کے ساتھ طلبہ کے سامنے آجائے۔

۱۰۔ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو باقی تمام علوم وفنون آلیہ یہاں تک کہ اصول فقہ کی بھی تعلیم مادری زبان اردو مین دی جائے۔

۱۱۔ نحو وصرف کی تعلیم عملی ہو، مشق وتمرین کے ذریعہ ان کے اصول وقواعد طلبہ کو ذہن نشیں کرائے جائیں۔

۱۲۔ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ نصاب تعلیم نہایت آسان اور اچھی صلاحیت و قابلیت کا ضامن اور کم سے کم وقت کا طالب ہو۔ جبکہ ان کے دور میں رائج نصاب نہایت ادق اور مشکل کتابوں سے بوجھل تھا۔ وقت بھی زیادہ لگتا تھا اور طلبہ ان کتابوں کی گتھیوں اور موشگافیوں میں الجھے رہتے تھے۔

۱۳۔ تعلیم کو مختلف مراحل میں تقسیم کیا جائے مثلا مولوی، عالم، کامل، فاضل وغیرہ ۔نظام تعلیم ایسا سپاٹ نہ ہو کہ جبتک طالب علم ادارے کا پورا نصاب تعلیم مکمل نہ کرلے اسے کوئی سند نہ ملے۔

۱۴۔حالات اور ضرورت کے مطابق صنعت کی بھی تعلیم دی جائے تا کہ ترک تعلیم کے بعد طلبہ کے لیے حصول معاش کا راستہ کھلا رہے۔

۱۵۔ادارہ سرکاری اثر سے آزاد ہونا چاہیے ورنہ اس کی اصل دینی روح متاثر ہوگی ۔جبکہ آزادی اور دینی روح کا تحفظ اصل الاصول ہے۔

۱۶۔تعلیم کا اصل مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی فلاح کے لیے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے۔باقی چیزیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اسی نصب العین کے تابع ہیں۔

تعلیم کے مذکورہ اجمالی خاکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی کے تعلیمی فکر وتصور میں بڑی بلندی اور وسعت وجامعیت ہے وہ اسی طرح آفاقی ہے جس طرح قرآن اور اسلام کی دعوت آفاقی ہے اور بلاشبہ یہ جامع اور وسیع تصور تعلیم نتیجہ ہے برسوں قرآن مجید پر غور و تدبر کا۔اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مولانا کے تصور تعلیم کی بنیاد بھی قرآن مجید ہی ہے۔جس طرح ان کے دوسرے افکار قرآن ہی سے ماخوذ ومستفاد ہیں۔

مولانا کا یہ تصور تعلیم جہاں مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کا بہترین حل پیش کرتا ہے وہیں ان کے جماعتی ومسلکی اختلاف ونزاع کے استیصال کی راہ ہموار کرتا ہے۔مولانا مدرسۃ الاصلاح کو تعلیم کی جس راہ پر لے جانا چاہتے تھے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی رقمطراز ہیں:

> ''یہ ایک بہت عظیم علمی وتعلیمی منصوبہ تھا لیکن اس کے پیچھے قوت کوئی نہیں تھی۔اس کی پشت پر اس کو سمجھنے والی ایک قوم ہوتی ،ایک ملک ہوتا ایک حکومت ہوتی تو اس منصوبے کا تصور تصدیق سے آشنا ہوتا اور یہ فکر عمل سے ہمکنار ہوتا۔۔۔۔۔''

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم کی کتاب ''ذکر فراہی'' کے مطالعہ سے مولانا فراہی کے تصور تعلیم کا جو اجمالی خاکہ سامنے آیا اسے پیش کر دیا گیا،اس کی افادیت واہمیت پر اہل علم ،نظر ڈال سکتے ہیں۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی۔استاد حدیث وفقہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج،اعظم گڑھ

تعلیم کے بنیادی مقاصد

تاریکی اپنے ساتھ دہشت لے کر آتی ہے،سانپ اور بچھو کا ڈر،چوری کا اندیشہ،عزت وآبرو لٹ جانے کا خوف،جنات شیاطین،بھوت پریت کی دہشت،ہزاروں وسوسے اور اندیشے،صبح کے آثار نظر آتے ہی تمام اندیشے بادل کی چھٹ جاتے ہیں۔

جہالت بھی ایک تاریکی ہے اور اپنے ساتھ ہزاروں خرابیاں لے کر آتی ہے،ہر ایک برائی سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے،پھر بھی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں......علاج صرف ایک ہے۔علم کی شمع جلائی جائے،روشنی پھیلتے ہی جہالت کی تمام برائیاں خود بخود مٹ جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا تو اپنے جلو میں علم وقلم کی نوید لے کر آیا اور سب سے پہلی ''وحی'' پڑھنے اور لکھنے سے متعلق نازل ہوئی۔حالانکہ اس وقت عربوں اور دیگر قوموں میں بہت سی ایسی برائیاں تھیں جن پر ایک مصلح کی نگاہ جا کر ٹھہر سکتی تھی،شرک وبت پرستی اپنی انتہا کو چھو رہی تھی،پوری قوم کا مرکزیت اور اختلاف وانتشار کا شکار تھی،سیکڑوں دیوی اور دیوتاؤں کی طرح انسانی سماج بھی ان گنت حصوں میں بٹا ہوا تھا،ظلم وجور کی حکمرانی تھی،بے حیائی اور بے شرمی کا چلن تھا،انسانیت دم توڑ رہی تھی اور حیا ایک گوشے میں کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پہلی وحی میں ان برائیوں میں کسی کا ذکر نہیں ہے،بلکہ اس کی جگہ لکھنے اور پڑھنے کا تذکرہ ہے،اس لئے جہالت کی کوکھ سے ہی تمام برائیاں جنم لیتی ہیں،اور علم وہ سرچشمہ ہے جہاں سے تمام اچھائیاں پھوٹتی ہیں،اس لئے سب سے پہلے علم کی ضرورت ہے کہ کسی سماج میں جب علم کا سورج طلوع ہوگا تو وہ جہالت کو جلا کر

خاکستر کر دے گا۔

یہی وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ شرک وبت پرستی کی قباحت اور توحید کی حقیقت جانی جاسکتی ہے۔ارشادخداوندی ہے۔

شهدالله لا اله الاهو والملائكة واولوالعلم

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور علم والوں نے بھی۔

یہ اہل علم ہی ہیں جو اللہ کے پیغام کو سمجھنے اور اس کے ذریعے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

وتلك الامثال نضربها للناس ومايعقلها الاالعالمون

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور اہل علم ہی اس طرح کی چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

ولوردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم

خوف وامن کی بات کو اگر یہ لوگ رسول ﷺ یا اپنے حاکموں کے حوالے کر دیتے تو ان میں سے جو استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے ہیں۔

تعلیم کی اثر انگیزی اور ہمہ گیری:

کسی بھی سماج اور معاشرہ کی تشکیل میں تعلیم اور مقصد تعلیم کا موثر ترین کردار ہوتا ہے۔انسانی زندگی اور طرز حیات پر تعلیم کا گہرا اور دیرپا اثر ہوتا ہے،مولانا محمد رابع حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''یوں تو باضابطہ تعلیم اگر چہ پورے معاشرے کے ایک خاص طبقے کو دی جاتی ۔یعنی کم عمر طبقہ اور بچوں کولیکن وہ نتیجہ پورے معاشرے پر محیط ہوتی ہے۔اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہم جس نسل کو تعلیم دیتے یا دلواتے ہیں یہ نسل زیادہ سے زیادہ بیس

سال کی مدت میں معاشرہ میں اپنی کمزور ترین اور بے اثر سطح سے نکل کر معاشرہ کی موثر ترین سطح پر آ جاتی ہے اور سماج کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، یعنی جوان طبقہ جو سماج کی ہر قوت و اہمیت کی ذمہ داری کا حامل بنتا ہے''۔

اکبر الہ آبادی نے اسی لحاظ سے تعلیم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر کہا تھا۔

وہ قتل سے بچوں کے یوں بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یعنی اگر وہ بنی اسرائیل کے شیر خوار بچوں کو قتل کرنے کے بجائے ان کی تعلیم کا بندوبست کر دیتا جو قبطی اور فرعونی ذہن کے اساتذہ دیتے ہیں اور فرعونی ذہن کا نظام اور انتظام ہوتا اور مقاصد تعلیم بھی اسی ذہن کے مطابق ہوتے تو پھر بچے بڑے ہونے کے بعد بنی اسرائیل کے بجائے فرعون کے مقاصد کے کام کے بن جاتے اور بغیر قتل کے نتیجہ قتل حاصل ہو جاتا ہے

تعلیم کا مقصد:

تعلیم کا مقصد متعین کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کائنات میں خود انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اگر انسان ایک سماجی جانور ہے جیسا کہ اہل مغرب کا نظریہ ہے تو ظاہر ہے کہ جانور کی تعلیم کا مقصد پیٹ بھرنے اور جسمانی آسودگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ تعلیم کا جو بھی مقصد ہوگا وہ ذیلی اور ضمنی ہوگا اور ہر ایک کی گردش اسی محور کے اردگرد ہوگی۔ اور اگر اسلامی نقطہ نظر کے مطابق انسان اللہ کا بندہ اور خلیفہ قرار دیا جائے تو پھر اس کی تعلیم کا مقصد ہوگا کہ رب کی بندگی کے تقاضے کیا ہیں۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں، وہ کیا چیز ہیں جو اسے خلافت ارضی کا اہل بناتی ہیں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہئے جو اسے علم و بصیرت کی دولت سے مالا مال کر دے۔ زندگی کی ابدی اور روحانی حقیقتوں کا ادراک کرا سکے، سائنس اور معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق کے سمجھنے کے لائق بنا سکے، فطری

صلاحیتوں کے پروان چڑھانے، طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈال سکے، انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں نبھا سکے۔ اسلام نے مقصد تعلیم کو جو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی ہے اس کی مثال نہیں ہے، روحانی، ذہنی، جسمانی انفرادی، عائلی، اجتماعی اور اخلاقی تعلیمات جیسے اعلی اور پاکیزہ مقاصد کو صحیح مقام اور اہمیت دی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان بہترین سیرت وکردار کے حامل حکمراں، مدبر، مفکر اور سائنس داں پیدا ہوئے، جن کے عظیم کارناموں کے سامنے دنیا حیرت زدہ ہے۔۔

اسلامی مقصد تعلیم:

اسلامی مقصد تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کو سمیٹا جائے تو وہ ایک لفظ سے عبارت یعنی اللہ کا صالح بندہ بنانا، ارشاد ربانی ہے:

ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون ۵

لین تم اللہ والے بن جائے یہ اس لئے کہ تم پڑھاتے ہو آسمانی کتاب کو اور خود بھی اسے پڑھتے ہو۔

تعلیم کا یہ عمومی بنیادی مقصد ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، بچوں کی تعلیم وتربیت میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

۱۔ عقیدہ وایمان کی جڑیں مضبوط کرنا:

ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ پچھلے جنم کے باپ کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ بالکل پاک صاف پیدا ہوتا ہے اور اس میں فطری طور پر قبول حق کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ٦

اور طفولیت عمر کا وہ حصہ جس میں انسان کے مزاج اور بنیادی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے، یہ عمر کا مرحلہ ہے جس میں تعلیم وتربیت کا نتیجہ بڑا گہرا اور دوررس ہوتا ہے ۷

اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے قبول حق کے اسی استعداد کی طرف توجہ دینی چاہئے اور اس کے کان میں اذان اور اقامت کے الفاظ کہنے چاہئے ۸

اور جب بچہ بولنے کے لائق ہو تو سب سے پہلے اس کی زبان سے وحدانیت کا کلمہ نکلنا چاہئے ۹

اور جب شعور کی منزل سے قریب ہونے لگے تو عقیدہ وایمان کی جڑوں میں آبیاری ہونی چاہئے، اس کے سامنے ایسے واقعات لائے جائیں جن سے اللہ کی وحدانیت ،اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت، اسلامی تعلیمات کی اہمیت اور دولت اسلام کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکے، اسلام کی تاریخ اور اسلاف کے قصے سنائے جائیں، جس کے ذریعہ عقیدہ سے جذباتی وابستگی، جرأت وشجاعت اور ہمت وبہادری جیسی صفات کی حوصلہ افزائی ہو اور جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام وہ نظریہ حیات اور ضابطہ زندگی ہے جو دین ودنیا کو جامع ہے اور یہ ایک مکمل نظام حیات ہے، جس سے بہتر دنیا میں کوئی اور نظام اور نظریہ نہیں ہے، حضر عبداللہ بن عباسؓ کو طفولیت کے دوران اللہ کے رسولؐ نے جو کلمات سکھائے، اس سلسلے میں انہیں بنیادی پتھر سمجھنا چاہئے۔ اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے:

یاغلام انی اعلمك بكلمات احفظ الله يحفظك احفظ الله تجده تجاهك، اذا سالت فاسأل الله واذا استعنت فاستعن بالله واعلم ان الامة لو اجتمعت على ان ينفعوك بشئ لم ينفعوك الا بشئ قدكتبه الله لك وان اجتمعوا على ان يضروك بشئ لم يضروك الا بشئ قد كتبه الله عليك رفعت الا قلام وجفت الصحف ۱۰

بچے! میں تمہیں چند کلمات بتا رہا ہوں، اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہیں یاد رکھے گا، اسے اپنے سامنے پاؤ گے، جب کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، جب مدد لینا ہو تو اللہ سے مدد لو، یاد رکھو! اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کچھ فائدہ پہونچانا چاہیں، تو صرف اتنا ہی فائدہ پہونچا

سکتے ہیں جتنا پہلے سے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور گر نقصان پہونچانا چاہیں تو اللہ کے لکھے ہوئے سے زیادہ نقصان نہیں دے سکتے، قلم رکھ دیا گیا اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔

اسی مرحلہ میں بچوں کو اسلام کی روشن تاریخ اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ اور عبادات کا عادی بنانا چاہئے۔حضرت سعد بن وقاص کہتے ہیں کہ ہم بچوں کو اللہ کے رسولؐ کے غزوات سے باخبر کرنے کے لئے وہی اہتمام کرتے تھے جو قرآنی سورہ کے سکھانے کے لئے کرتے تھے ۱۱ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور دس سال کی عمر میں نماز چھوڑنے پر ان کی پٹائی کرو اور ان کے بستر الگ کردو ۱۲

۴۔اسلامی نظریہ اور تہذیب سے حفاظت:

جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ بچوں کے ذہن میں عقیدہ وایمان کی اہمیت، حقانیت اور برتری کو پیوست کیا جائے، اسلام کو ایک کامل اور کامیاب نظریہ حیات کے طور پر پیش کیا جائے، وہیں اس کی بھی شدید ترین ضرورت ہے کہ غیر اسلامی نظریات اور تہذیب کے زہریلے اثرات سے ان کے معصوم ذہنوں کی حفاظت کی جائے۔حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جن باتوں کی نصیحت کی تھی، ان میں سب سے اہم اور پہلی نصیحت یہ ہے۔

یابنی لاتشرك بالله ان الشرك لظلم عظيم ۱۳

بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

حضرت لقمانؑ کی اس پوری نصیحت میں تعلیم وتربیت کے تمام بنیادی مقاصد کا خاکہ موجود ہے، چنانچہ اللہ کی وحدانیت اور شرک سے اجتناب، انفرادی اور عائلی ذمہ داریاں، سماجی تعلقات اور سیرت وکردار سازی میں سے ہر بنیادی بات کا ذکر ہے۔

اس وقت تعلیم وتربیت کے حوالے سے مسلمانوں کو دوطرح کی یلغار کا سامنا ہے، ذرائع ابلاغ

اور وسائل تعلیم کے ذریعہ مغربی افکار وتہذیب کو، جو عریانیت، فحاشی، تشکیک، لامذہبیت، مفاد پرستی سے عبارت ہے،فروغ مل رہا ہے،اپنی روشن تاریخ اور بے مثال تہذیب سے ناواقفیت کی وجہ سے مسلمان بچے ان چیزوں سے مرعوب ہورہے ہیں اور اپنے افکار اقدار کے تعلق سے احساس کمتری میں مبتلا ہورہے ہیں۔ان میں بے حیائی او بداخلاقی کو بڑھاوا مل رہا ہے۔

دوسری طرف بھارتی حکومت ہندوانہ اور مشرکانہ رسوم وافکار کو مسلط کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے، بچوں کو شرک اور مشرک شخصیات سے قریب کرنے کو کوشش کی جارہی ہے، ہندومیتھالوجی اور رسوم رواج اور کلچر کو برتر اور بہتر ذہن نشین کرایا جارہا ہے۔یوگا کو ایک ورزش کے طور پر متعارف کرایا جارہا ہےتعلیم اور ذرائع ابلاغ جیسے ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ مشرکانہ تہذیب کو مسلم گھروں میں داخل کیا جارہا ہے۔ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ مسلمانوں کے زیرانتظام چلنے والے اداروں میں بھی وہی کتابیں داخل نصاب ہیں جن میں ہندو عیسائیت اثرات نمایاں ہیں، اکبر مرحوم نے بڑے کرب اور حسرت کے ساتھ کہا تھا:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

لیکن اب تعلیم کے ساتھ الحاد کے آنے کی خبر عام ہوچکی ہے۔اس لئے ضرورت ہے کہ والدین بچوں کی دینی تعلیم پر پوری توجہ دیں اور اپنے گھروں میں مشرکانہ تہذیب کو داخل نہ ہونے دیں۔اور درسگاہوں میں مغربی اور ہندوانہ تہذیب اور رسوم وافکار کے مضر اثرات سے آگاہی کا خاطرخواہ نظم ہونا چاہئے۔

۳۔سیرت وکردارسازی:

جس انسانی وجود کو دنیا میں قدم رکھتے ہی وحدانیت کا کلمہ سنایا گیا ہو اللہ اور اس کے رسول کی محبت ماں کے دودھ میں شامل ہو، اللہ کا خوف اور نگرانی کا احساس خون بن کر رگوں میں دوڑ ہا ہو، اسی اعتماد اور بھروسہ، زندگی کے ہر قدم پر اس کی مدد اور دستگیری کا یقین اور ہر معاملہ میں اس کے سامنے سرتسلیم خم کردینے پر جس کی پرورش ہوئی ہو، یقینی طور پر وہ ہر اچھے کا

م اور اچھی عادت کی طرف لپک کر آئے گا، یہ چیزیں اس کی فطرت کی آواز وار عقل وخرد کی نگاہ میں مانوس اور پسندیدہ چیز ہوگی اور وہ برے اخلاق سے بدک کر بھاگے گا اس لئے کہ یہ اس کے لئے ایک اجنبی، غیر مانوس اور قبیح چیز ہوگی۔ بچے کے اندر اس فطری صلاحیت کی تعلیم کے ذریعہ پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ سیرت وکردار سازی کے لئے قرآن میں ایک بڑا جامع لفظ 'تزکیہ' استعمال کیا گیا ہے۔ تزکیہ کا مفہوم ہے پاک وصاف کرنا، نشو ونما دینا اور سنوارنا اور اس میں زندگی کا ہر پل اور ہر مرحلہ شامل ہے، خواہ اس کا تعلق نجی زندگی سے ہو یا اجتماعیت سے، عبادات ہو یا معاشرت، خیالات وافکار ہوں یا اخلاق، تہذیب وثقافت ہو یا سیاست، ہر چیز کو پاک کرنا اور سنوارنا اس میں شامل ہے۔ حدیث میں اس کے لئے 'احسان' کا لفظ اختیار کیا گیا ہے اور اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالی نے ہر چیز میں اس 'احسان' کو فرض قرار دیا ہے [۱۴] یہاں تک کہ دشمن کو قتل کرنے میں بھی اس خوبی کی رعایت ضروری اور چہرہ بگاڑنے، پیٹ چیر دینے یا اس کے علاوہ کوئی اایسی حرکت کرنے کی اجازت نہیں ہے جس سے انسانیت کی اہانت ہوتی ہو۔

انسان کے اندر خیر وشر دونوں طرح کی قوت موجود ہوتی ہے [۱۵] تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خیر کی قوت کو طاقت ور بنائے 'تقوی' کے میلانات کو پروان چڑھائے اور شر کی قوت کو کمزور اور برائی کے رجحانات کو بے اثر کردے، ایک بچے کے لئے والدین اور اساتذہ کی طرف سے یہ ایک بہترین تحفہ ہے [۱۶] اور ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ وہ بچے کو اچھے اخلاق سے آراستہ کریں اور برے کردار وعمل سے دور رکھیں، حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

اکرمو اولادکم احسنوا ادبھم [۱۷]

اپنی اولاد کی عظمت کو پہچانو اور انہیں اچھے آداب سے آراستہ کرو

من حق الولد علی الوالد ان یحسن ادبہ ویحسن اسمہ [۱۸]

باپ پر بچے کا حق یہ ہے کہ وہ اسے اچھے آداب سکھائے اور اچھا نام رکھے۔

نیز آپؐ نے فرمایا کہ:

علمو اولادکم واھلیکم الخیر وادبھم ۱۹

اپنے بچوں کواور گھر والوں کواچھی باتیں سکھاؤاور انہیں آداب سے آراستہ کرو۔

۴۔صلاحیتوں کی نشونما:

اللہ تبارک وتعالی نے انسان کو بے شمار صلاحتیں اور خصوصیتوں سے نوازا ہے،شکل وصورت کے اعتبار سے مخلوقات میں سب سے خوب تر اور عقل وخرد کے اعتبار سے سب سے برتر،قدرت کی صناعی کا وہ بہترین شاہکار ہے جو ہر طرح کی خوبیوں سے مالامال ہے،خالق کائنات کا ارشاد ہے:

وجعل لکھم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ماتشکرون ۲۰

اللہ تعالی نے تمہیں کان،آنکھ اور دل عطا کیا لیکن تم میں شکر گزار بہت کم ہیں۔کان،آنکھ اور دل تعلیم کے بنیادی ذرائع میں سے ہیں،لیکن جیسا کہ آیت کے آخر میں اشارہ کیا گیا ہے،عام طور پر انسانوں نے اللہ کے دیئے ہوئے ان انمول تحفوں کی قدر و قیمت نہیں پہچانی اور خالق و مالک کی شکر گذاری کے بجائے نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہوئے،ان دی ہوئی صلاحیتوں اور قوتوں کا غلط استعمال کیا گیا۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالی نے جو صلاحیتیں بخشی ہیں تعلیم کے ذریعہ انہیں پروان چڑھانے اور انہیں صحیح سمت دینے کی کوشش کی جائے،بے سمتی کی وجہ سے ان صلاحیتوں کے متعلق باز پرس ہوگی،ارشاد ربانی ہے:

ولا تقف مالیس لك به علم ان السمع والبصر والفواء کل اولئك کانه عنه مسئول ۲۱

ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑو جو تمہیں معلوم نہ ہو،کان،آنکھ اور دل،ہر ایک سے پوچھ ہوگی۔

حصول علم کی صلاحیت ہو یا غور وفکر کی قوت،زبان وبیان کی خوبی ہو یا تحریر و خطابت کا ملکہ،ان تمام صفات سے بچوں کو آراستہ اور مسلح کرنے کی ضرورت ہے۔ساتھ ہی جرأت وشجاعت،دوسروں کے ساتھ شفقت ومحبت،ایثار اور ہمدردی جیسی خوبیوں کو بڑھاوا

دینے اور ڈر و خوف کی نفسیات، بزدلی، احساس کمتری، غصہ اور حسد جیسی برائیوں سے چھٹکارا دینے اور شرم و حیا کو باقی رکھنے اور جھجھک کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔صحت و طاقت کی حفاظت:

ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت اور حفاظت کی طرف توجہ بھی ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں 'لاطوت' کے حکمرانی کا اہل ہونے کے سلسلے میں جن دو صفات کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک علمی صلاحیت ہے اور دوسری جسمانی قوت ہے [۲۲] اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ طاقت ور مومن اللہ کی نگاہ میں کمزور مومن سے زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے [۲۳] اور حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اپنے بچوں کو تیراکی، تیراندازی اور گھوڑسواری کی تعلیم دو۔ [۲۴]

۶۔سماجی ذمہ داریاں:

فرد کی تربیت ایسے انداز سے ہونی چاہئے کہ وہ خود اپنی ذات کے لئے، اپنے خاندان کے لئے اور اپنے سماج اور معاشرہ کے لئے قومی اور بین الاقوامی برادری کے لئے مفید اور نفع بخش ثابت ہو، اسے انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس ہو، دوسروں کے ساتھ اس کا رویہ بہتر ہو، حقوق ادا کرنے والا ہو، آداب کا پابند ہو کیونکہ ایک صالح معاشرہ اور بہترین سوسائٹی اسی وقت بن سکتی ہے جب کہ اچھے افراد تیار کئے جائیں، جن میں اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچنے اور عمل کرنے کا جذبہ ہو، اجتماعی مفاد کے لئے اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو۔

اسلام ایک انسان کو جن چیزوں کا پابند بنانا چاہتا ہے، ان میں سب سے اہم چیز تقویٰ ہے، یعنی ایک حساس دل، شفاف شعوری اور دائمی خشیت کے ساتھ اللہ کے تمام احکامات کا پابند ہو، زندگی کی راہ جو کانٹوں بھری راہ ہے، جس میں ہر طرف شہوات، لذات، حرص و طمع، جھوٹی امیدوں کے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس پر خار راستہ سے اس طرح سے گذرنا کہ دامن انسانیت داغدار نہ ہو۔ تقویٰ کہلاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو تمام خوبیوں کا سرچشمہ اور ہر طرح کی برائی کے لئے رکاوٹ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر پولیس اور

قانون کا خوف کسی جرم سے باز نہیں رکھ سکتا ہے۔قانون سے بچنے کے ہزاروں طریقے ہیں اور پولیس کی آنکھوں میں دھول ڈالا جا سکتا ہے۔اور اگر یہ صفت پیدا ہو جائے تو قانون اور پولیس کی پہونچ سے دور رہ کر بھی قانون شکنی کی ہمت نہیں ہو سکتی ہے۔

دوسری چیز جو ایک صالح معاشرہ کے قیام کے ضروری ہے وہ ہے شفقت ورحمت کا جذبہ جو انسان کے تمام جذبات پر حاوی اور غالب ہو،اسی سے اخوت اور بھائی چارگی اور ہر جاندار کے ساتھ ہمدردی اور ایثار کی صفت پیدا ہوتی ہے،عفو ودرگزر اور معاف کرنے کی خوبی کی نشونما ہوتی ہے۔ایک اچھے سماج کی تشکیل کے لئے تیسری چیز باہمی حقوق کی ادائیگی ہے۔جیسے والدین، رشتہ داروں، پڑوسیوں، اساتذہ، عمر رسیدہ، کمزوروں، بوڑھوں اور دوستوں کے حقوق۔ان سب کے ساتھ سماجی اور اجتماعی آداب سے آراستہ ہونا بھی ضروری ہے جیسے سلام اور اجازت کا طریقہ۔مجلس کے آداب، گفتگو اور مزاج کا سلیقہ، مبارکبادی اور مزاج پرسی اور مریض کی عیادت کے آداب وغیرہ جن کی تفصیلات کتاب وسنت اور اخلاقیات سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں سماجی آداب کی جو تفصیلات ملتی ہیں۔کسی اور مذہب اور قانون میں اس کی مثالیں نہیں ہیں۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین اسلام محض شخصی اور انفرادی مذہب نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پوری زندگی اور سماج سے ہے۔

سماج کے تئیں ایک فرد کی یہ بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سماج پر صالح تنقید کو کبھی نہ بھولے اور اچھائیوں کا حکم دے۔ان کے پھلنے پھولنے کے ذرائع پیدا کرے اور اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے، برائیوں کے خلاف نبرد آزما رہے، انہیں روکے اور ٹوکے اور برے کاموں کی حوصلہ شکنی کرے۔

اور بچوں کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان میں جرأت وشجاعت پیدا ہو تاکہ حق بات کہنے میں کوئی جھجھک اور خوف محسوس نہ کرے۔

مقصد تعلیم مفکرین کی نظر میں:

ا۔تعلیم برائے معاش:

مغرب اور جمہوریت کا علم برداروں کی نگاہ میں انسان ایک سماجی جانور ہے اس کی

حیثیت ایک معاشی اور عمرانی عامل کی سی، جو معاشرت کی دولت مشترکہ میں اضافہ کا باعث ہے، اس لئے ان کے یہاں ''تعلیم برائے معاش'' ہی بنیادی مقصد ہے۔ اگرچہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔ بچے کا شعور ابھی مکمل طور پر بیدار نہیں ہوتا کہ اسے موہوم 'فیوچر' کے خوف اور شوق میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ بچے کے سامنے بار بار یہ دہرایا جاتا ہے کہ تعلیم حاصل کرو تاکہ دولت جمع کر کے معاشرہ میں ایک نمایاں مقام حاصل کر سکو، علم کا رشتہ توڑ کر پیٹ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک اچھا پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں، کاریگر اور بزنس مین بننے کی بھاگ دوڑ میں ایک اچھا انسان راستے سے کہیں گم ہو جاتا ہے اور اس کی گم شدگی کا احساس بھی نہیں رہ جاتا۔ اکبر الہ آبادی نے تعلیم کے اسی انجام کو دیکھ کر کہا تھا:

یہ بات تو کھری ہے لیکن نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظم ملت بی اے میں صرف روٹی
کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

تعلیم برائے معاش کو ضمنی مقصد کے طور پر ملحوظ رکھا جا سکتا ہے اور تعلیم کے بعض مراحل میں ایسی تربیت اور ہنر ملنا چاہئے جس سے انسان ایک باوقار زندگی گذار سکے اور اس کے لئے سب ضروری چیز ہے نظام تعلیم، اور نظام حکومت کے درمیان مکمل ربط ہو تاکہ ملکی ضرورت کے مطابق معاشی عاملین کو تیار کیا جا سکے۔ لیکن معاشی عامل کو تعلیم کے بنیادی مقصد میں شامل کر لینے سے انسان ایک اچھا حیوان تو بن سکتا ہے لیکن ایک اچھا انسان بننے کی امید اس میں نہیں رکھنی چاہئے۔

۲۔ تعلیم برائے معلومات:

یعنی حصول علم کو خود مقصد بنا لینا اور جاننے کے لئے معلومات کو جمع کرنا، تاکہ بوقت ضرورت کام آئے یا مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہو کر کوئی ملازمت حاصل کر سکے، آج عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں یہی مقصد کارفرما ہے، چنانچہ افضل حسین لکھتے ہیں:

''اسی طرح سے بیشتر اساتذہ بھی تعلیم کا مقصد زبان سے خواہ کچھ بیان کریں مگر عملاً تعلیم برائے علمیت ہی کے قائل نظر آتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ اپنی ساری توجہ لکھنے، پڑھنے اپنی علمی لیاقت بڑھانے اور اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرنے پر مرکوز رکھیں، شخصیت کے دیگر پہلو (جسمانی اخلاقی) ان نظروں سے عموماً اوجھل رہتے ہیں'' ۲۵

تعلیم برائے علمیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس مقصد سے جو نظام بنایا جاتا ہے اور جو تعلیم گاہ قائم کی جاتی ہے وہ کردار سازی اور انسان آفرینی کی درسگاہ نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک کارخانہ ہوتا ہے جہاں بے جان پرزے ڈھالے جاتے ہیں، اس نظام تعلیم میں ساری توجہ امتحانات، سرٹیفکٹ اور عمارت تزئین کاری و آرائش پر ہوتی ہے اور سارا سرمایہ انہیں چیزوں پر لگایا جاتا ہے اور بے چارہ استاذ اور شاگرد جن کے نام پر یہ سارا ہنگامہ برپا ہے، وہ اس سوروغوغا میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور پڑھے لکھے جاہلوں اور تعلیم یافتہ بے کردار افراد کی کھیپ تیار ہوتی ۲۶

۳۔ تعلیم برائے وقت گزاری:

تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح سے گذارا جا سکتا ہے یعنی ایسے علوم سیکھے جائیں جس کے ذریعے فرصت کے اوقات کو مشغول کیا جا سکتا ہے، جیسے ادب، آرٹ وغیرہ۔ فرصت کے اوقات کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے خود اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کرام کے متعلق منقول ہے کہ وہ بسا اوقات مسجد نبوی میں بیٹھ کر زمانہ جاہلیت کے قصے بیان کرتے تھے اور دوران سفر شعروشاعری سے شغف رکھا کرتے تھے اس لئے ایسے علوم کو سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جس سے فرصت کے اوقات کو مصروف رکھا جا سکے، اس لئے کہ انسان ہر عبادت و ریاضت اور کام میں مشغول نہیں رہ سکتا ہے اس لئے تفریحی چیزوں کا جاننا بھی مقصود ہے۔ لیکن تفریح کو بھی جائز حد میں رکھنا ضروری ہے، اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے کہ ہر کام میں ایک وقت نشاط اور چستی ہوتی اور پھر سستی آجاتی ہے اور جو سستی سنت پر باقی رکھے وہ ہدایت یاب

ہے اور جسے اس کے علاوہ تک پہونچا دے وہ ہلاک ہو گیا۔ الترغیب ۱/۸۷

۴۔ تعلیم برائے شہریت:

انسان کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ ریاست کے لئے فائدہ مند اور مملکت کے لئے اچھا شہری ثابت ہو۔ یہ بھی تعلیم کا ایک مقصد ہے، اس نقطہ نظر کے مطابق انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ریاست اور معاشرہ کا ایک جزء ہے، اس کے انفرادی وجود کو فراموش کر دیا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے اسے تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے اس بات کی امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں گم کر دے گا اور اپنی شخصیت کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دے گا، مملکت کے مفاد اور اخلاقی قدروں اور اصول کے درمیان ٹکراؤ ہونے کی صورت میں ان اصولوں کو خیر باد کہہ دے گا۔

اس مقصد کے تحت شہریوں میں وطن سے محبت اور اس کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے، بلکہ وطن پرستی کی ترغیب دی جاتی ہے۔

وطن سے محبت اور خدمت کا جذبہ ایک قابل قدر صفت ہے لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ وطن سے محبت کی تعلیم تنگ نظر قومیت کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے اور انسانیت سے محبت اور عالمی برادری سے اخوت اور بھائی چارگی کا جذبہ سرد پڑتا جا رہا ہے اور مذہب، رنگ ونسل اور زبان کی بنیاد پر مختلف قومیتیں وجود میں آ رہی ہیں اور علاقائیت کو فروغ مل رہا ہے اور جس کی وجہ سے آئے دن جنگ وجدال کی نوبت آ رہی ہے۔

۵۔ سیرت وکردار سازی:

جمہوریت اور اشتراکیت کے علمبرداروں کی نگاہ میں سیرت وکردار سازی بھی تعلیم کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے، یہاں بعض غیر مسلم مفکرین کے اقوال نقل کئے جا رہے ہیں تا کہ اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

☆ استاذ کا سب اہم کام نہ تو عضلات کو مضبوط بنانا ہے اور جذبات کو شائستہ کرنا ہے بلکہ سیرت کو مضبوط بنانا ہے۔ (ریمانٹ)

☆ میں بچوں میں ہمت، طاقت، نیکی، خود فراموشی پیدا کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال

ہے کہ اگر ہم بچوں کی سیرت کی تشکیل میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو سماج خود بخود سدھر جائے گا۔ (گاندھی جی)

☆تعلیم کا مقصد مثالی انسان کی تکمیل ہے (پین)

☆تعلیم ایک ہنر ہے جس سے ماہرین خصوصی نہیں بلکہ انسان بنائے جاتے ہیں (مانٹین)

☆عام طور پر انسانیت کا اعلی ترین مقصد اخلاق تسلیم کیا جاتا ہے، بنا بریں تعلیم کا بھی (ہربارٹ)

بلاشبہ سیرت کی تشکیل تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ یہی وہ خوبی ہے جس کے ذریعہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کا تصور ہی اخلاق سے عبارت ہے کسی تعلیم یافتہ مگر بدکردار شخص کو دیکھ کر لوگ حیرت اور تعجب سے سوال کرتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر بھی یہ شخص بداخلاقی کیوں کررہا ہے؟

لیکن توجہ طلب یہ ہے کہ مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دینے اور اجتماعیت و دیاست سے بے دخل کردینے کے بعد سیرت و کردار سازی، مردم گیری اور انسان آفرینی کی بنیاد کیا ہوگی؟ کونسا داعیہ اور جذبہ ہوگا جس کی بنیاد پر کوئی شخص ناموفق ماحول میں بھی اچھے اخلاق و کردار اور اصول و اقدار کے دامن سے چمٹا رہے گا؟ معاشرہ کا خوف؟ سماج کا ڈر، قانون کی گرفت میں آجانے کا اندیشہ؟ کیا ان میں سے کوئی اچھے اخلاق و کردار کے اپنانے کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرسکتا ہے۔ جھوٹ کو سچ کے سانچے میں ڈھال کر، مختلف جھوٹی مصلحتوں کا سہارا لے کر معاشرہ کو مطمئن کیا جاسکتا ہے، مختلف تدبیروں کے ذریعہ قانون سے بچا جاسکتا ہے، خصوصا جبکہ نہ سماج کا ڈر ہو اور نہ پولیس کی پہونچ کا کیا وہاں ملک سے وفاداری کا سودا نہیں کیا جاسکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ریاست سے مذہب کو نکال دینے کے بعد اخلاق و کردار اور اصول اقدار کی حیثیت بے بنیاد عمارت اور بے مفہوم الفاظ کی رہ جاتی ہے، خود مفکرین کو اس حقیقت کا احساس ہے، چنانچہ مشہور فلسفی اور مفکر کانٹ کہتا ہے ”تین چیزوں پر اعتقاد کے بغیر اخلاق کا

کوئی وجود نہیں ہے، اللہ کا وجود، روح کا باقی رہنا اور مرنے کے بعد حساب وکتاب''۔

ایک اور جرمن فلسفی 'فیختا' لکھتا ہے کہ دین کے بغیر اخلاق ایک بے کار چیز ہے''۔

برطانیہ میں ایک وزیر کو جنسی جرائم کا مرتکب پایا گیا، اس کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے جج نے بڑے کرب اور افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ: ''دین کے بغیر اخلاق کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے اور اخلاق کے بغیر کوئی قانون نہیں چل سکتا ہے ۲۷

اور سید رابع ندوی لکھتے ہیں:

''اخلاقیات میں سے مذہب کی بے دخلی ایک خطرناک اقدام تھا، جس کا آج کے نظام تعلیم کے نتائج میں تجربہ ہو رہا ہے، دراصل اخلاقیات انسانی زندگی میں صحیح رنگ اور نکھار پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں اور ان کا مذہب سے چولی دامن کا ساتھ ہے، اگر ان دونوں کے مابین تفرق کی جاتی ہے تو ایک تو اخلاقیات اپنی اصل اور مضبوط بنیاد سے محروم ہوجاتی ہے، دوسرے انسانی زندگی میں ان کا اصل کردار ختم ہوجاتا ہے، اگر مذہب کی بنیاد ختم ہوجائے تو پھر آدمی سچ کیوں بولے، نازیبا حرکات سے کیوں باز رہے، ظلم ونفع اندوزی اور نفس پرستی سے کیوں گریزاں کرے، ان میں سے کسی بھی بری بات سے گریز کا مؤثر محرک باقی نہیں رہتا، اگر کوئی محرک تلاش کیا جاسکتا ہے وہ صرف مادی نفع وضرر ہے، اس لئے مذہب کو اخلاقیات سے بے دخل کرنے والے اخلاقیات کا رشتہ مادی مصالح سے جوڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ تعلق بے جوڑ اور بے نتیجہ سا ہوجاتا ہے، چنانچہ مغربی تمدن میں اخلاقیات صرف قانون اور مادی دباؤ کے دائرے تک محدود رہتی ہیں، بذات خود اپنی کوئی اساس نہیں رکھتی، غالباً اسی پیچیدگی کی وجہ سے مغربی نظریات میں مزید یہ نظریہ پیدا ہوگیا ہے کہ اخلاقیات سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی، یہ صرف مفروضات ہیں، جہاں جیسی مصلحت ہو وہاں ان کو ویسا ہی ڈھال لیا جانا چاہئے'' ۲۸

صحت و طاقت کی حفاظت، انفرادیت کی نشوونما، صلاحیتوں کو پروان چڑھانا، خاندان اور سماج کی ذمہ داریوں کا اہل بنانا بھی غیر مسلم مفکرین کے یہاں مقاصد تعلیم میں شامل ہیں اور اسلامی مقاصد تعلیم کے ذیل میں ان پر لکھا جا چکا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں تعلیم کا مقصد ہے کہ انسان کو اللہ کا نیک بندہ اور زمینی خلافت کا اہل بنانا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تعلیم وتربیت کے دوران درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

۱۔عقیدہ اور ایمان کی جڑوں کو مضبوط کرنا، اسلامی افکار ونظریات اور تعلیمات کی بہتری اور برتری کو پیوست کرنا، اسلام کو ایک مکمل دین، کامل نظریہ حیات اور ضابطہ زندگی کے طور پر پیش کرنا، جو زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر میدان میں رہنمائی کرتا ہے۔

۲۔حق وباطل اور اچھے اور برے میں فرق کرنے کی کسوٹی فراہم کرنا تاکہ باطل نظریات کا شکار نہ ہوں اور اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کرسکیں۔

۳۔ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی نشو ونما کرنا اور انہیں صحیح رخ پر ڈالنا۔

۴۔ورزش اور کھیل کود کی حوصلہ افزائی کرنا اور صحت سے متعلق معلومات فراہم کرنا، صفائی، ستھرائی اور حفظان صحت کے اصولوں سے باخبر کرنا۔

۵۔خاندانی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا اہل بنانا۔

۶۔سیرت وکردار سازی پر توجہ دینا۔

معاشی ذمہ داریوں کا اہل بنانا تعلیم کے مقصد میں شامل نہیں ہے، تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے اس کی طرف بھی توجہ ہونی چاہئے اور تعلیم کے ذیلی مقاصد میں شامل کیا جانا چاہئے۔

۷۔تعلیم برائے علم کی اسلام کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے۔

۸۔ایسی چیزوں کو جاننے کی جن کے ذریعہ فرصت کے اوقات مشغول رکھا جاسکے اجازت ہے۔

۹۔مملکت اور ریاست کا اچھا شہری اور سماج کا بے لوث خادم بنانا بھی تعلیم کا ایک مقصد ہے۔

حواشی وتعلیقات

(سورہ آل عمران:۱۸(۲)سورۃ عنکبوت:۴۳(۳)سورۃ انساء:۸۳(۴)سماج کی تعلیم وتربیت:۱۲۵ازمحمدرابع حسنی ندوی،مطبوعہ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۱۴۰۵ھ(۵)سورۃ آل عمران:۹۷(۶)کل مولود یولدعلی الفطرۃ فابواہ یہودانہ اوینصرانہ اویجسانہ صحیح بخاری:۱۳۸۵کتاب الجنائز(۷)روی مرفوعاالعلم فی الصغر کالنقش فی الحجر،رواہ البیہقی والطبرانی فی الاوسط،تربیت الاولاد:۲۰۷(۸)ابوداؤد:۹۲۴،سنن الترمذی،وقال البانی ضعیف، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض۲۰۰۷ء(۹)افتحوا علی صبیا نکم اوکلمۃ بلا الہ اللہ،رواہ الحاکم فی المستدرک،تربیت الاولاد،ج۱ص۱۱۷(۱۰)سنن ترمذی:۵۶۶،حدیث۲۵۱۶ وقال الالبانی صحیح،کتاب صفۃ القیامۃ الرقاق(۱۱(تربیت الاولاد فی الاسلام ج۱ص۱۱۹،ازعبداللہ ناصح علوان،مطبوعہ دارالسلام القاہرہ۲۰۰۷ء(۱۲)سنن ابی داؤد:۹۰ قال البانی حسن صحیح،مطبوعہ مکتبہ المعارف الریاض(۱۳)سورۃ القمان:۱۳(۱۴)ان اللہ کتب الاحسان علی کل شی ء...... صحیح مسلم:۷۵۵ حدیث:۱۹۵۵ء کتاب الصید،مطبوعہ المکتبۃ العصریہ بیروت ۲۰۰۲ء(۱۵)فالہمہا فجورہا وتقواہا،قدافلح من زکٰہا وقد خاب من دسٰہا،الشمس:۸۔۱۰(۱۶)مانحل والد ولد اافضل من حسن ادب،سنن ترمذی:۴۴۴،حدیث:۱۹۵۲،کتاب البروالصلۃ قال الالبانی ضعیف(۱۷)سنن ابن ماجہ:۶۰۹ حدیث۳۶۷۱،کتاب الادب باب برالوالدوالاحسان الی البنات،وقال الالبانی ضعیف جدا،مطبوعہ الریاض(۱۸)السنن الکبری للبیہقی،تربیت الاولاد،ج۱ص۱۳۶(۱۹)رواہ عبدالرزاق وسعید بن منصور،تربیت الاولاد ج۱ص۱۱۴(۲۰) سورۃ السجدہ:۹(۲۱)سورۃ نبی اسرائیل: ۳۶ (۲۲)وزادۃ بسطۃ فی العلم والجسم سورۃ البقرۃ:۲۴۷(۲۳)صحیح مسلم(۲۴)تربیت الاولاد ج۱ص۱۱۶ (۲۵)فن وتعلیم وتربیت:۲۹،ازافضل حسین،مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۲۰۰۸ء(۲۶)مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ:۱۸۵،از پروفیسر سید محمد سلیم،مطبوعہ دار تعلیمی تحقیق اجرہ لاہور(۲۷)اصول تعلیم:۲۰،از ڈاکٹر ضیاء الدین علوی،مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۲۰۰۷ء(۲۸)فن تعلیم وتربیت:۳۲۔۳۳(۲۹)تربیت الاولاد ج۱ص۱۳۶(۳۰)سماج کی تعلیم وتربیت:۹۱

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی ۔شعبہء فارسی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد۔۳۲

چریا کوٹ کے علماء ادباء اور محققین

خلافت عباسیہ کی تاریخ بہت ہی باوقار با کمال اور پر جلال رہی ہے۔اسی دور میں ہی مسلمانوں نے اسلامی علوم وفنون کی تدوین اور دیگر تمام زبانوں سے علوم وفنون و فلسفہ اور حکمت کے تراجم کیلئے صرف تراجم ہی نہیں کیا بلکہ ان علوم کے رموز ونکات ابتداء وارتقاء مراحل ومسائل پر روشن خیالی کے ساتھ غور وخوص کر کے انکا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ بھی کیا ساتھ ہی ساتھ مختلف علوم وفنون کی تدریس واشاعت کے لئے مکاتب مدارس دانشکدہ دانشگاہیں بھی قائم کی علمی کاموں اور کارناموں کے دوش بدوش صنعت وحرفت ،فن تعمیر اور شعر وادب کو بھی ترقی کی معراج پر پہنچا دیا بلاتمیز مذہب وملت ومرد وزن علم کو عام کر دیا ان کے کتب خانے مختلف علوم و حکمت اور فلسفہ ومنطق کے کتب سے بھرے پڑے تھے جہاں نہ جدید وقدیم کی کشمکش تھی اور نہ ہی تقلید کی روش بلکہ تحقیق تاویل اور ترویج کے دریچے وا تھے دنیا کے تمام علوم ان کی مٹھی میں سمٹ آئے تھے یہ علاقہ علماء ادباء محققین محدثین اور مہندسین کا مرکز ومسکن ہو گیا تھا تصوف گوشہ نشینی اور خود گریزی خود فریبی ثابت ہو رہی تھی حرکت حرارت حریت اور حرمت کا دور دورہ تھا قلم کی طاقت نے علم وہنر کے چمن میں تلاش وجستجو کے بے شمار لالہ وگل کھلائے تھے۔ان کی تہذیب وتمدن دنیاء کو خیرہ کئے ہوئے تھی کہ اچانک تاتاریوں کا طوفان آیا اور ایک ہی پل میں سب کچھ غارت کر کے رکھ دیا علماء پابند زنجیر ہوئے حکماء دار پر چڑھا دئے گئے اور علم ودانشوری کا گلا گھونٹ دیا گیا محققین معتوب ہوئے اور قتل عام کا حکم صادر ہوا۔دریا علماؤں کے خون سے سرخ اور ادباء کے کتب سے سیاہ ہو گیا دانائی جرم قرار پائی علم وفضل کا مسکن مقتل میں تبدیل ہو گیا زمین تنگ ہو گئی اور ہجرت ہی واحد ظریعہ بچا ایسے حالات میں جو لوگ بچ گئے انہوں نے دیگر ممالک کا سفر اختیار کیا انہیں میں ابو اسمٰعیل یوسف مخدوم زادہ بھی تھے۔

مخدوم زادہ عدن کے حاکم ابوجلال فخر الدین کے پوتے اور ابوالاعلا اعز الدین کے بیٹے تھے۔ مخدوم زادہ عدن سے بعہد تغلق ہندوستان آئے۔ بادشاہ کو جب انکے آنے کی خبر ملی تو علماء ومشائخ اور اراکین سلطنت کے ساتھ دہلی سے باہر جا کر پالم کے مقام پر انکا استقبال کیا۔ اور انتہائی ادب واحترام کے ساتھ ان کی پزیرائی کی مخدوم زادہ عباسی کے لقب سے انکو ملقب کیا اور بے شمار زمین اور جائدادیں انہیں عطا کیں جسکے متعلق ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی کے صفحہ ۴۹۶ میں اور ابوالقاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ کے صفحہ ۱۳۹ پر لکھا ہے کہ 'دولک تنکہ ءپرگنہ کوشک سیری وتمام محصول زمین داخل حصار و باغات نذر کیا'۔ اور ڈاکٹر حبیب اللہ نے اپنی تحقیق میں صفحہ ۴۲ پر ان الفاظ کو اس طرح تحریر کیا ہے۔ 'اور تمام پرگنہ سسری بطور جاگیر اور آذوقہ ءخیل وخدم کے مرفوع القلم دے دیا'، اور معتصم عباسی نے علمائے چریا کوٹ میں اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ دس لاکھ تنکہ قنوج کا علاقہ کوشک سیری وحصار سیری کے تمام محصلات بے شمار زمینیں حوض اور باغات مخدوم زادہ کی نذر کی'۔

تغلق کو مخدوم زادہ سے بہت عقیدت تھی وہ ان کے علم وفضل کا بہت قدردان تھا حکومت اور عدلیہ کے بیشتر معاملوں میں مخدوم زادہ کی رائے کو اولیّت دی جاتی تھی سیاست اور قیادت کے رموز ونکات میں انکا عمل دخل تھا سفر ع حضر میں وہ بادشاہ کے ساتھ ہوتے تھے برنی تاریخ فیروز شاہی کے صفحہ ۴۹۶، پر اور فرشتہ تاریخ فرشتہ جلد اول کے صفحہ ۱۳۹، پر لکھتا ہے کہ مخدوم زادہ عباسی جب کبھی بادشاہ سے ملنے دربار میں جاتے تھے تو بادشاہ احتراماً تخت سے اتر کر ان کا استقبال کرتا اور تخت پر اپنے پہلو میں بٹھاتا اور خود بکمال ادب ان کے سامنے بیٹھا رہتا۔

ز روی صدق برہمن قدم براہ بنہ
کہ رہروان رہ عاشقی ریا ن

تغلق کے انتقال کے بعد سارے معاملے یکسر تبدیل ہو گئے کیونکہ فیروز شاہ تغلق کی شخصیت علاوہ مذہب سیاست قیادت فلسفہ ومنطق اور انتظامی صلاحیت سے پوری طرح عاری تھی اسلئے فیروز شاہ تغلق اور مخدوم زادہ میں بہت سی باتوں پر اختلاف کھل کر سامنے آ گیا جسکا ذکر متعدد حوالوں تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں۔ محمد نبی عباسی، احسن الانساب بنوالعباس

چریا کوٹ، جو کہ ایک قلمی نسخہ ہے کے صفحہ ۱۹۔۱۸ پر اس اختلاف اور تعلقات میں خرابی کے متعلق لکھتے ہیں:

''فیروز شاہ تغلق اپنی ایک حرم سرا کی بیٹی سے جو حسن و جمال میں بے مثال تھی نکاح کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اسنے دارالسلطنت دہلی کے علماء سے مال و متاع کے زور پر فتویٰ حاصل کرنا چاہتا تھا سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ مولانا اسمٰعیل مخدوم زادہ علوم منقول پر کامل دسترس رکھتے ہیں اس عقدۂ لاینحل کو وہی حل کر سکتے ہیں اور وہ جو کچھ فرمادیں گے اس سے کسی کو انکار و اختلاف کی جرأت نہیں ہو سکتی۔''

محمد نبی عباسی اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ۔

''علماء کا یک زبان ہو کر مخدوم زادہ سے فتویٰ حاصل کرنے کے لئے سلطان سے کہنا دو وجوہ سے تھا ایک یہ کہ وہ سلطان کے غیظ و غضب سے خود کو بچانا چاہتے تھے اور دوسرے یہ کہ مخدوم زادہ کی نسبت فیروز شاہ کے مزاج میں تغیر پیدا کرنے کی سوچ رہے تھے۔''

حقیقت جو بھی رہی ہو مخدوم زادہ نے اس نکاح کو حرام قرار دیا متعدد تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے اس اختلافات کے اسباب مختلف بتائے ہیں لیکن اسباب جو بھی ہوں یہ اختلاف اعظم گڑھ اور یوروپ کے لئے ایک رحمت ثابت ہوئی وہ مخدوم زادہ معتوب ہو کر دہلی سے فتح پور (ہنسوہ) ہوتے ہوئے جون پور پہنچے جہاں ابراہیم شاہ شرقی نے انہیں چریا کوٹ اور آس پاس کے کئی پرگنات کی زمینداری عطا کی۔

سرش بگنبد گردوں فرو نمی آرد
کسی کہ از خس و خاشاک راہ بستر او

مخدوم زادہ اس علاقہ میں اپنی زمینداری کے ساتھ ساتھ قضا کی خدمت بھی بخوبی انجام دیتے ہوئے چریا کوٹ میں ہی وفات پائی اور یہیں سپرد خاک بھی ہوئے مخدوم زادہ کے تین فرزند تھے جنکے اسماء گرامی عاشق محی الدین نور، محمد مبارک اور عبداللہ یوسف تھے۔ عبداللہ یوسف بہت ہی باصلاحیت تھے جنکی ذہانت اور صلاحیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ نظام الدین اولیاء کی صحبت میں نزہت الارواح کا درس چل رہا تھا وہاں بیٹھے

ہوئے تمام لوگوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تشریح کر رہا تھا حضرت نظام الدین اولیاء نے آپ کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے آپ کی تشریح کو پسند فرمایا اور یہ شعر فی البدیہ کہا:

سات پانچ مل برہا بانچیں بول بولیں قیاسی
ان سبھن میں سانچیں بانچیں یوسف حسن عباسی

لیکن افسوس کہ عبداللہ یوسف کی زندگی نے وفا نہیں کی وہ چڑیا کوٹ پہنچنے کے چند دن بعد ہی عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ مخدوم زادہ نے انہیں کے نام پر چڑیا کوٹ کا نام یوسف آباد رکھا تھا جس کی شہادت مولوی نجم الدین چڑیا کوٹی کے یہ اشعار دے رہے ہیں:

چریا کوٹ خوانندش عوامش
و لیکن یوسف آباد ست نامش
فلک تا طرح این آباد بنہاد
ز خاک پاک جنت کرد بنیاد
چراغ آسمان روشن ز دودش
ز جنت میرسد ہر دم درودش

محمد مبارک بھی ابو اسمٰعیل یوسف مخدوم زادہ کے ایک بیٹے تھے وہ اولاد نرینہ سے محروم رہے صرف مخدوم زادہ کے بڑے صاحبزادے عاشق محی الدین نور، صاحبِ اولاد ہوئے انہیں کی نسل سے مخدوم زادہ کی نسل چلی اور اطراف میں شہرت و دولت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی مشہور و معروف ہوئی یہ خطہ انہیں کے فضل و کرم اور فیوض و برکات سے یونان و روما کے برابر جا پہنچا ایک طرف یہ علم و فضل اور تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے دوسری جانب چیرو اور بھر قوم مسلسل انکے وجود کو ختم کرنے کے در پے تھیں چونکہ یہ علاقہ مخدوم زادہ کی آمد سے قبل راجپوتوں اور چیرا قوم کا مسکن تھا اسلئے یہ قومیں اس علاقہ کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے بھر پور کوشش کر رہی تھیں بھر اور چیرا قوم کے متعلق ایک انگریز محقق مسٹر ٹی ڈبلیو ایچ ٹامبورٹ اسسٹنٹ کمشنر ضلع ڈیرا اسمٰعیل خاں نے اپنی کتاب خلاصۃ الحال اقوام الہند میں جو ۱۸۷۰ء

میں جیل ڈیرا اسمٰعیل خاں سے شائع ہوئی کے صفحہ ۸ پر لکھتا ہے کہ:

''یہ لوگ نہ یکجا نہ یکساں نہ خالص ہیں لیکن صمغ (گوند) کے مانند جو پانی میں گھل جاتی ہے جا بجا یعنی کوہستان یا جنگل میں منتشر پراگندہ ہیں ثابت ہوتا ہے کہ یہ اقوام گاہے گاہے زمانِ عنقریب بیلی پہاڑ سے اتر کر زمین ہموار پر متصرف ہوے مثلاً بھورا (بھر) اور چیرو علاقہ کشیر اودھ و بنارس و بہار میں تصرف کیا۔''

چیرو قوم چریا کوٹ میں قدیم زمانہ سے آباد تھی انکا پیشہ رہزنی چھنیتی اور ڈکیتی تھی اس وقت چونکہ اطراف میں چھوٹے چھوٹے راجہ ہوا کرتے تھے اور انکے علاقہ بھی ایک دوسرے سے الگ الگ ہوا کرتے تھے جسمیں باہم تصادم بھی ہوا کرتا تھا اسلئے زیادہ تر راجاؤں نے ایک دوسرے کیلئے انکا استعمال بھی کیا اور سرپرستی بھی کرتے رہے جسکی وجہ سے انکی طاقت مسلسل بڑھتی گئی انکا نہ کوئی مذہب تھا اور نہ ہی کوئی ذات بلکہ دبنگ اور سرکش لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ انکی شادیاں بھی آپس میں بلا تفریق ہوا کرتی تھیں انکی تعداد طاقت اور علاقہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنا ایک قلعہ بھی بنا لیا تھا جہاں انکا دربار بھی لگتا تھا انکی ایک فوج بھی تھی انکے فوجی آفیسر کا نام چیرس تھا جسے وہ لوگ چیرو کہا کرتے تھے یہی انکا سپہ سالار کفیل اور راجہ بھی تھا اس قوم کے متعلق ڈاکٹر حبیب اللہ اپنی تحقیق کے صفحہ ۲۱ پر لکھتے ہیں کہ:

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندو دورۂ اقتدار میں بلکہ اس سے بھی پہلے کسی بڑی طاقت کے مداخلت اور دست اندازی کے نہ کرنے کے سبب سے ہی چیرو اور بھروں نے اس علاقہ پر اپنا اقتدار قائم رکھا مینھ نگر قصبہ سے دکھن پچھم واقع اسورائن کا مہا تالاب ان راج بھروں اور شاہی خاندانوں کی یادگار کے طور پر موجود ہے چریا کوٹ چیرو قوم کا بسایا ہوا ہے انکے قدیم کوٹ (قلعہ) کے نشانات موجود ہیں۔''

چیرو قوم اور چریا کوٹ کے متعلق کلیم صفات اصلاحی شبلی میگزین ۲۰۰۷ء کے صفحہ ۱۱۰ پر لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ چریا کوٹ کے گرد و نواح میں پہلے چیرو قوم آباد تھی۔ ممکن ہے اس نام کی نسبت اسی قوم کی جانب ہو آئین اکبری مصنفہ ابوالفضل میں

چریا کوٹ کا تذکرہ ہوا ہے۔''

جب مخدوم زادہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چریا کوٹ پہنچے تھے تو راجپوتوں اور چیرو قوم سے سخت مقابلہ ہوا جسکے متعلق ڈاکٹر معتصم عباسی اسلام اور عصر جدید' اپریل ۱۹۷۳ء کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں کہ:

''مخدوم زادہ اپنے خیل وحشم کے ہمراہ جو نو سو افراد پر مشتمل تھا جب یہاں پہنچے تو مقامی راجپوت آبادی نے مزاحمت کی محاصرہ و مقابلہ تین روز تک طرفین میں جاری رہا کئی لوگ مارے گئے اسی دوران جونپور اطلاع پہنچی وہاں سے تازہ دم فوج مدد کو آئی اور اس نے سرکشوں کا قلع قمع کر دیا۔''

چرو قوم اپنی تمام تر قوت و طاقت کے باوجود مخدوم زادہ نے اپنی صلاحیت تدبر اور فوج کی کمک سے اس قوم کو شکست فاش دیا بیشتر آبادی نے اسلام قبول کیا اور کچھ نے راہ فرار اختیار کی راہ فرار اختیار کرنے والوں نے مخدوم کی خدمت میں حاضر ہو کر چریا کوٹ کے نام کو باقی رکھنے کی گزارش کی یہ التماس کیا کہ ہم اس علاقہ کو خالی کر دیں لیکن چریا کوٹ کے نام کو باقی رکھا جائے مخدوم زادہ نے انکی درخواست قبول فرمائی اور اس نام پر رضامند ہو گئے جس کے متعلق مولوی محمد نبی عباسی چریا کوٹی احسن الانساب بنو العباس قلمی نسخہ کے صفحہ ۲۲ پر لکھتے ہیں کہ:

''قوم چیرا چنین اخراج خودها بحضور حضرت مخدومؒ درخواست ابقائی نام خود ها کردند

عرض شان بغرض پذیرائی در آمده باسم یوسف آباد عرف چریا کوٹ موسوم ساخت۔''

مخدوم زادہ نے جب اس علاقہ پر غلبہ پا لیا تو علم و دانش کی شمع روشن کی لیکن چونکہ اس علاقہ میں برہمنوں راجپوتوں اور دیگر اقوام کی کثرت تھی اور وہ قدیم سنسکرت، پالی، پراکرت اور سناتن دھرم کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسلامی عقیدہ کو باطل قرار دیتے تھے بار بار بحثیں ہوتی تھیں مخدوم زادہ نے ان کے مذہب کے رموز و نکات کو سمجھنے کے لئے اور ان کا مدلل جواب دینے کے لئے سنسکرت سیکھنے کی طرف راغب ہوئے اور انہوں نے اس کا

معقول انتظام بھی کیا جس کے متعلق محمد مزمل دانش عباسی چریا کوٹی 'از تحریرِ غیر مطبوعہ میں لکھتے ہیں کہ:

''جب مخدوم زادہ شیخ اسمٰعیل یوسف دہلی سے چریا کوٹ آئے اور چیرا قوم سے جنگ میں جیت گئے تو زمانہ امن میں آیا لیکن ہندوؤں سے مذہبی بحثیں چھڑ گئیں برہمنوں کا جواب بنا سنسکرت سیکھے نہیں دیا جا سکتا تھا بغیر حسن وقبع سمجھے اور سنسکرت پر کامل دستگاہ حاصل کئے رد ناممکن تھا یہی سبب ہوا کہ عربی اور فارسی درس وتدریس کے ساتھ ساتھ سنسکرت بھی سیکھنی پڑی اور اس طرح یہ زبان یہاں کے عام نصاب میں داخل ہوگئی۔''

مخدوم زادہ نے اس علاقہ کو درس و تدریس کا مرکز بنا دیا اصلاح وفلاح درس و تدریس اور فیوض و برکات کا یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ تقریباً چھ صدیوں تک اس خاندان میں متواتر قائم رہا ہندوستان کی اہم علمی وادبی دینی وذہنی ارتقا میں اس خاندان کا رول انتہائی اہم رہا اور مخدوم زادہ کو ہند میں علماء کرام کے ایک مستقل سلسلے کے مورث اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے جن کی عبقری شخصیت نے آئندہ صدیوں کو علم کے خزانے سے بھر دیا اسلامی معاشرے کی ذہنی و فکری تشکیل اور علمی وثقافتی بیداری میں ان خاندان نے سپہ سالاری کا کردار ادا کیا اور یہ کفرستان اسلامی ضیاء باشیوں سے منور ہوا تھا مخدوم زادہ کا سلسلہءنسب نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ سے ملتا ہے اسی خاندانی نسب کی وجہ سے یہ عباسی کہلاتے ہیں اور اس خاندان کا ہر فرد اپنے نام کے ساتھ عباسی لکھتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔ اسلامی درس وتدریس کا سلسلہ اعظم گڑھ میں مخدوم زادہ سے ہی شروع ہوا اور پہلا مدرسہ چریا کوٹ میں قائم ہوا اسکے بعد شیخ مشید نے چریا کوٹ کی طرز پہ ہی سلطان پور بھیرا میں مدرسہ قائم کیا اسطرح کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم زادہ کا مدرسہء چریا کوٹ اعظم گڑھ میں دارالارقم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے متعلق محمد نبی عباسی مولف احسن لانساب بنوالعباس چریا کوٹ کے صفحہ ۲۲ پر لکھتے ہیں:

'' حضرت ممدوح بکمال فارغ البالی بعبادت معبود حقیقی و اشتغال درس و تدریس علوم

اوقات شریعت صرف می فرمود۔''

نزہۃ الخواطر، تاریخ مکرم، تاریخ فرشتہ، تاریخ فیروز شاہی، چار آئین محبوبی، تذکرہ علمائے مبارک پور، تذکرۂ علماء ہند، تذکرۂ علماء اعظم گڑھ، دیار پورب میں علم و علماء، میں چریا کوٹ کی درس وتدریس، منطق وفلسفہ،علم وہندسہ،علوم عقلیہ ونقلیہ، اورنئی ایجادات کی ترویج وتدریس کا ذکر کثرت سے ملتا ہے اس خاندان کے علماء دین وعلماء ادبیات نے تحقیق اور تدریس کے معیار کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ نہ صرف چریا کوٹ بلکہ پورا اعظم گڑھ ہندوستان کا یونان وروما کہا جانے لگا کلیم صفات اصلاحی شبلی میگزین کے صفحہ ۱۰۱ پر اسکی زرخیزی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

’’چریا کوٹ علم وادب اور فکر وفن کا وہ گہوارہ ہے جس کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی علمی اور بالخصوص اسلامی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی اس کی بے پایاں علمی شہرت اصلاً عباسی شیوخ کی مرہون منت ہے ہندوستان کے مسلم فرمانرواں نے بلاد مشرق میں جن علمی خاندانوں کو مدد معاش کے طور پر زمینیں اور جائدادیں دے رکھی تھیں ان میں عباسی شیوخ کا خانوادہ ممتاز تھا عہد قضاان کے خاندان میں صدیوں سے چلا آتا تھا۔‘‘

مخدوم زادہ یوسف حسن اسمٰعیل عباسی کے بڑے فرزند عاشق محی الدین عباسی کے بھی علم وفضل کے بے شمار گراں قدر کارنامے تھے وہ بڑی فضلیت وعلمیت کے عالم تھے ان کا انتقال ۸۳۴ھ میں ہوا مختلف علوم میں ان کے متعدد تصانیف تھیں جو دست برد زمانہ کا شکار ہو گئیں ان کی تصانیف کا تذکرہ یادداشت چریا کوٹ اور اسلام اور عصر جدید میں کثرت سے ملتا ہے انہوں نے اپنے نام پر ایک گاؤں نور محمد پور آباد کیا تھا اور ’نور افزائے جنت‘ سے انکی تاریخ وفات بھی نکلتی ہے۔ عاشق محی الدین کے فرزند محمد بن عاشق نے چریا کوٹ کے مدرسہ کو شہرت ومقبولیت کے آسمان پر پہنچا دیا ان کا شمار فقہ حنفی کے جلیل القدر ماہرین میں ہوتا تھا انہوں نے مخدوم زادہ کے مدرسہ کو اتنا وسیع وعظیم کر دیا کہ عظیم دانشگاہیں بھی اسکی تقلید وپیروی کرنے لگی ان کی کوشش محنت اور مشقت نے چریا کوٹ کو دارالعلوم بنا دیا اور وہ اسی مدرسہ میں پوری زندگی درس وتدریس میں مصروف رہے انہوں نے اپنے علم وفضل درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے قوم کی گراں قدر خدمت انجام دی مختلف موضوعات پر انکی متعدد کتابیں تھیں جن میں بیشتر نادرالوجود ہیں چند تصانیف ہی باد وباراں سے محفوظ رہ سکیں جن میں تفسیر میں التفسیر المحمدی،

ادب میں الجواہرالعربیہ فی فنون الادبیہ، اصول فقہ میں حاشیہ التلو تح، علم الموارث میں الکواکب الدری، وغیرہ بہت ہی مشہور ومقبول ہوئیں اور یہی تصانیف آج کے محققین کے لئے ماخز کا کام دے رہی ہیں محمد بن عاشق کے بعد ملاحمید عباسی نے علم وفضل کے جوہر دکھائے یہ انتہائی ذہین وفطین تھے سترہ سال کی عمر میں ہی انہیں تمام علوم میں دسترس حاصل ہوگئی تھی آپ کی دانائی وبینائی دیدہ وری ومعاملہ فہمی کی بہت شہرت تھی اور فن لغت میں تو وہ امام کا درجہ رکھتے تھے جب آپ کی شہرت مغلیہ دربار تک ہوئی تو شاہجہاں نے آپ کونہایت ادب واحترام کے ساتھ مغلیہ دربار میں مدعو کیا۔اور میر عدل کے منصب پر فائض کیا لیکن افسوس کہ صحت نے ساتھ نہ دیا زندگی نے وفانہ کی اور یہ بہت جلد بیمار ہوکر چریا کوٹ رخصت ہو لئے۔ چند دن بعد ہی انکا انتقال ہوگیا شاہجہاں نے انکی موت پر بہت ہی رنج وغم کا اظہار کیا۔آپ کے فرزند مولانا عبدالحئ عباسی بھی جامع الکمالات اور مجمع الصفات تھے یہ جس قدر قابل لائق اور فائق تھے اسی قدر خودداراور حساس بھی تھے زبان وقلم کے دھنی تھے شخصیت پر جلال تھی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ کوئی چیز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت زندگی بھرنہیں محسوس ہوئی جو بھی پڑھ لیتے تھے حفظ ہو جاتا تھا سیاست شہرت اور دولت سے ہمیشہ گریزاں رہے درس وتدریس اور تحقیق وتصنیف انکا مرغوب مشغلہ تھا انکی تصانیف کی طویل فہرست ہے چند دنوں اردوئے معلائے شاہ جہاں میں خدمت احتساب پر مامور رہے علماء عصر انکی قابلیت صلاحیت اور بے نیازی سے خائف رہتے جسکی وجہ سے انکے خلاف بے بنیاد قصہ گڑھتے رہے تاکہ انکی شاہی دربار سے چھٹی ہوجائے اسی چال اور فریب کا نتیجہ ہوا اسداللہ خاں وزیر سے آپ کی ناچاکی ہوگئی آپ نے خودداری اور وقار کے ساتھ ملازمت ترک کرکے چریا کوٹ چلے آئے اور درس وتدریس میں محو ہو گئے قدماء کی کتابوں پر حواشی لکھنے کا شوق پیدا ہوا وہ اسی میں مصروف ہو گئے اورنگزیب عالمگیر انکی شرافت صلاحیت صاف گوئی اور سنجیدگی کا معتقد تھا اس نے اپنے ہاتھ سے خط لکھکر انکو بار بار مدعو کیا لیکن انہوں نے ضعیفی اور صحت کا حوالہ دیکر جانے سے معزرت کر لی البتہ اپنے صاحبزادے مفتی محمد یحیٰ کو بھیج دیا جنہیں بادشاہ نے قضا کی خدمت تفویض کی اور موضع بھیکن پور کی زمینداری بھی عطا کی بھیکن پور کو انہوں نے چک مفتی یحیٰ کے نام سے آباد کیا۔

اسی خانوادے کی ایک عظیم شخصیت مولانا الفتاح عباسی کی بھی تھی علم وادب کے ساتھ ساتھ یہ فقہ کے دقیق مسائل پہ گہری نظر رکھتے تھے فقہ کی بیشتر کتب کا انہوں نے مطالع کر لیا تھا اور اس میدان میں انہیں مہارت حاصل ہوگئی تھی جو بھی لکھتے بہت ہی مدلل اور مفصل آپ کا شمار چند بڑے فقیہوں میں ہوتا تھا آپ نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں اور بزبان نظم فارسی ایک میراث نامہ بھی لکھا جسمیں میراث کے رموز ونکات اور شریعت کے احکامات کو بہت ہی آسان اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اس رسالہ کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے ۔

خدا را شکر کہ تحریر نامہ

مہذب گشت این میراث نامہ

مولانا فیض اللہ عباسی نے بھی خاندانی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے علم وفضل کی آبیاری کی اور ان کے فرزند ملا محمد حامد عباسی چریا کوٹی پر بچپن سے ہی علم کی طلب حاوی رہی وہ مسلسل علمی تشنگی بجھانے میں سرگرداں رہے علم کے عشق نے انہیں پیہم محو سفر رکھا وہ عنفوان شباب میں ہی گھر بار چھوڑ کر اہل علم وصاحب کرامات سے کسب علم کرنے لگے دربار مغلیہ میں جب ان کے علم وعمل کی خبر پہنچی تو انکا وظیفہ شاہی خزانے سے مقرر ہوا فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تالیف میں بھی پیش پیش رہے یہ چند ایسی خدمات تھی جو کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکتی ہیں ترتیب وتالیف کے علاوہ تعلیم وتربیت کے لئے بھی شاہی خاندان نے ان کا سہارا لیا شہزادوں میں اکبر ثانی کی تعلیم وتربیت انہیں کے ذمہ تھی عمر کے آخری ایام میں یہ چریا کوٹ آگئے یہیں سپرد خاک ہوئے مفتی محمد عباسی چریا کوٹی کے فرزند مجتبیٰ عباسی کو بھی خدا نے علم کی دولت سے مالا مال کیا تھا بہت کم عمری میں ہی فضل وکمال کے بیشتر زینے طئے کر چکے تھے بہت ہی مذہبی پرہیز گار اور متقی تھے اورنگزیب ان کی بہت قدر کرتا تھا ان کے علم کا معترف اور عمل کا معتقد تھا۔ دربار عالمگیری میں عہدۂ میر سامانی کے ساتھ ساتھ شہزادہ معظم کے اتالیق پر بھی مامور تھے روزینہ کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ منافع کی معافیات بھی شاہ آباد میں عطا ہوئی رضوانی، سیف مسلول، نسخۂ تعلیقات اور میراث نامہ آپکی مشہور تصانیف ہیں۔

مولوی محمد یحیٰ کے فرزند مولانا شکر اللہ عباسی چریا کوتی بھی آباو اجداد کی طرح

صاحب فن و ماہر کمالات تھے انکے علم فضل اور زور قلم کا شہرہ سنکر محمد شاہ نے زادہ سفر بھیج کر دہلی بلایا اور ندیم انجمن خاص بنایا مرتضیٰ عباسی قاضی ابوالحسن عباسی قاضی عبدالصمد عباسی مولانا حاکم عباسی نے بھی چمنستان ادب میں بے شمار لالہ وگل کھلائے اور گراں پایہ خدامات انجام دیں قاضی عبدالصمد چریا کوٹی فقہ علوم معقول ومنقول میں یکتا ویگانہ تھے محمد شاہ بادشاہ نے انہیں پرگنہ چریا کوٹ اور دیگر مقامات کا قاضی مقرر کیا تھا۔ محمد حاکم عباسی چریا کوٹی قاضی ابراہیم عباسی چریا کوٹی کے فرزند تھے اپنے وقت کے بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے تھے بلند فکری گرمیءطبع میں آپ کی کوئی نظیر نہیں ملتی تمام علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے پوری زندگی تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہے اور چریا کوٹ میں ہی مقیم رہے بڑے بڑے علماء فقہاء اور اولیاء دور دور سے آپ کے درس میں شریک ہونے آتے رہے سلطان علماء اور وزراء نے انہیں اپنے دربار سے وابستہ ہونے کی کوشش کی لیکن وہ مدرسہ کے گوشہ سے باہر نہ نکلے انکی عظمت بلندی اور بزرگی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو آپکے شاگرد ابوالحسن کو دہلی میں پیش آیا تھا۔ ابوالحسن چریا کوٹی جب اپنے استاد حاکم عباسی کے لئے انکا موروثی حق عہدۂ قضا لینے دہلی گئے تو وہاں ایک مناظرہ ہوا شاہ نے عہدۂ قضاء کا فرمان محمد حاکم کے بجائے ابوالحسن کے نام لکھ دیا۔ اس واقعہ کا ذکر معتصم عباسی رسالہ اسلام اور عصر جدید جولائی ۱۹۷۳ء کے صفحہ ۸۳ پر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''قاضی ابوالحسن عباسی چریا کوٹی مولانا محمد حاکم کے ارشد تلامذہ میں تھے مولانا حاکم اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنا موروثی حق عہدۂ قضاء حاصل کرنے خود دہلی نہ جا سکے تو انہوں نے ابوالحسن کو بھیج دیا وہ نواب قمرالدین خاں وزیر سے ملے اور اظہار مدعا کیا وزیر موصوف نے کہا کہ محمد حاکم کو خود آنا چاہئے تھا تاکہ انکی لیاقت اور قابلیت پرکھی جاتی ابوالحسن نے جواب دیا کیا کہ چونکہ دہلی میں علماء کا قحط ہے انکی لیاقت کا پرکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا لہٰذا انہوں نے اپنے حقیر شاگردوں میں سے مجھے بھیجا ہے وزیر موصوف کو غصہ آیا اسنے ابوالحسن کی رضامندی سے بزم مناظرہ منعقد کرائی جسمیں علماء دہلی جمع ہوئے لیکن کوئی بھی بحث میں ابوالحسن سے پیش نہ لے جا سکا نواب باوجود ناراضگی کے بہت متاثر ہوا ابوالحسن کے انکار کے باوجود اسنے عہدۂ

قضا کا فرمان محمد حاکم کے بجائے ابوالحسن کے نام لکھ دیا۔اسی وقت سے قضاء کا عہدہ محمد حاکم کے خاندان سے ابوالحسن کے خاندان میں منتقل ہوا۔‘‘

قاضی عبدالصمد عباسی چریاکوٹی کی اولاد میں قاضی غلام مخدوم عباسی انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔قرانیات، اسلامیات، اور فقہ واصول کے علاوہ پراکرت، پالی،سنسکرت اور ویدک سنسکرت میں بھی مہارت رکھتے تھے عربی و فارسی کے صاحب دیوان بھی تھے پنڈتوں سے مسلسل بحث کیا کرتے تھے سنسکرت اہل زبان کی طرح روانی سے بولتے تھے جلالی اور شدت پسند تھے انتقال سے چند روز قبل اپنی تمام تصانیف کو نزر آتش کر دیا ان کے آثار میں صرف ایک غزل ہی باقی رہ گئی ہے چند شعر پیش خدمت ہیں ۔

به باغ دهر نه گل مانده نے سمن باقیست
نه عندلیب پری چند در چمن باقیست
دلم بسوخت تنم سوخت استخواں هم سوخت
تمام سوختم و ذوق سوختن باقیست
ز فیض خان مکرم خوشم نیم محتاج
درون سینه ولی حسرت وطن باقیست

مولوی محمد احسن عباسی چریاکوٹی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ علم وادب کے ایک آفتاب تھے جسکی شعاؤں نے نہ صرف ادبی دنیا بلکہ علمی دنیا کے ہر گوشے کو بھی منور کیا ملا نظام الدین فرنگی بانی مدرسہ نظامی کے حلقہ درس سے استفادہ کیا ان کی شخصیت سے علم کا دریا رواں رہتا تھا علم وفضل اور دلائل وتاویل کی وجہ سے کبھی کسی مناظرہ میں شکست نہیں کھائی اس دانائی وبینائی کا شہرہ جب حاکم وقت کے کانوں میں پڑا تو انکی قدر افزائی اور پزیرائی کے لئے شاہی پیغام بھیجا تھا یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ پیغام شاہی پروانہء موت اور پیغام خانہ تقریباً ایک ہی ساتھ ملا۔مناظرہ میں شکست کھانے والے حاسدوں نے انہیں زہر دے دیا موت وحیات کی کشمکش میں ہی تھے کہ گھر سے بلاوے کا پیغام بھی آ گیا انہوں نے یہ شعر پڑھا خطوط کو چاک کیا اور روح پرواز کر گئی ۔

از حیاتم رمقی بود کہ یادم کردی
بہر تشخیص نفس آئینہ شد نامہء تو

یہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے احسن الانساب میں انکا یہ شعر بھی درج ہے۔

ای کہ سر زلف سیاہست بلا
ہر دو لب تست بلا ہست بلا

مولانا محمد احسن چریا کوٹی اور مولوی کرامت اللہ چریا کوٹی کے متعلق سید سلیمان ندوی حیات شبلی کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں کہ:

''ان اطراف میں موجود ان تمام ہستیوں مثلاً مولانا محمد احسن چریا کوٹی مولوی کرامت اللہ چریا کوٹی کے بوریائے فقر مسند شاہی کی بلندی سے کسی طرح کم نہ تھے۔''

کواکب چریا کوٹ میں ایک روشن ترین نام مولانا علی عباسی کا بھی ہے علوم عقلیہ و نقلیہ، عربی و فارسی، تاریخ و ثقافت، سائنس و ریاضی، میں مکمل دستگاہ حاصل تھی قضیہ عباسی کے نام سے انہوں نے ایک رسالہ بھی شائع کیا جسمیں قضیہ شرطیہ کی مشہورہ تقسیم متصلہ و منفصلہ پر جدید تحقیق تھی منطق و فلسفہ کے اصول وضوابط پر بھی انہوں نے تحقیق کر کے موجودہ اصول قوانین پر اعتراضات بھی کئے سو سے زائد کتابیں تحریر کیں شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے عملی سائنس میں بھی مہارت تھی انہوں نے ایک ایسا چرخہ ایجاد کیا تھا جو بھاپ کے ذریعہ خود بخود حرکت کرتا تھا جسکے متعلق حبیب الرحمٰن جگدیش پوری نے تذکرہ علمائے اعظم گڑھ کے صفحہ ۵۲ پر لکھا ہے کہ:

''مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی بن غلام حسین چریا کوٹی ۱۲۵۱ھ میں ایک چرخ ایجاد کیا تھا جو بخار کے ذریعہ خود بخود حرکت کرتا تھا آپ اکثر فرماتے تھے کہ اگر زر کثیر مساعدت کرتا تو بزور دانش ایسا اعلیٰ ایجاد کرتا جس پر پانچ آدمی سواری کر سکتے اور ایک روز میں سو فرسخ راہ طئے کرتے۔''

مولوی نجم الدین عباسی اور مولوی مکرم عباسی بھی کثیر التصانیف محقق گزرے ہیں مکرم عباسی اعظم عباسی کے فرزند تھے مستند عالم معتبر تاریخ داں اور بلند پایہ ادیب تھے چریا کوٹ کے مدرسہ سے فراغت حاصل کی یہ مدرسہ اس زمانے میں تمام دانشگاہوں پر اپنے نساب ناظمین و

معلمین کی وجہ سے فوقیت رکھتا تھا مکرم عباسی کی چند کتابیں بہت ہی مشہور ہوئیں جنمیں حکمت بالغہ، تین جلدوں میں ،اسمع الاسمع، چراغ حکمت، رحل الغنا اور رسالہ شطرنج خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں مولوی نجم الدین عباسی مولوی احمد علی کے صاحبزادے تھے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی فارسی ادب کی طرف انکا خاص رجہان تھا سر سید سے قربت تھی علی گڑھ مشاورتی کمیٹی کے ممبر بھی تھے انکی بہت سی تصانیف نے شہرت ومقبولیت حاصل کی جسمیں ہفت اقسام حسینی ،صرف میں اوراعراب عربہ نحو میں سند کی حیثیت رکھتی ہیں کتاب عروض وقافیہ مثنوی فیض الٰہی مثنوی چہارضرب فسانہء سیلاب خمسہء محمدیہ کے علاوہ انہیں شاعری میں بھی استاد کی حیثیت حاصل تھی یادداشت چریا کوٹ بھی آپ ہی کی تحقیق ہے جسمیں انہوں نے چریا کوٹ کی تاریخ اوراسکے علماء وادباء کا ذکر کیا ہے انکی شاعری اندازہ اس غزل سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے

بروی نازنیں زلف سیہ انداختی رفتی
بمستانہ نگاہی کار مردم ساختی رفتی
بما خود ساختی جاناں و وحشی ساختی رفتی
چو اشك از چشم زارم از نظر انداختی رفتی
گریباں ھا درید از ھم چو گل ارباب محفل را
برنگ دامن شلوار زا افراختی رفتی
چہ آمد مہربانی را کجا شد عہد و پیمنت
کہ حق صحبت دیرینہ را نشناختی رفتی
ندانستی چہ خواہد بر اسیران تو رفت آخر
دمی با تو گرفتاران الفت باختی رفتی
تواں بر خاك کوئی افتاد گاں خود نظر کردند
اگر رخشجدائی بر سر شام تاختی رفتی
ہنوز م آرزوھا ہمچناں در خاطر و آوخ
تو چو گیسو شبستاں را پریشاں ساختی رفتی

نمی دانم چه دیدی از خراب خود که یکباره
دلش را وحشت آباد جدائی ساختی رفتی
توان دیگر بمقدم خاطری را جمع فرمودن
ز هم جمیعتش را گر پریشاں ساختی رفتی
نمی دانم چه دیدی از من بیمار خود که آخر
بچند دن دادند داد جفا پرداختی رفتی
سرت گردم تو بودی آشنائی باوفا زیں پس
چرا با نجم نرو بیوفائی باختی رفتی

ان اساتذۂ علم وفن نے یونان ہند یعنی چریا کوٹ میں بزم علم آراستہ کر رکھی تھی اسلامیات،قرآنیات و دینیات کے دوش بدوش معقولات فلسفہ ریاضی ہیئت جغرافیہ سائنس لغت اورفن تدریس کاایسامعیار قائم کیا کہ عہد عباسیہ کی یادتازہ ہوگئی ان علماؤں نے اپنے عہد کی علمی ادبی وثقافتی زندگی پر گہرے اور لائق تقلید اثرات چھوڑے ہیں۔جسکی روشنی میں نسلاً بعد نسلٍ علم وحکمت کا کارواں چلتا رہاان علماء کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ انمیں سے بیشتر نے درس و افادہ کی مسندیں بچھائیں دانشجویان علم وتشنگان ادب وفلاسفہ کواپنے دریائے علم خزانہءہنروسیلہء منطق کے ساتھ ساتھ تجربات ومشاہدات سے بھی فائدہ پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی جنکے درس سے بیشمار ائمہ علوم نے استفادہ کیااور رجال عصر بنکر نہ صرف اٹھے بلکہ جہان علم وفن پر چھا بھی گئے اس ابر کرم نے بلاتفریق مذہب وملت اور بلا امتیاز ملک وسلطنت ہر خطہ اور ہر علاقہ کو سیراب کیاعلم کی وادیاں لہرااٹھیں امن وامان وعدل وانصاف نہ صرف قائم ہوا بلکہ دائم بھی رہا۔

قاضی عطارسول عباسی،قاضی احمد ملیح چریاکوٹی،رکن الدین عباسی،قاضی عنایت اللہ عباسی، ملا جلال عباسی،مولانا شیخ منصور عباسی اور مولانا محمد ماہ عباسی نے بھی اپنی استعداد و صلاحیت سے ترویج علم،تشریح علم،تحفظ علم،اور ترسیل علم کا کردارادا کیا عطارسول نے فقہ اور فرائض میں پایہ اختصار حاصل کیا ملیح عباسی تفقہ فی دنیااور مسائل عصریہ کے راز کی اہلیت سے سرفراز تھے قاضی عنایت اللہ عقلی ونقلی علوم کے کمال ذکاوت وذہانت اصابت رائے فصاحت و

بلاغت میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے ان کی تفسیر کی فصاحت اور تحریر کی بلاغت کی بھی بہت شہرت تھی انکی دقت طبع، جدت فہم، کثرت فراست، اور دریافت حقائق سے ہم عصر علماء و حکماء واقف تھے یہ دنیاوی حیثیت سے بھی بلند مقام رکھتے تھے قاضی کے معزز عہدہ پر فائض تھے روز بروز انکا اقبال بڑھتا گیا انہوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ علم کی اشاعت بھی کی لیکن دیگر مصروفیات نے انہیں زیور طباعت سے آراستہ نہ ہونے دیا انکی تصانیف میں صرف ایک رسالہ تذکرۃ السیر کا ہی نام باقی ہے مولانا شیخ منصور عباسی ملا جلال چریاکوٹی کے بیٹے تھے فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے مشاہیر علماء و فضلاء میں شمار ہوتے تھے معتصم عباسی نے یادداشت چریاکوٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ 'جملہ علوم میں ماہر تھے امراء زمانہ آپ کی علمی صحبتوں کے طلبگار رہتے تھے عربی و فارسی شاعری میں مشہور تھے تمام عمر اعلیٰ مناصب پر فائض رہے۔ منصور عباسی کے فرزند ماہ عباسی علم ریاضی سیمیا اور فن حساب میں بے مثل تھے'۔ مولوی محمد محسن عباسی چریاکوٹی منشی گوہر عباسی کے پوتے اور شیخ گدا حسین عباسی کے صاحبزادے تھے وہ ۱۸۵۷ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے عربی، فارسی، اردو، ہندی، ترکی پر مکمل دسترس رکھتے تھے عمر کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس اور مطالعہ میں گزارا انکے مطالعہ کے شوق نے انکے گھر کو کتب خانہ میں تبدیل کر دیا تھا اس کتب خانہ کی دیکھ بھال کے لئے محمد منیر اور محمد نصیر مقرر ہوئے تھے چونکہ محسن عباسی کی ماں اکیلی تھیں اور انکا کوئی بھائی نہ تھا جسکی وجہ سے انہیں نانیہال کی ساری جائداد مل گئی تھی انہوں نے چریاکوٹ کی تمام ملکیت چھوٹے بھائی کو دیکر گورکھپور کا رخ کیا اور پھر کبھی بھی چریاکوٹ کی زمین و جائداد کے بارے میں ذکر تک نہ کیا اس طرح یہ پوری زمین چھوٹے بھائی کے حصہ میں چلی گئی انہوں نے گورکھپور جا کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا انکی شادی مولوی محمد کامل صاحب صدر الصدور قصبہ ولید پور اعظم گڑھ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اسطرح یہ فاروق چریاکوٹی کے ہم زلف بھی تھے۔ پھر انکی دوسری شادی عبدالعلیم عاصی غازی پور کے خانوادہ میں ہوئی اتفاق سے فاروق چریاکوٹی کی دوسری شادی بھی وہیں ہوئی تھی اسطرح یہ فاروق چریاکوٹی پھر ہم زلف ہوئے۔ مولوی محمد محسن عباسی چریاکوٹی بہت ہی کامیاب وکیل اور پایہ کے بزرگ تھے۔ کچہری کے اوقات کے علاوہ بقیہ تمام وقت تصنیف و تالیف اور عبادت میں بسر کرتے تھے

انکی تصانیف میں ترتیب القرآن، عربی و ہندی لغت، مجموعہ کلام اقوال غم، ملتی ہیں یہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ابوالفضل احسان اللہ عباسی چریا کوٹی منشی عزیز الدین کے صاحبزادے تھے بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے ابتدائی تعلیم اپنے چچا عنایت رسول اور فاروق چریا کوٹی سے پائی انتہائی زہین وفطین تھے علی گڑھ کے پہلے بیچ کے طالبعلموں میں شامل تھے اسکے بعد انہوں نے گورکھپور سے وکالت پاس کی اور وہیں وکالت شروع کی گورکھپور بار ایسوسٹیشن کے بانی بھی یہی ہیں اس علاقہ میں سرسید کی تحریک کو انہوں نے ہی تقویت پہنچائی تھی انکی شادی شیخ گدا حسین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی تخلیقی زندگی کا آغاز بچپن ہی سے ہو گیا تھا غازیپور اور بنارس قیام کے دوران ریاضی کے موضوع پر متعدد کتابچہ لکھے چوتھی جماعت میں تھے تو انہوں نے Lamb's Tales کا ترجمہ فسانہء دلپزیر کے نام سے کیا تھا جو نول کشور پریس سے شائع ہوا اور یہ تخلیقی کارنامہ زندگی بھر جاری وساری رہا انکی تصانیف کی بدرالدین طیب نے بہت تعریف کی تھی تاریخ اسلام، تاریخ حکماء یونان، زاہدہ، المجاہد، محسنۃ الارامل، نشترسخن، فکر دنیا، زبان اردو، شرح ایکٹ ہائے قبضہ آراضی و مالگزاری، سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانیؒ انکی مشہور تصانیف ہیں جسمیں الاسلام، فلسفہ کے موضوع پر ہے زاہدہ ایک ناول ہے جسکے بارے میں اخبارات صدائے ہند اور مشیر ہند نے لکھا تھا کہ زاہدہ کے مصنف نذیر احمد سے بازی لے گئے، المجاہد ایک ناول ہے جو عورتوں کے حقوق پر ہے، محسنۃ الارامل بیوہ کی شادی کے متعلق ہے، نشترسخن انکی اردو و فارسی شاعری ہے، فکر دنیا صنعت وحرفت کے موضوع پر ہے اور شرح ایکٹ ہائے قبضہ آراضی و مال گزاری قانون کی ایک کتاب ہے اس موضوع پر انہوں نے متعدد کتابیں بزبان انگریزی بھی تصنیف کی تھیں انہوں نے گورکھپور سے ایک اخبار الوقت نام سے بھی نکالا تھا یہ اخبار جدت پسندی اور علی گڑھ تحریک کا ترجمان تھا اس علاقہ میں اس اخبار نے ہی لوگوں کو علی گڑھ تحریک سے روشناس کروایا۔انہوں نے ۱۹۲۸ء میں وفات پائی۔اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ستار عباسی اور غفار عباسی چریا کوٹی کی شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں یہ لوگ بھی علم وفضل میں یکتا اور قانون وفلسفہ میں بے مثال تھے بقول زبیدہ حبیب عباسی ایک مرتبہ ستار عباسی نے اپنے بڑے بھائی غفار عباسی سے زمینوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم اسکی تقسیم اس طرح کرلیں گے تو غفار

عباسی اس پر سخت برہم ہوئے انہوں نے کہا کہ تمہارے ذہن میں یہ بات آئی کیسے کہ یہ زمینیں منقسم ہونگیں انہوں نے تمام زمین و جائداد چھوٹے بھائی کو دیکر گورکھپور کا رخ کیا وہاں جا کر انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ بہت ہی کامیاب وکیل تھے آپکا شمار سادھو وکیلوں میں ہوتا تھا۔ آپکی ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ یہ اپنے موکلوں کو مسجد میں لیجا کر حلف دلواتے تھے کہ تم ظالم یا جابر نہیں ہو اسکے بعد ہی کیس لیتے تھے۔ جج غفار عباسی کا بہت احترام کیا کرتے تھے انکی ایمانداری سادگی صلاحیت اور شرافت کے تذکرے آج بھی لوگوں کی زبانوں پر باقی ہیں۔

قاضی علی اکبر چریا کوٹی کی شخصیت ہندوستان کی علمی ادبی مذہبی تعلیمی اور تحریکی حیثیت سے انتہائی اہم تھی آپ محقق، مورخ، مبصر، اور مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ قانون داں بھی تھے غازی پور ہی میں نہیں بلکہ پورے مشرقی یوپی میں آپکی شہرت ومقبولیت بحیثیت وکیل کے بھی تھی مولانا عنایت رسول عباسی اور مولانا فاروق چریا کوٹی آپ کے صاحبزادے تھےان دونون لائق و فائق اولادوں نے بیک وقت ہندوستان کی تمام تحریکوں کو تقویت بخشی مولانا عنایت رسول نے سر سید کو جدت اور مستقبل کا نسخہ عطا کیا تو مولانا فاروق چریا کوٹی نے شبلی کو شریعت وحمیت کا درس دیا اسطرح ہندوستان کے ان دونوں علمی میناروں نے خاک وطن میں پھیلی ہوئی گمراہی، تاریکی، اور بے راہ روی کو نہ صرف راہ راست دکھایا بلکہ منزل مقصود تک پہنچایا۔ مولانا عنایت رسول ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے علوم معقول وریاضی وحساب و ہیئت مولوی احمد علی چریا کوٹی سے اور علوم منقول ملا فضل رسول بدایونی سے حدیث مولانا حیدر علی رامپوری شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے ٹونک جا کر پڑھی ٹونک سے واپس آکر کلکتہ گئے اور وہاں یہودیوں سے عبرانی زبان سیکھی تورات، انجیل، زبور اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر مکمل عبور حاصل کیا اور وطن واپس آ گئے سر سید اسی وقت بنارس اور غازی پور میں منصف کے عہدہ پر مامور تھے جب انہوں نے مولانا کے علم کا شہرہ سنا تو مولانا سے ملاقات کی مولانا نے زبور تورات انجیل اور دیگر صحیفوں کے بارے میں سر سید کو روشناس کرایا۔ سر سید انکے علم کے قائل ہو گئے تورات زبور اور انجیل کے مباحث کو حل کرنے میں نہ صرف ان سے مدد لی بلکہ مختلف مسائل پر متعدد رسائل بھی تحریر کروائے تا کہ اہل کتاب کی حقیقت اور ان قوموں کی قربت کو ثابت کیا جا سکے جو صاحب کتاب ہیں۔

بقول سید سلیمان ندوی''مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی تحقیقات مذہبی میں گویا سرسید کے استاد تھے'' سرسید بار ہا مولانا چریا کوٹی سے علمی تحریکی اور مذہبی اصلاح لیتے رہے سرسید کی روشنی کا منبع مولانا چریا کوٹی ہی تھے جس کے متعلق اقبال سہیل الاصلاح مارچ ۱۹۳۸ء کے صفحہ ۱۵۵ پر لکھتے ہیں کہ:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں جو حدت ترازیاں کی ہیں وہ خود انکے دل و دماغ کی پیداوار نہ تھیں بلکہ انکا بڑا حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے خرمن خیال سے مستعار تھا۔''

سرسید کی تعلیمی تحریک کا آغاز بھی چریا کوٹ سے ہوا جہاں مولانا عنایت رسول چریا کوٹی نے علمی، تعلیمی، فکری، اور مذہبی روح پھونک کر ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی سرسید متعدد خطوط بنام فاروق چریا کوٹی اور عنایت رسول چریا کوٹی اس بات کے شاہد ہیں کہ سرسید کا اسی سرزمین گہرا رشتہ تھا اور وہ ان علماء دین و دنیا کے صرف معترف ہی نہیں معتقد بھی تھے۔ سرسید عنایت رسول چریا کوٹی کو ایک خط لکھتے ہیں کہ:

''بارش شروع ہوگئی ہے اس موسم میں آپ کا ارادہ یہاں تشریف لانے کا ہے یا نہیں اگر ہو تو مجھ کو اطلاع فرمادیں تاکہ میں ایک ملازم آپ کے پاس بھیج دوں تاکہ وہ آپکو ساتھ لیکر یہاں آجاوے۔''

ایک اور خط میں سرسید عنایت رسول چریا کوٹی کو لکھتے ہیں کہ:

''آپ تو علی گڑھ تشریف نہیں لاتے ناچار مجھ کو چڑیا کوٹ آنا پڑے گا اور پوٹ کی پوٹ آپ کی تصانیف کی جو آپ نے باندھ کر رکھ چھوڑی ہے سب اٹھالاؤں گا۔''

مولانا عنایت رسول نے کلکتہ میں بنگالیوں کا انگریزی زبان سیکھ کر سرکاری ملازمت کے حصول میں سرگرم ہوتا بچشم خود دیکھا تھا واپسی پر بنارس میں سرسید سے ملاقات ہونے پر اسکا ذکر کیا کہ مسلمانوں کو انگریزی زبان پڑھنی چاہئے کیونکہ اگر مسلمان انگریزی زبان سے ناآشنا رہے تو مستقبل میں صرف موذن میلاد خواں اور گورکن ہی ہوسکتا ہے۔ یہیں سے سرسید کے مزاج میں تبدیلی آئی اور انہوں نے غازی پور میں ایک انگریزی مدرسہ بھی کھولا۔ جبکہ مولف

حیات جاوید کے قول کے مطابق سرسید کا ابتداء میں مسلمانوں کو ورنا کیولر زبان میں جدید تعلیم دلانے کا خیال تھا۔ اس مشورہ کے بعد انہوں نے انگریزی زبان کی حمایت شروع کر دی۔ جسکی شہادت عنایت رسول چریا کوٹی کا یہ خط دے رہا ہے جو سرسید کے نام ہے:

بسم اللہ

جناب مولوی صاحب مخدوم و معظم عصر و مطاع و مکرم وامت برکاتکم

بعد سلام مسنون و اشتیاق ملاقات کے مدعائے ضروری یوں گزارش ہے کہ ۲۹ ماہ اگست کو عنایت نامہ آپکا پہنچا حال معلوم ہوا درخواست چنداہ را با آں عالی قدر سے میری دانست میں مناسب وصواب لہٰذا سکریٹری کو اجز تو اسطے درخواست چندہ کے را با آں عالی شان سے نہایت ضرور پس جس قدر مضمون دفعہ ۱۶ منافی رئیس مقصود کے ہوا اوس کی ترمیم لازم فقط جب سے یہاں آیا ہوں بطور مناسب اس مقصد میں کوشش کر رہا ہوں کوئی منکر یا معترض نہیں بلکہ بعد دریافت منافع دینی و دنیاوی جو اوس پر مرتب ہیں حالت وجد ہوتی ہے اعظم گڑھ میں بھی لوگ بہت آمادہ و مستعد ہیں پہلے تو لوگوں کی رائے کچھ کم دینے کی تھی لیکن بعد دیکھنے فہرست چندہ جود رخ اختیار ہوئی ہے صدر الصدور ضلع و تحصیلدار و منشی محمد اکرام وغیرہ سو سو روپیہ دینے کا قصد رکھتے ہیں۔ دیدہ باید کہ چہ از پردہ برون می آید۔

من اللہ التوفیق والسلام

۲۹ ماہ اگست ۱۸۷۳ء

مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے ایک خط کے چند الفاظ پیش خدمت ہیں:

مخدوم و معظم عنایت فرمائے نیازمندان وامت برکاتکم

بعد سلام مسنون و اشتیاق ملاقات کے مدعائے ضروری یہ ہے کہ عنایت نامہ معہ تہذیب الاخلاق کے پہنچا حال معلوم ہوا میرے نزدیک خرید کرنا دیہات زمینداری مناسب ہے بلاشبہ دفع بیس قوائد کمیٹی ترمیم ہوا اور نسبت تبدیل نام کے اگرچہ خفیف ہے مضائقہ نہیں۔"

مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کو قرآن، زبور توریت انجیل کے ساتھ ساتھ علم ہندسہ اور ہیئت میں مہارت کاملہ حاصل تھی معقولات عضدیہ کے نام سے ایک کتاب اقلیدس پر بھی

تحریر کی یہ کتاب بہت ہی معتبر اور ضخیم ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے انکی بہت سی تصانیف ہنوز غیر مطبوعہ ہیں جسمیں ایک کتاب فن موسیقی پر سات جلدوں میں ہے جسکا نام الملاہی ہے کتاب الحساب اور جبر مقالہ بھی انکی غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جسمیں انہوں نے کتب متوادلہ کے برخلاف آٹھ مقالات کا اضافہ کر کے چودہ مقالات سے بحث کی ہے اس طرح انہوں نے آسمانی صحیفوں اور زمینی کتابوں کے تمام علوم وفنون میں جو رموز ونکات تھے انہیں آشکارہ کیا ان کا شمار اس زمانے کے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا کوئی انکے ہم پایہ یا ہم پلہ نہ تھا موصوف کا انتقال چریا کوٹ میں ۱۳۲۰ھ میں ہوا اور یہیں سپرد خاک بھی ہوئے۔

مولانا فاروق چریا کوٹی ۱۸۳۸ء میں چریا کوٹ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم والدین اور بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی سے پائی۔ ہیئت کا فن مولانا رحمت اللہ سے، ہدایہ اصول فقہ مفتی محمد یوسف سے، اور خاشیہ زاہدیہ بر شرح ملا جلال مولوی ابوالحسن منطقی سے، اور چند دیگر علوم ملا نعمت اللہ صاحب سے پڑھے علوم معقول ومنقول ریاضی وادبیات تمام علوم پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا موسیقی کے فن میں بھی انہیں دسترس حاصل تھی وہ تاعمر علم اور تدریس علم سے جڑے رہے علم حاصل کرتے اور اسے سینہ بہ سینہ منتقل کرتے انکا تدریس کا تریقہ منفرد ہی نہیں بلکہ ممتاز تھا وہ درس دیتے ہوئے تدریس میں غرق نظر آتے تھے انکی شخصیت صلاحیت اور سلسلہء تدریس کے متعلق سید سلیمان ندوی حیات شبلی کے صفحہ ۳۷ پر رقمطراز ہیں:

''انکے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علحدہ ہو کر نفس مسلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اس کا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا تھا مختلف مدرسوں میں مدرس رہے سب سے پہلے وہ چشمہء رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ میں آئے کانپور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی سہرام پور کے مدرسہ خانقاہ میں جو اب بھی قائم ہے کچھ دنوں رہے الہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا ۱۳۱۷ھ میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنو میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اسمیں بھی مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے اسکے بعد ۱۹۰۴ء میں جب مولانا شبلی نعمانی مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے موصوف نے ترک ملازمت کر کے بلیا میں وکالت شروع کی اور بعض شائق انگریز حکام کو عربی پڑھائی آخر میں مولانا شبلی مرحوم نے پھر انکو

دارالعلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلایا چندروز رہ کر غازی پور گئے تھے کہ اسباب وسامان یہاں لے آئیں کہ وہیں ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی۔‘‘

مولانا فاروق چریا کوٹی کی دو شادی ہوئی تھیں انکی پہلی بیوی مولانا محمد کامل ولید پوری کی صاحب زادی تھیں جنسے دو بیٹے تھے پہلی اولا د شمس العلماء محمد امین صاحب تھے یہ صاحب دیوان شاعر تھے اور کیفی چریا کوٹی تخلص کرتے تھے ان کا شعری مجموعہ ہندوستان کے بیشتر کتبخانوں میں آج بھی محفوظ ہے۔

مولانا فاروق چریا کوٹی کی دوسری شادی غازی پور میں ہوئی تھی جن سے کئی اولادیں ہوئیں جنمیں محمد یٰسین صاحب نے ہی صرف عربی تعلیم پائی اور اجداد کی روش اختیار کی باقی اولادیں عربی اور اعلیٰ دونوں تعلیم میں انکے برابر نہ پہنچ سکے فاروق چریا کوٹی کے علم کا سفینہ انکے اولادوں کے سینہ میں منتقل ہوتا رہا اسطرح علمی وادبی کارواں کا یہ سلسلہ سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ چلتا رہا فاروق چریا کوٹی جہاں ایک طرف عربی فارسی اور اردو نثر نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے وہیں شعری ذوق بھی رکھتے تھے انکی شاعری کے بھی مستند ثبوت ملتے ہیں نثری مہارت اور شعری ذوق کے متعلق سید سلیمان ندوی حیات شبلی کے صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں کہ:

’’مولانا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم ونثر میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا اور اس زمانہ کے کمالات کے مطابق صنائع وبدائع کا خاص شوق رکھتے تھے مثلاً غیر منقوط قصائد اور خطبے مولانا کی تصنیفات میں سے عربی و فارسی نظم ونثر کے بعض رسائل یادگار ہیں مثلاً منظومہ نحویہ، فارسی خالق باری، کشف الاقناع عن وجوہ الامتاع، اور تطلیقات ثلاثہ کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود انکے ہاتھ کا لکھا میرے پاس ہے اردو شاعری بھی کرتے تھے چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڑھ کے ۱۸۹۳ء کے ہنگامہ ءگاؤ کشی کا واقعہ نظم ہے دوسرا مسدس عوالی ہے جو مسدس حالی کے جواب میں ہے۔‘‘

مولانا فاروق چریا کوٹی کی علمی تشنگی اور خوب سے خوبتر کی تلاش نے انہیں کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہ دیا وہ سعدی شیرازی کی طرح کتابوں سے زیادہ مشاہدات تجربات اور حالات سے سیکھتے اور سکھاتے تھے مزاج میں سخت وارستگی بے فکری اور بے تکلفی تھی جسکی وجہ سے

نہ وہ کسی بڑے عہدہ پر رہے اور نہ ہی کوئی مستقل تصنیف تحریر کی مختلف موضوعات پر متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر کئے لیکن افسوس کی وہ بھی زیور طباعت واشاعت سے محروم رہے مولانا کی تصانیف سے دسترخوان علم وادب پر جو کمی رہ گئی تھی اسے انکے شاگرد عزیز علامہ شبلی نے پوری کرنے کی کامیاب کوشش کی شبلی مولانا فاروق چریا کوٹی کی تدریس شاعری اور شخصیت کے متعلق اکتوبر ۱۹۰۹ء میں رسالہ الندوہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاھد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع صدرا، شمس بزندا نہی سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات انہی کی افادات ہیں، فارسی کا مزاق بھی انہی کا فیض ہے اکثر اساتزہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے چونکہ ان کی کوئی علمی تصنیف شائع نہیں ہوئی اس لئے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں مشتے نمونہ از قرار۔

رسیدی در بودی دین و دل در جنبش چشمی
به یك گردش چو جام باده كارم ساختی رفتی
به گلشن آمدی،غنچه را در خوں جگر كردی
نسیم آسا سمند ناز بر گل تاختی رفتی
نه دارد دل دگر تاپ طپیدن
نگاه خویش را رحم آشنا كن
نه دارد چشم من تاب جمالت
بیا جوں مرد مك در دیده جا كن
زمانه گرد خط حكم به پیچید ستر
در رشتهء شب درد زش به تن شود زنار

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے استاد فاروق چریا کوٹی کے متعلق لکھا ہے کہ انکی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے جبکہ معتصم آزاد عباسی نے ۱۹۷۳ء اپریل و جولائی کے اسلام وعصر جدید کے صفحہ ۸۷ پر انکی ان تصانیف کا ذکر کیا ہے جو اسطرح ہیں:

۱۔کشف الاقناع عن وجوہ الامتناع ۲۔تطلیقات ۳۔منظوم نحویہ ۴۔فارسی خالق باری ۵۔مسدس عوالی ۶۔مسدس فاروقی۔

اسکے علاوہ ایک غزل کا بھی ذکر کیا ہے جسکے چند شعر پیش خدمت ہیں:

نہ آں پیالہ نہ آں مئے نہ آن چمن باقیست
مگر ز بیخودیم قصہء کہن باقیست
چنان گداختہ ام من کہ غیر یاد تو نیست
ز من ہر آنچہ در آغوش پیرہن باقیست
بہرر چہ داد خداوند شادم و لیکن
درون دل ہوس طایف و یمن باقیست
خجل زمنت دشنام تو شدی ای جان
کہ بر زبان تو زین حیلہ یاد من باقیست

ان تصانیف اور غزلیات کے علاوہ مولانا فاروق چریا کوٹی کی شعری کائنات میں ایک چھوٹی بحر علم نحو و بلاغت سے آراستہ اور غم والم میں ڈوبی ہوئی مثنوی بھی ہے جوانہوں نے اپنے شاگرد عزیز شبلی نعمانی کے پیر کے حادثہ پر لکھی تھی اس مثنوی میں استاد اور شاگرد کی محبت و عقیدت جلوہ گر ہے یہ مثنوی ۱۹۰۷ء میں الندوہ میں شائع ہوئی تھی اس مثنوی میں تمام شعری خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں مثنوی پیش خدمت ہے ۔

ای دل افروز شمع علم و ہنر
نور چشم جہان و جان پدر
پدر انتساب علم و کمال
از نسب نامہائے عز و جلال
بر تو از آسمان گزند مباد
جور دہر ستم پسند مباد
چشم زلف زمانہ در راز تو

بـــا دہـــر بـــر نـــم پـــر ز نـور از تـو
مـــن شـنـیـدم کـــه انـدریـن پر کـار
کشتـــی از دســـت روز گـار فگـار
آفـــت نـــا گـہـــان رسیـــد بـــه پائـــے
پـــائـــے آن رہـــرو جـہـــان پیـمـــائـــے
بـــه خـدامے گـزد ست صبر و بلا
کـــــه نیـــارم شـــنید نیـــش اصلا
بـــوده ام در قـــصـــب ز روزی چـند
مـن در ایـنـجـا بـــه حـاجتـے پـابند
کـــه مـــن گـفـت رہرو عـــاجـل
کـــامے ز اخبـــار ایـں و آن غـــافـل
تیـری از چـند خـود پسـند رسید
شبـلـی ات رابـــه پا گـزیـد رسید
ایـن خبـر چـون بگـوش من بـرسید
تـــاب بشـنـقتنـــش ز مـن بـه رمید
آوخ آن پـــــائـــے راه پیـمـــــائـــے
بســـوئـــے طبیبـــه گـــام فرسـائـــے
هـــم ره مـــصـــر و شـــام و روم بـریـد
حیف از ســـاق خـــود جـدا گـردیـد
دل بـجـوش آمـده بـــه نـوحـه گـری
یـــاد چـــون آیـــد از تـــو ره سپـری
ره نـــوردی بـــرای کـســـب و ہنـــر
نـــــه پـئـــے اوّخـــار بـــدرئـــه زر

گرچه پائے تو دید بیش گزند
صبر تو نیز پایه داشت بکند
گرچه خون از درد روان بزمین
لیك چینت نگشته گرد جبیں
گر چه پایت ز ساق گشته جدا
ایك صبرت چو کوه پا بر جاه
ای خداوند واہب اعمار
دائمش بر ره سعادت دار

مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی علم وادب کی بساط پر ماہ تمام بن کر چمکے اور دنیا کو اپنے علمی فیوض و برکات سے بھر دیا سرسید فاروق چریا کوٹی کے علم وفضل جدت فہم اور کثرت فراست کو مدنظر رکھتے ہوئے تعظیم کے ساتھ انکی شخصیت کا اعتراف کرتے ہیں اوران کے وجود پر فخر ہی نہیں بلکہ غرور کرتے ہوئے انہیں ایک خط اسطرح لکھتے ہیں:

جناب مولانا مخدوم ومکرم من مولانا فاروق صاحب آپ کا عنایت نامہ معہ خطبہ عربی پہنچا ہمارے اعزاز کا باعث ہوا درحقیقت آپ جیسے بزرگ فرد زمانہ کا اس محبت سے پیش آنا ہمارے فخر کا باعث ہے میں تو اس لائق نہیں ہوں کہ اس خطبہ کی داد دوں مگر اس قدر عرض ہے کہ ہم کو آپکی ذات پر نہایت فخر ہے کہ ابھی ہماری قوم میں اسلاف کے نمونہ موجود ہیں اور ہم خوش ہیں بلکہ مغرور ہیں کہ جسطرح اپنے گزشتہ بزرگوں پر فخر کرتے ہیں اسی طرح آپ کی ذات کے سبب موجودہ بزرگوں پر بھی فخر کرتے ہیں خدا آپ کو خوش وخرم رکھے سردی ختم ہوئی آپ ضرور تشریف لائیے اور ہمارے مخدوم مولانا عنایت رسول کو ضرور ساتھ لائیے۔

سرسید اور شبلی کے ان الفاظ سے مولانا فاروق چریا کوٹی اور عنایت رسول چریا کوٹی کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہی وہ علمی سائے تھے جنہوں نے قوم کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھا اور محفوظ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ماضی کی حمیت اور مستقبل کی امامت پر یکساں نظر رکھی فاروق چریا کوٹی کے بعدان کے صاحبزادے کیفی چریا کوٹی امین چریا کوٹی اور

یٰسین عباسی چریا کوٹی نے علمی وادبی کاروان کے امامت کی ذمہ داری سنبھالی۔

مولوی محمد امین عباسی چریا کوٹی مولانا فاروق چریا کوٹی کے صاحبزادے تھے ۱۸۸۰ء میں اپنے آبائی وطن میں پیدا ہوئے عنایت رسول اور فاروق چریا کوٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی عربی، فارسی، عبرانی، ترکی، سنسکرت، ہندی، اور انگریزی زبانوں پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا بریلی باندہ علی گڑھ کلکتہ چٹگاؤں اور ڈھاکہ کے گورمنٹ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے ڈھاکہ کالج اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی مقرر ہوئے بنگال حکومت نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا تھا ڈھاکہ یونیورسٹی سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد گورکھپور میں سکونت اختیار کی تصنیف وتالیف میں جواہر خسروی اردو رسم الخط اور اسکی اہمیت، فن موسیقی، اور تصوف پر ایک طویل مضمون تحریر کیا جو سجان گورکھپور سے قسطوار شائع ہوا ۱۹۷۰ء میں آپکا انتقال ہوا۔ محمد مبین چریا کوٹی محمد امین چریا کوٹی کے چھوٹے بھائی فاروق چریا کوٹی کے فرزند اور عنایت رسول چریا کوٹی کے بھتیجے تھے مبین نام رکھا اور کیفی تخلص کرتے تھے اس لئے کیفی چریا کوٹی کے نام سے ہی مشہور معروف ہوئے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، فلسفہ، منطق، فقہ، حدیث، اور ریاضی کی تعلیم فاروق چریا کوٹی سے حاصل کی ترکی، عبرانی، اور سریانی عنایت رسول صاحب نے پڑھائی جرمن، فرنچ، اور لاطینی دیگر اساتذہ فن سے سیکھی ان تمام زبانوں میں دسترس حاصل کرنے کے بعد انہوں نے صحافت کا میدان اختیار کیا ۱۹۱۴ء میں چریا کوٹ سے العلم جاری کیا ۱۹۱۸ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے ایڈیٹر ہوئے گورکھپور سے سجان جاری کیا روزنامہ کلکتہ اور روزنامہ انقلاب زمانہ کے مدیری کے فرائض بھی انجام دئے ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے وابستہ ہوئے اور جواہر سخن سات جلدوں میں مرتب کیا پھر ۱۹۴۳ء علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں انکا تقرر ہو گیا انکی چند تصانیف حسب ذیل ہیں فلسفہ سیاسیات اسلام، فلسفہ عمر، ترجمہ قانون مسعودی، انکی تصانیف کو شہرت و مقبولیت نہیں ہو سکی انکی شاعری نے ہی انہیں زندہ رکھا ہے۔ میکدہ کیفی انکے مجموعہ کلام کا نام ہے جسکو انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا ۱۹۵۶ء میں انکا انتقال ہوا۔

محمد یٰسین چریا کوٹی بھی مولانا فاروق چریا کوٹی کے بیٹے تھے لیکن انکا ننیہال ولید پور نہیں تھا بلکہ غازی پور تھا یہ فاروق صاحب کی دوسری بیوی سے تھے عربی فارسی اور اردو پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا منطق فلسفہ اور فلسفیانہ تحقیق کی طرف طبیعت مائل تھی خلافت راشدہ پر انکی

ایک کتاب گورکھپور سے شائع ہوئی وہ سبحان کے مدیر بھی تھے اسمیں آپکے مسلسل مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ یٰسین چریا کوٹی کے ہمراہ اس خانوادہ میں علم وفضل کی شمع روشن کرنے والوں میں ابوالفضل احسان اللہ عباسی، اعظم عباسی، مولوی محسن عباسی، مکرم عباسی، نصیر عباسی، خلیل عباسی، جلیل عباسی، اسد عباسی، منیر عباسی، معصوم عباسی، ڈاکٹر معتصم آزاد عباسی، ڈاکٹر متیع اللہ عباسی، اورزبیدہ عباسی چریا کوٹی کا نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں جو میر کارواں رہے ہیں اور ہیں۔ زبیدہ حبیب اس کل جگ میں بھی علم کی شمع روشن کئے ہوئے آبائی خدمات کو بخوبی انجام دے رہی ہیں یہ چریا کوٹ میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم بستی میں ہوئی اوراعلیٰ تعلیم کے لئے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک وہیں معلم بھی رہیں اسکے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شعبہ تعلیم وتدریس میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں موصوفہ میں تمام خاندانی اوصاف اور علمی روایات بدرجہ اتم موجود ہے عظمت آدم، خدمت آدمیت اور درس انسانیت آپ کا نصاب زندگی ہے جس پر خود بھی کارفرماں ہیں اوراسی کا درس بھی دے رہی ہیں زبیدہ عباسی شعری ذوق بھی رکھتی ہیں انکی متعدد نظمیں ملک کے مختلف معیاری رسائل وجرائد میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں موصوفہ جب سے ٹونک (راجستھان) کے نواب جاوید حبیب سے منسوب ہوئی ہیں زبیدہ عباسی سے زبیدہ حبیب ہوگئی ہیں انکی شاعری ایک اخلاقی اصلاحی نسائی اور تعلیمی تحریک ہے جسمیں زندگی کے نشیب وفراز، وقت کی اہمیت، تعلیم کا مقصد، یتیم کے آنسو، بیوا کی فریاد، مظلوم کے گریہ اورنسائی کردار پر کثرت سے شعر ملتے ہیں سوز، کسک، تڑپ، دید، تشنگی اور خواہشات کا لفظ انکی شاعری میں بار بار دستک دیتا ہے بندش، تشبیہ اور استعارہ کا بھی بہترین استعمال ہے انکے شعر نسائی درد کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں وہ چونکہ جدید تعلیم یافتہ خاتون ہیں اسلئے انکے خیالات بھی روشن ہی نہیں بلکہ روشن تر ہیں انہیں عورت ہونے پر شرم نہیں فخر ہے وہ قوم کی عورتوں کے صبر وسکون اور پاکیزگی پر فخر کرتی ہیں وہ موجودہ طرز زندگی اور فرنگی سماج پر طنز ضرور کرتی ہیں لیکن نوحہ کناں نہیں ہیں اور نہ ہی راہ فرار کے لئے تیار کیونکہ راہ فرار کو وہ خودکشی کے مترادف سمجھتی ہیں مغربی تعلیم اور کلچر سے واقفیت کے باوجود انکی شاعری کے سر پر مشرقیت کا آنچل ہی دکھائی دیتا ہے وہ آزادی کی خواہاں ضرور ہیں لیکن عریانیت کی نہیں

آنچل انکی ڈھال اور تعلیم تلوار ہے جسکے سائے میں وہ زندگی کے ہر محاذ پر برسر پیکار ہیں نسائی درد انکی شاعری کا مرکز ومحور ہے وہ یہ کہتی ہوئی نظر آرہی ہیں کہ:

یہ جبر جبر کب تلک، یہ صبر صبر کب تلک
اسی زمیں کے فرد ہیں ہمیں بھی صبح چاہئے
یہ شام شام اداسیاں ، یہ رات رات کہانیاں
یہ جھوٹھی دلنوازیاں، یہ بیوی بہن بان
یہ جبر جبر کب تلک، یہ صبر صبر کب تلک
کبھی تو ہیں یہ دیویاں، کبھی تو ہیں پریتیاں
گھر میں ہیں یہ داسیاں، اوڑھ کے اداسیاں
یہ فرق فرق کب تلک، یہ درد درد کب تلک
اصول خام کب تلک، یہ تلخ جام کب تلک
اسی زمیں کے فرد ہیں ، ہمیں بھی صبح چاہئے

چریاکوٹ کی مردم خیزی معارف پروری اور دانشوری کے متعلق اقبال سہیل ،اسد عباسی کے مجموعہ کلام شمیم عشرت کے دیباچہ کے صفحہ ۷،۸ پر رقمطراز ہیں کہ:

''چریاکوٹ اعظم گڑھ کے مشرقی حصہ میں ایک چھوٹا سا قریہ ہے مگر سچ پوچھئے تو سرکار جونپور شمالی سے اسکو وہی نسبت حاصل ہے جو دماغ کو جسم انسانی کے دوسرے اعضاء سے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سرکار جونپور کو علم ودانش کا نظر فریب چمنستان قرار دیا جائے تو اسکا سب سے نزہت آفریں اور سرمایہ ناز چمن یہی خطہ قرار پائیگا ہندوستان کا کون سا گوشہ ہے جو فضل و کمال کے اس سرچشمہ سے سیراب نہیں ہوا حضرت مولانا احمد علی، حضرت مولانا علی عباسی، فخر الادباء والمہندسین حضرت مولانا عنایت رسول اور استاذ المتاخرین مولانا فاروق جیسے ائمہ فن جس خاک سے اٹھے ہوں اسکا مجد وشرف کسی دلیل کا محتاج نہیں۔''

ثنائے انجم و تسبیح کہکشاں کے لئے
یہ وہ زمیں ہے بنی تھی جو آسماں کے لئے

پروفیسر ڈاکٹر شہباز احمد۔ نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد

قوت تعلیم اور طب یونانی

علم وطب کی اہمیت وضرورت ہر صاحب علم پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جسے ہماری صحت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ یہ ایسا قدیم ترین طریقہ علاج ہے جسے دوسرے مروج طبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پسندیدگی اور مقبولیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس لئے اس علم کی ضرورت تو اسی وقت پڑ گئی تھی، جب انسان وحشت کی زندگی گزار رہا تھا اور جنگلی پودوں اور پھلوں سے اپنی تکلیف دور کرتا تھا۔

یونانی طریقہ علاج میں جو اصول علاج بیان کیا گیا ہے، اس میں طبیعت کو ہی اہمیت دی گئی۔ موجودہ دور میں رائج جدید علاج میں کثرت سے جدید دواؤں کا استعمال نہ کی صرف مریض کو دوسرے امراض میں مبتلا کرتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مریض کی قوت مدافعت میں خرابی اور ادویہ کے خلاف جراثیم میں RESTSTANT POWER کا پیدا ہو جاتا ہے، جس سے بدن کے اندر دوسرے عوارضات لاحق ہو کر مریض ہمیشہ کے لئے ناخوشگوار زندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً CHLORAMSHENICOL کے استعمال APLASTIC ANAEMIA کا پیدا ہو جانا مریض کو ہلاک کر دیتا ہے۔ دوران حمل میں دواؤں کے استعمال سے نومولود میں پیدائشی خرابی CONGENITAL SEFORMITIES اور دوسرے IATROGENIC DISTASES بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے برخلاف قدیم نظریہ علاج میں مریض کو نہ صرف صحت ملتی ہے بلکہ دوسرے مضر پہلو سے محفوظ رکھتا ہے۔

جسم آدمی کا وہ شی ہے جو ترتیب دیا گیا ہے مادہ اور صورت سے اور مادہ وہ چیز ہے، جو جمع کیا گیا ہے چار نا موافق مادے سے، جو چاروں ایک دوسرے کے مخالف ہیں، ان کے اندر ایک صورت جو ایسی قوت ہے کہ ہمیشہ کوشش کرنے والی ہے کہ مادہ ایک ساتھ رہے۔فعل صورت کا ایک کام ہے، اس کے ساتھ جید اور کوشش سے پورا ہوتا۔جسم کو تباہ کرنے والے عوامل پیدا ہونے کی صورت میں طبیعت کو ایسی شئ چاہئے کہ صورت طبیعت کی مدد کرے۔

طبیعت مدبر بدن طب یونانی میں بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

ارکان 1. ALEMENTS

مزاج 2. TEMPERAMENT

اخلاط 3. HUMOURS

اعضا 4. ORFANS

ارواح 5. PNEUMO

قوی 6. FORCES

افعال 7. FUNCTIONS

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ارکان ایک مادہ ہے جس کے استعمال سے انواع کی پیدائش ہوتی ہے۔جب یہ آگ، ہوا، پانی، مٹی، چاروں عناصر باہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں، تو ان میں ایک مزاج پیدا ہوتا ہے، یعنی یہ عناصر اپنی خاصیت، سردی، گرمی، خشکی، تری کو متضاد باہم ملا کر الگ مزاج بناتے ہیں۔اسے CHEMICAL COMPOUND بھی کہتے ہیں، ان مادہ سے تیار جسم کے اندر ہونے والے استحالہ سے اخذ شئی کا نام خلط اربعہ خون، بلغم، صفراء، سوداء، کی صورت میں تغذیہ بدن بنتا ہے، جو ایک طبعی اور بنیادی شکل اختیار کرتی ہے، جسے اعضاء کا نام دیا جاتا ہے۔

کسی شکل کے قائم ہونے کا تعدد اس وقت ہوتا ہے، جبکہ شئی بالشعور کی مشیت

پہلو کو ظاہر کرتی ہے،اس شئی کو ارواح کہا جاتا ہے اور اس جسم کو صحیح حالت میں برقرار رکھنے کی تدبیروں میں مصروف رہنے والے ردعمل کو قوی کہا جاتا ہے،ان سب کاموں کی صحیح حالت میں برقرار رکھنے اور اسے اپنی محدود زندگی تک پورا کرنے والی کیفیت یا صورت کا نام طبیعت دیا جاتا ہے، جو بدن کو ہر خطرات سے مدبر کرتی رہتی ہے،اسی طبیعت کو کہیں قوت مدافعت اور کہیں قوت متاعت اور کہیں مختلف افعال کے صادر ہونے والے مراکز کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ بدن میں ہونے والے ردعمل کی کیفیت طبیعت سے ہی مراد ہے۔چنانچہ بدہضمی میں استفراغ کی طبعی صورت میں طبیعت مریض کی کیفیت قے کی طرف میلان کرتی ہے،جس سے مریض کی خود بخود قے ہوجاتی ہے۔یا مریض تھوڑی سی تحریک پر قے کر دیتا ہے۔

طبیعت کا وسیع تفصیلی مفہوم ہیضہ C H O L E R A یا سوزش امعاء ENTERITES کی علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے،جس میں آنتوں کے اندرسمی اجزاء کے انجذاب کو روکنے کے لئے طبیعت آنتوں کی حرکت دودیہ کو تیز کردیتی ہے اور استحصال ہوا کرتے ہیں،جس سے جسم میں پانی کی کمی ہوکر DEHYDRATION ہوتاہے،تو مریض کی طبیعت پانی پینے کی طرف راغب ہوتی ہے۔خلیہ کے SODIUM(NA) امعاء کی غشاء مخاطی پر آکر مانع تعفن کا کام کرتی ہے،جس سے مریض کے جسم میں (SODIUM(NA+ کی کمی ہوجاتی ہے۔نتیجہ مریض نڈھال ہوجاتا ہے۔اسی طرح سے حاملہ عورتوں میں (++CALCIUM(G کی کمی طبیعت مٹی اور کھڑی کھانے کی طرف راغب کرتی ہے۔اسی طرح جب طبیعت کا مفہوم ظاہر ہوجاتا ہے تو علاج معالجہ کا نظریہ کھل جاتا ہے کہ طبیب صرف طبیعت کا خدمت گار ہے ،نہ کہ معالج۔مثلاحمی بخار جو کہ فی نفسہ کوئی بیماری نہیں ہے، بلکہ طبیعت مدافعانہ فعل کی ایک علامت ہے۔اصلا انسان کے تمام طبعی افعال غیرارادی ہوتے ہیں،یا تو وہ حفظ بقاء وصحت کے لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں یا ازالہ مرض اور امورالاحمقہ مضرصحت کی اصلاح کے لئے

وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

طبیعت کے تمام افعال سلامتی ابدان کی غرض سے مسلمہ ہیں،اسی لئے تکمیل اغراض طبعی غیر معمولی کا ذریعہ اخلاط خون ہے، جو ایک ایسا جوہر ہے، جس کا تعلق وتوسل تمام اجزائے جسمانی سے ضروری ہے، کیونکہ یہی جوہر سلامتی اعضاء نشو نماء تلافی ونقصان اور تکمیل اعضاء کا واحد ذریعہ ہے۔

پس بقاء ومقام بدن انسانی طبیعت کا ہر وقت محتاج ہے۔ جس کو یہ آب وہوا۔ غذاء (ستہ ضروریہ) حاصل کرتی ہے اور مطالبہ آب وہوا کا غیر ارادی طور پر اسی غرض وغایت کے لئے ہوتا رہتا ہے۔

جب غذا وارد بدن ہوتی ہے، تو مختلف طریقوں سے مختلف جوہر اخلاط اربعہ سے موسوم ہوتے ہیں، انہیں حاصل کر کے تمام اعضاء تک طبیعت پہنچاتی ہے اور فضلات کو خارج کرتی ہے۔ چونکہ طبیعت مربی ومنظّم امور جسمانی ہے، اس کا کوئی فعل حصول منفعت سے خالی نہیں ہے۔

ان حرکات سے گرمی پیدا ہوتی ہے، ان تمام افعال کو صحیح سالم ومکمل ہونے کے لئے بدن انسان کو ستہ ضروریہ پر عمل لازم ہے، اگر اس طرح خون میں اجزاء خام فاسد پیدا ہوں یا شریک ہوں اور یہ طبیعت کے اعتدالی امور کے معنی ومتراجم ومضرت رساں ہوں تو طبعیت اپنی اصلاح وازالہ مضرت کی غرض کی مرتعش ومحرک ہوتی ہے، اور تمام اجزاء خون کو غیر معمولی طور پر حرکت اور ہیجان میں لاتی ہے، جس سے ان حرکت میں گرمی پیدا ہوتی ہے، جو بخار سے موسوم ہوتا ہے، اس عام ہیجان سے طبعیت کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ خون کے وہ اجزاء خام جس میں حرارت سے نضج پا کر خون معتدل میں بدلنے کی صلاحیت ہو، اس کو اعتدال پر لانے اس سے جسم میں علیل کے سامان کشادہ ہوں اور مضر اجزاء بذریعہ میل۔ پسینہ خارج ہوں اور اعتدال صورت پیدا ہو۔

چنانچہ یونانی طریقہ علاج اور اس کا علاج خود اس بات کا ثبوت ہے

، برخلاف اس کے موجودہ دور کے جدید علاج کا طریقہ جس میں کہ نظریہ طبعیت کو نظر انداز کر کے جو علاج معالجہ کئے جا رہے ہیں، اس کے نتیجے میں کئی ایک امراض وجود میں آ رہے ہیں ،جو کہ صرف طبعیت کی غفلت کا نتیجہ ہے ،اس کا ثبوت خود MODRAN SCIENTIFIC BOOK میں IATROGENIC DISORDER کے نام سے کئی ایک امراض کا تذکرہ ہے،اس IATROGENIC DISEASE کی وجہ یہ ہے کہ جدید دواؤں کا تجربہ جو پہلے جانوروں پر کیا جارہا ہے،اس میں نہ تو لوگ جانوروں کے مزاج سے واقف ہیں،جس کا تجربہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی انسان کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ ایک اور ناخوشگوار بات یہ ہے کہ جو بھی دواؤں کی ریسرچ ترقی یافتہ مما لک کرتے ہیں، وہ پہلے جانوروں پر استعمال کرانے کے بعد اگر کچھ کامیابی ملی تو وہ لوگ ان دواؤں کو پہلے خود نہ استعمال کر کے غریب مما لک POOR CPUNTRIES میں پہلے استعمال کراتے ہیں، پھر ان کا نتیجہ اچھا ہونے کے بعد خود استعمال کرتے ہیں،اس میں غریب مما لک کے لوگ ایک انسانی نوع ہونے کے باوجود ایک تجرباتی حیوان EXOERIMENTAL ANIMAL ہوتے ہیں،اس کے برخلاف ہمارے اطباء نے جو بھی دواؤں کا ذکر کیا ہے، انہوں نے پہلے دوا کا مزاج پہچانا، پھر انسان کا مزاج معلوم کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ دوا کس مرض میں زیادہ موثر ہے، اس وجہ سے اس علاج طریقہ سے کم سے کم نقصانات علم میں آتے ہیں۔

الغرض جملہ قدیم یونانی طریقہ علاج اور اصول علاج ایک ایسا علاج نظام ہے، جو کہ نہ کی مریض کو شفاء دیتا ہے، بلکہ مریض کی ہر قوت اور ہیئت کو اپنی جگہ محفوظ رکھتا ہے۔

پروفیسر عبدالوہاب۔شبلی نیشنل کالج،اعظم گڑھ

EXISTENCE OF ALLAH(GOD) ACCORDING TO CHEMISTRY

اللہ کا وجود الکیمیا کی نظر میں

تقریباً تین سو Chain Reaction رات دن ہوتے ہی جن کی میعاد بھی وہی ہے۔سوسال نوے سال وغیرہ۔جبکہ دیکھا گیا ہے کہ ایک چین Reaction کو اگر ساری دنیا کے لوگ مل کر چلانا چاہیں تو ان کی لائف زیادہ سے زیادہ دو مہینہ کی ہوگی،اس کے بعد پورا ایکشن ختم ہو جائے گا،مگر قدرت ان کے سارے ایکشن کو ہر جسم میں چلاتا رہتا ہے،جو کہ اربوں کھربوں ہوں گے۔

EVIDENCES NO.2 UNLIMLED COUTLSS CELLS

دنیا کے Colls Biologicel کے تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کا جسم Collls سے بنا ہوا ہے،جن کی تعداد جتنی گنتی ہوتی ہے اس سے کئی گناہ زیادہ ہے،جیسے کہ ارب کھرب،بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دنیا میں جتنے انسان ہیں،ان سے بہت زیادہ اور سارے Colls کی ایک لائف ہوتی ہے،جن کی خوراک خون ہے،اگر دنیا کے سارے انسان مل کر ان کو روٹی دینا چاہیں تو ناممکن ہے،مگر ایک طاقت ہے جو کہ سارے انسانوں کے colls کو خوراک دیتا ہے۔

EVIDENCES NO.3 UNLIMITTED SIZEY COLL NEL

بقول دنیا کے Biologicel chinise کے جسم کے سارے collsایک

دوسرے سے ملے ہوتے ہیں اوران کے ملنے سے ایک بہت ہی بڑا جال بنتا ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ اسی جال کو پھیلا دیا جائے تو پوری دنیا ڈھک جائے اور اگر دنیا کے سارے انسانوں سے یہ کہا جائے کہ ایک جال بناؤ، جس سے دنیا ڈھک جائے تو ان کے لئے یہ ناممکن ہوگا، مگر اللہ پاک ہر جسم میں اتنا بڑا جال بنا رکھا ہے۔

EVIDENCES NO.4 SIZE OF THE CANCEROUS CELLS

کینسر سائنٹٹ کا کہنا ہے کہ اگر Conerous Clls کے جال کو کھول دیا جائے تو اسی سے پوری دنیا ڈھک جائے گی۔ جس انسان کے جسم میں کینسر ہو جاتا ہے تو اس کے Colls کی لمبائی چوڑائی سے پوری دنیا ڈھک جائے گی، جبکہ دنیا کے لوگ مل کر اتنا بڑا جال نہیں بنا سکتے ہیں، جس سے دنیا ڈھک جائے۔

EVIDENCES NO.5 SUPPLY BLOOD ALL THE CELLS

ہر انسان کے جسم میں Cells کی تعداد انسانوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، ان کو زندہ رکھنے کے لئے خوراک کون دیتا ہے۔ اگر ساری دنیا کے لوگوں سے اس کے لئے کہا جائے تو وہ نہیں کر سکتے ہیں، مگر اللہ ہے جو کہ ایک ایک کو Cells کو ان کی خوراک پہنچاتا ہے۔

EVIDENCES NO.6 STRENGTHOF HERT MORETHAN ABOUL 50,000 HP

سائنٹٹ کے مختلف تجربات سے یہ بات Confirm ہو چکی ہے کہ ایک دل میں تقریباً پچاس ہزار گھوڑے کی طاقت ہوتی ہے، بلکہ اس سے بہت سی ٹرینیں ایک ساتھ چل سکتی ہیں، اتنی بڑی زیادہ طاقت ایک گوشت کے ٹکڑے میں کہاں سے آتی ہے جو کہ دنیا کے انسانوں کے لئے ناممکن ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ دل تقریباً 5/6 کلو خون کو بہت بڑی طاقت سے پمپ کرتا رہتا ہے جس سے خون بہت باریک باریک نسوں میں جاتا رہتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن

،جبکہ دل کی حفاظت تقریباً 50,000 HP ہو۔

EVIDENCES NO.7 PROTECTION OF HERT BY STROHG ACIO

ابھی تک Saentific تجربوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ دل کی حفاظت کے لئے اللہ نے ایک بہت ہی مضبوط تیزاب جس کی Sprenght تقریباً 30N ہے جس کی بہت ہی باریک Layes سے گھیر دیا ہے۔ جبکہ اسی تیزاب کی ایک بوند سے انسان جل کر خاک ہوسکتا ہے، مگر اس کا دل پر کوئی اثر نہیں ہے، اگر اسی دل کو باہر نکال کر اسی تیزاب کی ایک بوند اس پر ڈال دی جائے تو دل اسی وقت جل کر راکھ ہو جائے۔ یہ صرف اللہ ہی کر سکتا ہے۔

EVIDENCES NO.8 NO FORMATION OF BUBBLES AFTER PUMPING OF 5/6KG BLLOD BY HERT

Sertific تجربوں سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جب دل خون کو پمپ کرتا ہے تو اسی وقت ایک بھی بلبلہ نہیں پیدا ہوتا ہے، جبکہ دنیا کا کوئی بھی انسان تھوڑے سے خون میں حرکت کرتا ہے تو سیکڑوں بلبلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر دل کے پمپ کرنے سے ایک بھی بلبلہ پیدا ہو جائے تو انسان اسی وقت Coll atrse کر جائے گا اور موت واقع ہو جائے گی۔

EVIDENCES NO.9 EXDTS OF NOBEL PRIZWINNER TOOF ABDUSSALAM(PAKISTAN)

اللہ کا قرآن سچا اور برحق ہے۔

نوبل یافتہ پروفیسر عبدالسلام اپنی ریسرچ کے سلسلے میں جب ایک اٹلین کی ماتحتی میں کام کرنے کے لئے منظوری پائی تو اٹلین پروفیسر نے ایک قرآن کی آیت پڑھی اور کہا کہ اس پر تم کو کام کرنا ہے۔ پروفیسر نے اسی آیت کی تفسیر پوچھی تو عبدالسلام نے دو مہینہ کا وقت مانگا اور اس کے بعد دو مہینہ تک لگاتار اسی آیت کی بہت ساری تفسیروں کا مطالعہ کیا۔ کچھ، عربی، انگریزی اور اردو میں۔ دو مہینہ کے بعد دوبارہ جب وہ پروفیسر ملے تو کہا کہ اگر ہم

قرآن کی اسی آیت کونہیں مانتے ہیں تو ساری theory یا ریسرچ اس کی مخالف نہیں، دنیا اس کو نہیں مانے گی، انہوں نے جواب دیا کہ جب تم کہتے ہو کہ قرآن سچا ہے تو پھر اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اس پر کام کرو۔ ۲۲ سال تک کام کرتے رہے اور جو نتیجہ اخذ کیا تو دنیا کے اور کاموں سے مختلف نکلا، بعد میں اس theory کو دنیا نے مانا اور اس کے بعد ان کو اسی کام پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔

OUT LINE ABOUT: PROF. A. WAHAB

مختصر تعارف: یو جی سی نے ۲۰۰۸ء میں ریسرچ سائنٹٹ اور دواؤں سے نوازا

(۱) شعبہ الکیمیا میں صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے (شبلی نیشنل کالج میں)

(۲) ۱۹۷۵ء میں Ph. D کی ڈگری ایک آسٹرلین پروفیسر بجر اور پروفیسر اوپا BHU کی ماتحتی میں کی۔

(۳) ریسرچ پبلیکشن۔ انہوں نے ۱۱۰ پیپرس نیشنل اور انٹرنیشنل جرنل میں چھاپا۔

(۴) ان کی ماتحتی میں ۱۵ لوگوں نے Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔

(۵) ان کو یو جی سی نے ۲۰۰۸ء ریسرچ سائنسٹٹ ایوارڈ Rrcarch Saehtisl- Award دیا۔ اور نویڈا میں کام کرنے کے لئے Life Achevement Award کی منظوری دی اور اسی وقت یہ میجر ریسرچ میں rugage ہیں۔

(٦) مقالہ Presanla Tion تقریباً ۲۵ ریسرچ پیپرس ہندستان کی مختلف یونیورسٹی انسٹیوٹ نیشنل اور انٹرنیشنل کانفرنس میں پڑھا۔

(۷) ممبرس آف سوسائٹی۔ چار سائنس سوسائٹی کے لائف ممبر ہیں۔

(۸): Committe Execntive یہ Bombay Barc کے EC ممبر ہیں۔

(۹) کمسٹری کی تین کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں پوروانچل یونیورسٹی کے گیریجویشن کے لئے ہیں۔

ڈاکٹر ارشد جمیل ۔شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

فلسفہ، تعلیم اور اسلام

سوال ہے کہ عصر حاضر میں تعلیم معاشرے میں پسندیدہ تبدیلی نہیں لاتی ہے، یہاں پر فلسفہ ہماری کیا مدد کرتا ہے؟ میں یہاں پر کوشش کروں گا کہ میری توجہ انھیں باتوں پر مرکوز رہے جو مطلوب ہیں اس سوال کے تین اہم اجزاء ہیں۔

(۱)۔عصر حاضر میں تعلیم

(۲)۔معاشرے میں پسندیدہ تبدیلی

(۳)۔فلسفہ کی مدد

اب اگر ہم تینوں اجزاء کا تجزیہ کریں اور گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کریں تو مسئلہ خود بخود کھل کر سامنے آجائے گا کہ عصر حاضر میں رائج نظام تعلیم معاشرے میں پسندیدہ تبدیلی لانے سے کیوں قاصر ہے؟ سب سے پہلے ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ عصر حاضر میں کیسی تعلیم دی جا رہی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ آج کے دور میں تعلیم کا سارا دارومدار مادی علوم پر ہے اور انسان کو مادے کا خوگر بنایا جا رہا ہے، انھیں علوم کا بول بالا ہے اور ساری توانائی اسی میں صرف کی جا رہی ہے ہر آدمی ڈاکٹر اور انجینئر بننے کا خواہش مند ہے آج مادی علوم کی درجنوں شاخیں وجود میں آچکی ہیں جن کی فہرست کافی طویل ہے، ان مختصر باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم جائزہ لیں کہ ہم انسانی معاشرے میں کس قسم کی تبدیلی کے خواہش مند ہیں تب یہاں پر سوال مبہم اور غیر واضح ہے سب کی پسند الگ الگ ہے ہر آدمی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے سوچ رہا ہے اور اپنی اپنی عینک سے دیکھ رہا ہے۔کیا اس سے ہماری مراد مادی ترقی ہے تو آج انسان بہت ترقی کر چکا ہے اور اس میں کافی پسندیدہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں ہوا کو مسخر کر کے ہوا کے دوش پر سوار ہے، سمندروں کو قابو میں کر چکا ہے اور اس کے سینے پر

سوار ہوکر سمندر کی موجوں کو چیرتے ہوئے جدھر جانا چاہتا ہے جا رہا ہے، گھر بیٹھے ساری دنیاں کی خبریں حاصل کر رہا ہے، ٹی وی، ویڈیو، کمپیوٹر اور بجلی جیسی سہولتیں میسر ہو چکی ہیں غرض کہ زندگی کے ہر ہر شعبے میں سائنس اور ٹکنالوجی نے ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے زندگی کا کوئی بھی میدان اور گوشہ ایسا نہیں جو سائنسی برکات وثمرات سے محروم ہو زمین پر غذائی اشیاء کی پیداوار ہو، زمین میں مدفون خزائن کا تعلق ہو، سمندر کی تہوں میں مخفی خزانے ہوں سب کا سینہ چیر کر انسان اپنے فائدے کی چیزیں نکال لایا۔ تیز رفتار گاڑیاں، آبی اور ہوائی جہازوں نے دنیاں کو بالکل سمیٹ دیا، ذرائع ابلاغ نے تو اتنی ترقی کی کہ آدمی کہیں پر بھی بیٹھ کر کسی سے بھی بات کر سکتا ہے اور اسے دیکھ سکتا ہے، زمین کی وسعتیں انسان کے لئے اب کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں فضائی وسعت کی بھی اس نے تسخیر کی جس کے نتیجے میں چاند انسان کے قدموں کے نیچے آ گیا اور اب مریخ پر کمند ڈالنے کی کوشش جاری ہے غرض کوئی بھی میدان اور شعبہ سائنسی اختراعات وفوائد سے خالی نہیں اگر یہی پسندیدہ تبدیلی ہے تو آج کافی تبدیلی رونما ہو چکی ہے جس کا ایک دو صدی پیشتر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نئی ایجادات وطفیل کے سہارے بہت سارے نئے امراض ومسائل کا بھی جنم ہوا امراض کے علاوہ خود انسانوں نے اپنی تباہی کے لئے نت نئے مہلک جنگی ہتھیار و وسائل کے ساتھ ایٹم بم، ہائڈروجن بم اور زہریلی گیس ایجاد کیں جو پچھلے زمانے کی بہت ساری جنگوں کے مقابلے میں آج کی صرف ایک جنگ ہی ان سے زیادہ انسانی اور مادی ہلاکت کا تحفہ پیش کرتی ہیں جو ہمیں سائنس کے فوائد کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں بقول فضا ابن فیضی۔

روندتے ہوئے لاشوں کو یہ موت کے عفریت
بتائے کوئی یہ سائنس کی ہار ہے کہ جیت

انسان اپنی عقل اور علم کا استعمال کرتے ہوئے سائنس کی تحقیقات کی مدد سے اپنی ترقی کی انتہا پر پہونچ گیا ہے مگر اس نے روحانیت اور انسانی بھائی چارے کو کھو دیا ہے

وہ چاند تک تو پہونچ گیا ہے مگر اس کے دل کی دنیا تاریک ہوگئی ہے اور اپنے اندرون میں وہ انتہائی پستی کا شکار ہے۔ اگر پسندیدہ تبدیلی سے مراد معاشرے کے بگاڑ اور فساد کا خاتمہ ہے اور اس کی جگہ ایک صالح معاشرہ کا وجود ہے تو میں مؤدبانہ عرض کروں گا کہ عصر حاضر میں جس قسم کی عموماً تعلیم دی جارہی ہے اس میں سرے سے یہ صلاحیت ہے ہی نہیں کہ وہ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک پاک وصاف صالح معاشرہ وجود میں لا سکے اور اگر کوئی عصر حاضر کی تعلیم سے اچھا معاشرہ وجود میں لانے کا خواہش مند ہے تو ممکن ہے کہ وقتی طور پر کچھ فائدہ ہو جائے لیکن کماحقہ فائدہ کی توقع کھلونے سے خود کو بہلانے کے مترادف ہے۔

انسان جسم اور روح دونوں کا مجموعہ ہے نہ صرف روح ہے اور نہ صرف جسم، روح کے تقاضے اور ہیں جسم کے تقاضے کچھ اور، جسم سے روح نکال دی جائے تو انسان محض ایک بے جان لاش کا ڈھیر ہے اور روح سے جسم کو ہٹا دیا جائے تو وہ محض روح ہے انسان نہیں۔ عصر حاضر میں توانائی کا سارا رخ یکطرفہ ہے پوری کوشش کا محور جسم ہے اور زندگی کی چکی کا پاٹ اسی کے اردگرد گھوم رہا ہے ایسے عالم میں ایک اچھے معاشرے کا خواب کسی دیوانے کا خواب تو ہوسکتا ہے ایک دانا اور صحیح ومناسب فکر ونظر رکھنے والا ہرگز ایسی باتیں نہیں سوچ سکتا۔ زندگی کی گاڑی انھیں دو پہیوں پر چل رہی ہے اگر ایک میں خرابی آئے گی تو لازماً دوسرا بھی متاثر ہوگا اس لئے جسم اور روح دونوں کے تقاضے کو پورا کئے بغیر سماج میں سدھار لانا اور اچھے معاشرے کا وجود میں لانا بے معنی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عصر حاضر کا نظام تعلیم معاشرے میں خوشگوار تبدیلی لانے سے کیوں قاصر ہے؟ فلسفہ اس میں ہماری کیا مدد کرتا ہے تو میں کہوں گا کہ ایک ہزار فلسفہ جو مذہب بیزار فلسفیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں وہ معاشرے میں سدھار کی بات تو درکنار معاملہ کو اور بھی الجھا کر رکھ دیں گے، ان فلسفیوں کی مثال ان اندھوں کی سی ہے جنھوں نے ہاتھی کا پیر چھوا تو کہہ دیا کہ ہاتھی سیدھا ہے، پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو کہہ دیا کہ پہاڑ کی طرح ہے، ہاتھی کا سونڈ چھوکر

کہہ دیا کہ ٹیڑھا ہے۔ یہ کائنات بہت وسیع ہے اس میں کائنات کے کروڑوں اربوں راز چھپے ہوئے ہیں انسان کا دماغ اس بات کا متحمل نہیں ہے کہ ان ساری باتوں کا ادراک کر سکے اگر ایک پہلو کو جاننے کی کوشش کرے گا تو ہزاروں پہلو اس کی نظر سے اوجھل رہیں گے انسان اس بات سے قاصر، عاجز اور درماندہ ہے کہ وہ زندگی کے سارے معاملات کو حتمی طور پر سمجھ کر نوع انسانی پر نافذ کر سکے، لازماً ہمیں ایک ایسی طاقت کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو تمام طاقتوں کا منبع اور اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کائنات کے سارے راز ہائے سربستہ سے ہمہ وقت کامل واقفیت رکھتا ہے اور اسی کے حکم پر نظام ہستی چل رہا ہے، وہ قادر مطلق ذات صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔

اب اگر کوئی فلسفی اللہ کا مطیع اور فرماں بردار بندہ رہ کر کائنات میں غور و فکر کرتا ہے اور اسی نہج پر سوچتا ہے جس نہج پر سوچنے کا حکم ہے تو ضرور اس فلسفے کے اندر ایسی صلاحیت ہوگی کہ وہ انسانی زندگی کی کایا پلٹ دے اور حیات انسانی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ عصر حاضر میں فلسفہ کا صحیح انطباق نہیں ہو رہا ہے یعنی غور و فکر کے بعد جو ایک فلسفہ وجود میں آتا ہے اور لگتا ہے کہ اس سے معاشرہ میں کسی حد تک سدھار آنے کی امید ہے وہ روبہ عمل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ڈاکٹر کے اس نسخے کی طرح ہوتا ہے کہ ایک ڈاکٹر کسی مریض کے لئے دوا تجویز کرے اور نسخہ دے کر کہے کہ اس پر عمل کرو اور مریض اس پر عمل نہ کرے اور کہے کہ ہمیں شفایابی نہیں ملی اس لئے اہم بات یہ ہے کہ حکمت اور دانائی کی جو باتیں ملیں اس کا معاشرے پر انطباق ہونا چاہئے اس طرح اگر ہم فلسفہ کا انطباق سماج پر کریں گے تو امید ہے کہ سماج اور معاشرہ میں پسندیدہ تبدیلی آئے گی اور اس کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے اس کے لئے ہمیں جدوجہد، ایک درد اور سوز دروں کی ضرورت ہے ورنہ بقول اقبال۔

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

دور حاضر میں دنیا کی اکثر اقوام کا تعلق کسی نہ کسی مذہب سے ہے اور کسی نہ کسی صورت میں وہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتی ہیں کئی قومیں ایسی ہیں جن کے پاس خدا کا ناقص تصور ہے اور خدا کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو بھی اس کا شریک مانتی ہیں، اس وقت دنیا میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو انسان کے درد کا مداوا کر سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے خدا کا کلام یعنی قرآن کا جب سے نزول ہوا ہے اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اس لئے اگر کوئی چاہتا ہے کہ اچھا معاشرہ قائم ہو تو اسے اسلام کے سایہ رحمت میں آجانا چاہئے کیوں کہ اسلام کافی تجربات سے بھی گزر چکا ہے خلفائے راشدین کا دور اس کی عملی مثال ہے جب روئے زمین امن وامان اور خوشگوار انقلاب سے بھر چکی تھی، پیغمبر اسلام نے قرآنی تعلیمات اور اپنی مثالی زندگی کے ذریعہ ایک ایسا سماج اور معاشرہ کی تعمیر اور ایک ایسی مقدس جماعت تیار کی جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر اور عاجز ہے۔

کتابیات:

۱۔فلسفۂ تعلیم، پروفیسر محمد شریف خان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء

۲۔تعلیم، فلسفہ اور سماج، سلامت اللہ، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

۳۔اصول تعلیم، ڈاکٹر ضیاءالدین علوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء

۴۔تعلیم اور اس کے اصول، محمد شریف خان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

۵۔تعلیم کے مقاصد اور وسائل، خلیل الرب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء

۶۔نئی تعلیم کے مسائل، باقر مہدی، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

۷۔اشارات تعلیم، آسٹن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

۸۔تعلیم وتربیت اور زندگی، محمد اکرام خان، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری اینڈ پی جی کالج سدی پیٹ، تلنگانہ

علامہ اقبالؔ کا نظریۂ تعلیم

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ (۱۸۷۷ـ۱۹۳۸ء) شاعر مشرق، مفکّر اور فلسفی شاعر کی حیثیت سے دنیائے ادب میں مشہور ہیں، اقبالؔ نے اپنی فکر وفلسفہ میں تعلیم وتربیت کو خاص طور سے شامل کیا ہے، انہوں نے تعلیم کی فنّی اور عملی صورتوں پر غور کیا، مسائل تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اسے اپنے فلسفۂ حیات میں مناسب جگہ دی ہے، اقبال نے اپنے عہد کے نظام تعلیم کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اور اس پر تنقیدی نظر سے جائزہ لیا ہے، انہوں نے مدرسہ، طلبہ، اساتذہ اور نصاب تعلیم پر اظہار خیال کیا ہے، انہوں نے مشرق ومغرب کے فلسفۂ تعلیم اور نظام کار کو سامنے رکھا ہے، دونوں کا ایک دوسرے سے تقابل کیا، ان کے درمیان حدّ فاصل کھینچی ہے، خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ زندگی کو کامیاب طریقہ سے برتنے اور اس کی مزاحمتوں پر قابو پانے کے لئے کس قسم کی تعلیم اور نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔

مسائل تعلیم سے اقبال کی دل چسپی صرف نظری بحثوں اور خیال آرائیوں تک محدود نہ تھی، بلکہ عملی طور پر انہوں نے اس میں حصہ لیا ہے، تعلیم کے مشاغل ومسائل سے عملاً ان کی دل چسپی کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز معلّم کی حیثیت سے کیا، اور شعبۂ تعلیم وتدریس سے تقریباً پندرہ سال منسلک رہے، اور اگر ان میں ان کے لکچروں کو بھی شامل کرلیا جائے جو انہوں نے حیدرآباد، مدراس، میسور، لاہور، علی گڑھ، الٰہ آباد اور دہلی وغیرہ میں وقتاً فوقتاً دیئے، جن میں سے بیش تر کی حیثیت اعلیٰ تعلیم کے موضوع پر توسیعی خطبات کی سی تھی، نیز مختلف جامعات کی نصابی کمیٹیوں کا ممبر ہونا اور اعلیٰ تعلیم کے امتحانات کے سلسلہ میں مختلف اداروں میں بہ حیثیت ممتحن ان کا بلایا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ تعلیمی مسائل ومشاغل

سے ان کی دل چسپی کا سلسلہ کسی نہ کسی طور پر تاعمر قائم رہا، ان تمام باتوں کے نتیجہ میں ایک مفکر کی حیثیت سے انہوں نے تعلیم مسئلہ پر بھی گہری نظر پیدا کر لی تھی، اور ان کے تعلیمی تصوّرات میں تنظیم و تفکر کے ایسے آثار رونما ہو گئے تھے جن کی بدولت ان کا شمار تعلیمی مفکرین میں کیا جانے لگا، اور اہم تعلیمی مسائل کے سلسلہ میں نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی ان کی افکار و تجربات کو اہمیت دی جانے لگی۔

مسئلہءِ تعلیم سے اقبال کی نظری و علمی دل چسپی کا ثبوت ۱۹۱۲ء سے یعنی اس وقت سے ملتا ہے جب کہ نہ تو ابھی ان کا کوئی فلسفہءِ حیات مرتب ہوا تھا، نہ ''اسرارِ خودی'' منظرِ عام پر آئی تھی، اور نہ سیاست کے خارزار میں انہوں نے قدم رکھا تھا، چنانچہ مسٹر گوکھلے نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں جبری یا لازمی تعلیم کا ایک مسوّدہ پیش کیا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی حیثیت سے زیرِ بحث رہا، مختلف شہروں میں اس کی وضاحت اور تائید و تردید میں جلسے ہوئے، ایک بڑا جلسہ اسلامیہ کالج لاہور میں ۸/ فروری ۱۹۱۲ء کو علامہ اقبال کی صدارت میں ہوا، علامہ نے گوکھلے کے مسوّدے کی پرزور تائید کرتے ہوتے اپنے خطبہء صدارت میں کہا:

''لفظ جبریہ کسی کو کھٹکنا نہ چاہتے، جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے، اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا، جس کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے، اُسی طرح جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے، اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے، مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں، بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس جبریہ تعلیم کے قانون کی حد میں لڑکیاں بھی آ جائیں گی، مگر ہم چاہیں تو اس شق کو قانون سے نکلوانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔'' (گفتارِ اقبال: ۳۰ مرتبہ: رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء)

اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے مسائل سے ان کا کتنا گہرا تعلق تھا، اور وہ ان مسائل کو جانچنے پرکھنے کے لئے اسلامی حدود کے مطابق کیسی کشادہ نظری سے کام لیتے تھے، ۱۹۱۵ء میں جب ''اسرارِ خودی'' اور ۱۹۱۸ء میں ''رموزِ بیخودی'' کی اشاعت کے

ذریعہ اقبال کا فلسفہءخودی یا پیغام حیات منظر عام پر آیا، تو تعلیم کے سلسلہ میں ان کے فکری پہلو بھی سامنے آتے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیم کی بلند ترین سطح ان کی نظر میں کیا ہے؟ اور اس سطح تک پہنچنے کے لئے فرد اور جماعت کو کیا کچھ کرنا چاہئے؟

فلسفہءخودی کے حوالہ سے جہاں اقبال بالواسطہ اپنے تعلیمی تصورات کی اشاعت کر تے رہے، وہیں تعلیم کے عملی پہلوؤں سے بھی برابر دل چسپی لیتے رہے، چناں چہ ۱۹۳۲ء میں جب جے۔ ایف۔ بروس تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے پنجاب یونی ورسٹی آئے اور انہوں نے سینٹ کے ہندو ممبروں کے زیرِ اثر اسلامی تاریخ کو بی۔ اے کے کورس سے خارج کرنے کی تجویز پیش کی تو مسلمانانِ پنجاب نے اس تجویز کے خلاف کئی احتجاجی جلسے کئے، اس سلسلہ کا ایک بڑا جلسہ علامہ اقبالؔ کی صدارت میں بھی ہوا، اس میں انہوں نے یونیورسٹی کے فیصلہ کے خلاف ایک جامع اور مدلل تقریر کی اور مسٹر بروس کی رپورٹ کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اس استدلال کو کہ ہندوستان کے لوگوں کو اسلامی تاریخ کے بجائے صرف ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہئے، تنگ نظری و تعصّب کا نتیجہ قرار دیا، اور دلائل سے ثابت کہا کہ کسی قوم کی تاریخ صرف ایک قوم کی تاریخ نہیں، بلکہ اجتماعی حیثیت سے روحِ انسانی کی عکاس اور پورے عالمِ انسانی کی تاریخ ہوتی ہے، اور اسی نسبت سے اسلامی تاریخ بھی صرف مسلمانوں کی نہیں، بلکہ کل اقوامِ عالم کی تاریخ ہے۔ (گفتارِ اقبالؔ: ۱۵۳)

تعلیم کے نظری اور عملی مسائل سے اقبالؔ کی دل چسپی اور وسعتِ نظر کا اندازہ ان تجاویز سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اسلامیات کے نصاب سے تعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے سوالات کے جوابات میں مرتب کر کے انہیں بھیجی تھیں، اور جس میں انہوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی، پنجاب یونی ورسٹی اور دیو بند و ندوہ جیسے تعلیمی اداروں کے نصاب و طریقہء تدریس کو پیش نظر رکھ کر ایک مکمل لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔ (فکرِ اقبالؔ: ۹۱ مرتبہ پروفیسر غلام دستگیر رشید، حیدر آباد دکن ۱۹۴۴ء)۔

مسئلہ تعلیم خصوصاً اسلامی تاریخ کی تعلیم کے سلسلہ میں اقبال کا وہ طویل خط بھی خاص

طور پر قابل توجہ ہے جو انہوں نے ایک ترکی اسکالر خالد فیصل کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا، جس میں علم الانساب کے نصاب و تدریس کے مباحث پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ (اقبال نامہ: ۲/۲۷۲)

علاوہ ازیں ٦/اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی میں والسرائے ہند کی طلب کردہ تعلیمی کانفرنس میں اقبال کو مدعو کیا جانا اور اس سلسلہ میں جو سب کمیٹی لندن میں بنی تھی، اس کا ممبر ہونا، بعد ازاں علامہ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ساتھ نادر شاہ فرماں روائے افغانستان کی خصوصی دعوت پر وہاں کی تعلیمی منصوبہ بندی پر مشورہ دینے کی غرض سے ۱۹۳۳ء میں اقبال کا کابل جانا (دیکھئے: سیاحتِ اقبال: ۲۰٦ مرتبہ حق نواز، کتاب مرکز، لائلپور ۱۹۷٦ء اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے مسائلِ تعلیم پر غیر معمولی نظر پیدا کر لی تھی، اور ان کے خیالات و افکار کو علمی حلقوں میں حد درجہ اہمیت دی جاتی تھی۔

بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پنجاب میں ایک بڑا اسلامی مرکز قائم کرنے کا منصوبہ اور اسے عملی شکل دینے کے آرزومند تھے، چناں چہ وہ علامہ مصطفیٰ المراغی شیخ الجامعہ ازہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں، جس کی نظر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آتی، ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو، ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے فارغ التحصیل اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں، ہم ان کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور شغب سے دور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں، ہم ان کے لئے لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتابیں موجود ہوں اور ان کی رہ نمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو، اور قرآن حکیم میں بصارت تامہ رکھتا ہو، نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں، آپ از راہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں، مجھے توقع

ہے کہ دین حق کا نوراس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف واکناف میں پھیلے گا''۔

(اقبال نامہ:۱/۲۵۱)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال دینی وعصری علوم پر مشتمل ایک معیاری ادارہ قائم کر نے کے متمنی تھے، جہاں جدید علوم کے ساتھ دینی علوم اور قرآن کی تعلیم کا خصوصی نظم ہو، تا کہ یہاں سے فارغ ہونے والے دینی علوم میں بصیرت کے ساتھ دورحاضر کے جدید تقاضوں سے واقف ہو ں، تا کہ قوم وملت کی دینی اور وحانی اور عصری رہ نمائی کا مقدس فریضہ انجام دینے کے لائق ہوں۔

تعلیم اور فن تعلیم کے مسائل سے اس گہرے لگاؤ کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں اقبال کے بنیادی تصوارت کیا تھے؟ اپنے عہد کے نظام تعلیم سے وہ کسی حد تک مطمئن تھے؟ انفرادی وقومی سطح پر مروجہ نظام ونصاب تعلیم میں وہ کس قسم کی تبدیلیاں چاہتے تھے، اور ان تبدیلیوں سے ان کا مقصود کیا تھا؟ مناسب ہوگا کہ سب سے پہلے آخری سوال یعنی تعلیم کے سلسلہ میں ان کے مقصود نظر پر روشنی ڈالی جاتے، تا کہ بقیہ سوالوں کا جو اب آسان ہوجائے۔

اقبال کے کلام ومقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں ان کا مطمح نظران کے فلسفہء خودی سے الگ نہیں تھا، فلسفہ خودی کی روح عظمت آدم اوراحترام انسانیت ہے، اس کے لئے وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے جس کی بنیاد رنگ ونسل یا علاقائی تفریق کے بجائے اخوت انسانی اور عالم گیر انسانی برادری پر رکھی گئی ہو، اور جس میں بندہ وآقا یا افغانی وتورانی اور مغربی ومشرقی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر ہر شخص کو تکمیل خودی کے یکساں مواقع حاصل ہوں، اور جس میں استحصال، مرعوبیت اور احساس کم تری کا عمل دخل نہ ہو، تکمیل خودی سے مراد فر دمیں ایسی لچک دار اور متوازن سیرت وکردار کی تخلیق ہے، جس کے سہارے وہ زندگی کے سارے نشیب وفراز میں کامیابی سے گزر سکے، چنانچہ فرد کے لئے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ:

مصاف زندگی میں سیرت فولا د پیدا کر　　شبستان محبت میں حریر و پر نیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تندروکوہ وبیاباں سے　　گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

اقبالؔ کا خودی کی تربیت واستحکام پر زور دینا، زندگی کے سارے مرحلوں میں فرد کو صرف اپنی ذات پر اعتماد کرنے کی تلقین کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ذاتی اور انفرادی تعلیم کو رسمی اور جامعاتی تعلیم سے کم اہمیت نہیں دیتے تھے، انہیں یقین تھا کہ غیر رسمی اور ذاتی تعلیم جسے ایک فرد اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی مدد سے حاصل کرتا ہے، رسمی اور مکتبی تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند، توانا، قابل اعتماد، حقیقت شناس اور کارگر ہوتی ہے، کیوں کہ رسمی تعلیم کا سلسلہ مکتب یا اسکول سے شروع ہو کر کالجوں اور یونی ورسٹیوں پر ختم ہو جاتا ہے، جب کہ ذاتی اور غیر رسمی تعلیم کا سلسلہ عمر بھر جاری رہتا ہے، گویا رسمی تعلیم، تعلیم کا حاصل و مقصود نہیں، بلکہ اس غیر رسمی تعلیم کا زینہ ہے، جو فرد میں یقین و خود اعتمادی کی صفات پیدا کر کے اسے رفعتِ انسانیت اور معراج بشریت سے ہم کنار کرتی ہے۔

ظاہر ہے ایسی تعلیم جو کہ فرد میں زندگی بھر کے لئے جستجوئے علم کا شوق و ولولہ پیدا کر دے اور اسے اپنے طور پر اپنی خودی کی تعمیر کا موقع فراہم کر سکے، آزاد فضا میں ہی میسر آسکتی ہے، ایسا ماحول جس میں خوف اور مرعوبیت کو دخل ہو، خودی کے ارتقاء اور ذہن کی نشو ونما کے لئے سازگار نہیں ہوسکتا، اس لئے اقبال کے نزدیک تعلیم اور تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اس کا ماحول، ان عناصر سے پاک ہو جو طالب علم میں محکومانہ یا غلامانہ ذہنیت پیدا کر سکتے ہوں، خواہ یہ غلامی ومحکومی سیاسی وسماجی ہو، یا نفسیاتی، ذہنی اور معاشی ہو۔

علامہ اقبال مشرق کے نظام تعلیم کو اس لئے غیر مؤثر اور بے روح خیال کرتے ہیں کہ وہ استحصالی اور استعماری قوت کا زائیدہ و پروردہ ہے، مغرب نے نہایت چالاکی سے علم کے نام پر دین اور تہذیب کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، اور جسمانی قتل کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر گہرے سازش کے تحت مشرقی اقوام وممالک کو اپنا آلۂ کار بنالیا ہے، جو نئی نسل کی روحانی اور مذہبی نسل کشی کے مترادف ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

عصر حا ضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری، دے کے تجھے فکر معاش
اور یہ اہل کِلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گر چہ مکتب کا جوان زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

علامہ نے اپنی نظم: ''فردوس میں ایک مکالمہ'' میں جدید تعلیم میں مذہب کی ضرورت واہمیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا
آتی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمین تاز
مذہب سے ہم آہنگئی افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیت ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جاتے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستان کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اقبال کے نزدیک مذہب کی رہ نمائی میں علم حاصل کرنے سے مقاصد میں بلند

پروازی پیدا ہوگی، اور افراد واقوام کے درمیان ہم آہنگی ہوگی ، کیوں کہ مذہب سے عاری تعلیم نہ بلند فکری پیدا کرسکتی ہے اور نہ اقوام عالم کو متحد اور پرامن رکھ سکتی ہے، جیسا کہ مذہب سے عاری تعلیم کے علم بردار اہل یورپ نے اپنے ہم مذہب کے ساتھ دو عظیم جنگیں لڑیں، اور اپنے ساتھ مشرقی اقوام کو بھی ملوّث کیا، اور آج تیسری جنگ عظیم کے لئے بھیانک تیاریاں جاری ہیں۔

مغرب اور مغرب کے زیرِ اثر درس گاہوں کے بارے میں اقبالؔ کا شکوہ ہے کہ ان درس گاہوں میں طلبہ کی کردار سازی نہیں ہو پا رہی ہے، یہ نظامِ تعلیم شاہین بچوں کو کرگس بنانے کا فن بن گیا ہے، اس تعلیم کے سبب نوجوان یاس ومحرومی کے شکار ہوگئے ہیں، نہ ان میں جوش عمل ہے، نہ جذبۂ خودداری ہے، یہ نظام تعلیم مذہب واخلاقیات کے خلاف ایک منظّم سازش ہے، پڑھانے والوں میں نہ افکار کی ندرت ہے، نہ خیال کی جدّت، نہ علم کی گہرائی، یہی حال پڑھنے والوں کا ہے، نہ ان میں تحصیلِ علم کی لگن ہے، نہ حقائق کی جستجو نہ تعمیرِ خودی کا ذوق وشوق، تجدید وایجاد کے بجائے ہر بات میں تقلید کا اثر نمایاں ہے، روح پروری کو نظرانداز کرکے صرف جسم پروری اور ہوسنا کی پر سارا زور صرف کیا جارہا ہے، نتیجہ میں طلبہ کی نظر سطح بینی سے آگے نہیں بڑھتی، اور زندگی کے رموز وحقائق ان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، یہ باتیں اقبال نے عمیق مطالعے، گہرے مشاہدے اور ذاتی تجربوں کے بعد کہی ہیں:

آہ !مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صید زبوں
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ ودو
کرسکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذّتیں کیا کیا
رقابت ، خودفروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

مغربی مدارس فکری بے راہ روی اور کج روی کے شکار ہیں، آزادانہ اور حقیقت پسندانہ سوچ وفکر سے عاری ہیں، آزادئی فکر کے نام پر غلامانہ فکر کو قبول کر رہے ہیں، مشینی دور میں افکار کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے، انہیں عقل وتدبّر کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جارہا ہے، اس لئے ناپختہ افکار بجائے انسان بنانے کے حیوان بنا رہی ہیں، اور بے لگام فکر نے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے:

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
آزادئی افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادئی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ
پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

ضرب کلیم میں ''اجتہاد'' اور ''ہندی مکتب'' کے عنوان سے اقبال نے درس گاہوں کی کم عیاری، بے جان ماحول، تقلیدی انداز تدریس، نصاب کی بے معنویت، گھٹی گھٹی فضا، فکر سے عاری اور خرافات میں گرفتار ذہن پر اظہارِ تاسف کیا ہے اور مدرسہ واہلِ مدرسہ کو بڑی خوب صورتی سے طنزِ لطیف کا نشانہ بنایا ہے:

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علم خو دی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

آزادی کی اک آن ہے محکوم کا ایک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

موسیقی و صورت گری و علم بناتات

(ہندی مکتب)

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کِردار نہ افکار عمیق

حلقئہ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

(اجتہاد)

اس طرح کے بے شمار اشعار ہیں، جن میں اقبالؔ نے مغرب کی حکمت و دانش اور تہذیب وتمدن کو تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالہ سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اقبال مغرب کے مادہ پرستانہ نظامِ تعلیم ہی کو مغربی تہذیب کی ساری خرابیوں کی جڑ خیال کرتے تھے، اور مشرق میں جو کچھ ہورہا ہے، وہ مغرب ہی کے زیراثر ہورہا ہے، اور مشرق کے اساتذہ نے تعلیم کے باب میں جو تقلیدی اور محکومانہ اندازِ فکر اختیار کررکھا ہے، اس میں مغرب کے حکمرانوں اوران کی حکمتِ عملی کو بڑا دخل ہے، چنانچہ اقبال نے مغرب کے نظامِ تعلیم پر بڑی سخت تنقیدیں کی ہیں، اور چوں کہ مشرق کی خرابی کا ذمہ دار بھی مغرب ہی ہے، اس لئے انہوں نے مغرب پر لعن طعن کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

تعلیم کے مسئلہ میں اقبال کی رائیں کسی تنگ نظری کی شکار نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے مغرب کے قلب میں بیٹھ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، اور مغربی طرز زندگی کا نہایت قریب سے

مشاہدہ کیا تھا، وہ یورپ سے اوروں کی طرح محض مرعوب و مسحور ہو کر نہیں لوٹے، بلکہ مغرب کے خلاف بغاوت کے عناصر ان کی طبیعت میں پہلے سے بھی زیادہ قوی ہو گئے تھے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں ہیں
کہ اس عذاب میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

عصری مدارس یا مروجہ نظام تعلیم پر طنز و تنقید کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اقبال علم و فن یا اساتذہ و تعلیم کی اہمیت و افادیت کے قائل نہیں تھے، بلکہ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم، دانش ور اور اسکالر تھے، اور شراب علم کی لذت کے لئے کشاں کشاں مشرق سے مغرب پہنچے تھے:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

تعلیم ان کے نزدیک ملت کے جملہ امراض کی دوا اور خون فاسد کے لئے کارگر نشتر ہے، اساتذہ بھی ان کے نزدیک قوم کے معمار ہیں، ان کو احساس تھا کہ مغرب کا نظام تعلیم مشرق کے مقابلہ میں بہرحال اثر انگیز اور زندگی افروز ہے، ہر چند کہ اس کی بنیاد عقل یعنی مادی ترقیوں پر ہے بایں ہمہ اس کی کامرانیاں قابلِ رشک ہیں، اس نے زمین کے چپے چپے کو فردوس بنادیا وہے اور مشرق ابھی تک خیالی جنت کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہے:

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
فرنگ کا ہر قریہ فردوس کے مانند

ایک جگہ اقبال نے واضح الفاظ میں اہلِ فرنگ کی تعریف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مغرب کی قوت کا راز چنگ و رباب، رقص و سرور، عریانی و بے حیائی، موتراشی و لالہ روئی یا لادینی و خطِ لاطینی میں نہیں بلکہ علم و فن کی ترقی میں ہے:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

نے ز سحر ساحران لا لہ روست
نے زعریاں ونے از قطع مو
محکمی اورانہ از لا دینی است
نے فر وغش از خط لا طینی است
قوت ِافرنگ از علم و فن است
ازہمیں آتش چر اغش روشن است

لیکن مغربی علوم وفنون میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ اقبالؔ اہلِ مشرق خصوصاً ملت اسلامیہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے نظامِ تعلیم اور طریقہ، تدریس میں مغرب کی تقلید و پیروی کے بجائے تجدد واجتہاد سے کام لیں، خود کو غلامانہ ذہنیت سے آزاد کریں، اور ملّی حرّیت پسندی کے شایانِ شان اپنی درس گاہوں کے لئے نصاب تعلیم مرتب کریں، اس نصاب کے راہ نما اصول قرآن اور سنت سے ماخوذ ہوں۔

اقبالؔ مدارس کے ماحول کو تقلید سے پاک، خوف و ہراس سے مبرّ احیات افروزی سے ہم کنار، علم وفکر سے زیادہ جذب وشوق اور تخمین وظن سے زیادہ عشق ویقین کے جذبوں سے معمور، تعصب وتنگ نظری سے نزّ ہ، احترامِ آدمیت اور کشادہ قلبِ انسانی سے ہم آہنگ اور اخوت ومحبت کی بنیادوں پر استوار دیکھنے کے متمنی تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ تعلیمی درس گاہیں آدمی کو انسان بنائیں، دماغ کے ساتھ روح کی غذا کا بھی سامان فراہم کریں، دنیاداری کے ساتھ دین داری بھی سکھائیں، علم وفکر کی روشنی کے ساتھ قلب ونظر کی روشنی بھی عام کریں، ظاہر کے ساتھ باطن پر بھی نظر رکھیں اور زندگی کے مختلف مراحل میں مادّی وسائل کے ساتھ باطنی شعور وخود آگہی کی قوتوں سے بھی کام لیں، اقبالؔ کے نزدیک ایسا ہونا اسی وقت ممکن ہے، جب کہ نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں دینی اور مذہبی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی جائے۔

مغرب کی خرابی یہ ہے کہ اس نے اپنے نظام تعلیم سے اخلاقیات کے درس اور دینی تعلیم کو یکسر خارج کر دیا ہے، ذہن کے لئے تو نئے نئے راستے کھولے ہیں، لیکن کشاد قلب کی راہیں

بند کردی ہیں، اس کے برعکس مشرق کے قدیم نظامِ تعلیم میں غلط قسم کی باطنیت اور خود کو فنا کر دینے والی روحانیت پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اس کی نظر سے خارجی حقائق پوشیدہ رہ گئے ہیں، نئے نظامِ تعلیم میں ذہن وقلب، خبر ونظر، عقل وعشق اور جسم وجان کا یہ عدم توازن اقبال کو بہت کھٹکتا تھا، وہ ان میں توازن وتوافق پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مغرب عقل کے ساتھ عشق کو بھی اپنا رہ نما بنا ئے اور مشرق روحانی قدروں کی محافظت کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون سے بھی پوری طرح مسلح ہو، گویا، اقبال ایک ایسا نظامِ تعلیم چاہتے تھے کہ جس میں مشرق ومغرب کی تمام خوبیاں جمع ہوں، اور جس میں تعلیم وتربیت پا کر ایک فرد دل ودماغ کی جملہ قوتوں کے ساتھ متوازن ومکمل شخصیت کا حامل بن سکے، جیسا کہ اقبال ضربِ کلیم کی نظم: ''علم اور دین'' میں اپنے جذبہ کا اظہار کرتے ہیں:

زمانہ ایک، حیات ایک ، کا ئنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری ، قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تر بیت ِغنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شر یک ِنسیم
وہ علم ، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشا ہد ات ِحکیم !

کتابیات :

(۱) کلیات اقبال

(۲) نقوش اقبال (علامہ ابوالحسن علی ندویؒ)

(۳) اقبال کا فن (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

(۴) دس عظیم شاعر (فاروق ارگلی)

(۵) اقبال سب کیلئے (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

(۶) اقبال کی اردو نثر (ڈاکٹر عبادت بریلوی)

(۷) اقبال دانائے روزگار (عبداللطیف اعظمی)

(۸) حافظ اور اقبال (یوسف حسین خاں)

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ۔ مئوناتھ بھنجن (یوپی)

فاصلاتی طرز تعلیم اور طلبائے مدارس

ہندوستان میں فاصلاتی طرز تعلیم اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گئی ہے۔ اب ہندستان بھر میں سیکڑوں ایسے تعلیمی ادارے اور یونیورسیٹیاں قائم ہیں جو باقاعدہ فاصلاتی طرز تعلیم (DISTANCE EDUCATION) کا اہتمام کرتی ہیں اور نت نئے روایتی اور جدید تر کورسوں کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرتی ہیں اور لاکھوں طلباان سے بروقت متفیض بھی ہوتے ہیں، کیونکہ ملک میں ثانوی سطح سے پوسٹ گریجویٹ تک اور ایم،فل اور پی ایچ ڈی (ph.D) تک کی اس طرز تعلیم کی سہولیات دستیاب ہے۔

فاصلاتی طرز تعلیم ایک ایسا نظام تعلیم ہے جس سے کوئی بھی شخص چاہے وہ کہیں کا بھی رہنے والا ہو،اس چاہے جو بھی عمر ہو،کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو،کسان،بنکر، مزدور، دستکار یاملازمت پیشہ یا نوکر ہو،بغیر وقت کی پابندی،اسکول ،مدرسہ،انسٹی ٹیوٹ یا کلاس روم کی حاضری،بغیر استاد کی موجودگی،اپنے گھر بیٹھے یا کام دھندے میں لگے ہونے کے باوجود ہر قسم کی تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ یہ ایسا طریقہ تعلیم ہے جو انسانی معاشرے کے ہر فرد کو تعلیم جیسے بنیادی حق سے استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو اپنی مجبوری کے تحت تعلیم حاصل نہ کر سکے ہوں یا درمیان میں تعلیم چھوڑ کر روزی روٹی میں لگ گئے ہیں یا اپنے حصول تعلیم کے شوق کی تکمیل نہ کرپائے ہوں یا کسی مخصوص تعلیم کورس کی تعلیم کے خواہاں ہوں یا مدرسہ کی دینی تعلیم کے بعد عصری تعلیم کے حصول کی تمنا رکھتے ہوں،مگر باقاعدہ عصری تعلیم کے حصول کی سکت نہ رکھتے ہوں یا مدارس میں زیر تعلیم رہتے ہوئے عصری علوم یا کسی مخصوص سائنسی یا تکنیکی کورس کی تکمیل کرنے کے آرزومند ہوں ایسے تمام لوگوں کے لئے یہ فاصلاتی طرز تعلیم انتہائی مفید اور کارآمد ہے۔

اب نہ صرف ہندستان میں بلکہ دنیا بھر میں فاصلاتی طرز تعلیم کا دائرہ انتہائی وسیع

ہو چکا ہے اور اس طرز تعلیم کے ذریعے نت نئے کورسز چلائے جاتے ہیں، جن میں داخلے کے شرائط بھی بیحد آسان اور لچکدار ہوتے ہیں، اس میں کم سے کم مدت میں کسی بھی اسٹریم یا سائنڈ سے ایک مقررہ مدت کے اندر کسی بھی کوس کے تکمیل کی سہولیت ہوتی ہے۔ یہ پورا نظام تعلیم ہی طالب علم مرکوز ہوتا ہے، اس لئے اس تعلیم میں طالب علم کی سہولت کے مطابق اور اس کی مرضی اور خواہش ووقت کے لحاظ سے ہر قسم کی تعلیم کے حصول کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں کتاب اور استاد کی بھی قید نہیں ہوتی ہے۔ اس طالب علم کے حافظہ کے بجائے اس کی فہم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسی میں ایک خاص اصول اور منصوبہ بند طریقے سے تدریسی مواد تیار کیا جاتا ہے جو کتابی مواد سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ ان میں خود آموزی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں طلبا کو خود آموزی کے ذریعے سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی بھی آسانی ہوتی ہے۔ اس طرز تعلیم میں چونکہ طالب علم ہی مرکزیت حاصل ہوتی ہے اور استاد کی حیثیت محض تعلیمی شیر کی ہوتی ہے اور عموماً استاد جسمانی محاذ سے طالب علم سے دور بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس طرز تعلیم میں مطلوبہ تعلیمی مواد طلبا تک پہنچا دیا جاتا ہے اور رسمی تعلیم کے اداروں جیسے اسکول، مدرسہ کالج اور یونیورسٹیوں کی طرح اس میں طلبا کی تعداد بھی محدود نہیں ہوتی بلکہ لامحدود ہوتی ہے۔ اس میں نہ جگہ کا مسئلہ ہوتا ہے اور نہ ہی استاد کی موجودگی ہی لازم ہوتی ہے۔ اس نظام تعلیم میں حصول علم یا کچھ جاننے اور سیکھنے کا سلسلہ عمر کی ایک منفرد حد ختم ہوجانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ مسلسل جاری رہتا ہے کیونکہ تعلیم محض حصول روزگار کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ ہماری شخصیت کو نکھارتی اور سنوارتی بھی ہے اور ہمارے اندر موجود فطری صلاحیتوں کو ابھار کر اسے مہمیز بھی کرتی ہے اور ہمارے کردار کے خدوخال بھی طے کرتی اور ہمیں مہذب، بااخلاق اور ذمہ دار شہری بھی بناتی ہے۔ فکر و خیال میں وسعت و بالیدگی پیدا کرتی ہے اور ہمیں خود کفیل بنانے میں بھی معاون ہوتی ہے۔ نت نئی کامرانیوں سے ہم کنار کرتی ہے اور فرد میں استقلال واستحکام پیدا کرنے کے ساتھ اس کے اندر قائدانہ صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

فاصلاتی طرز تعلیم میں عموماً کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹی وی، ریڈیو اور کمیونی کیشن سیٹ لائٹ وغیرہ کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں آڈیو، ویڈیو کیسٹ اور اسی قسم کے دیگر تکنیکی آلات

وسامان کا بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے اس طرز تعلیم کے طالب علموں کے لئے ان کی بنیادی اور کام چلاؤ جانکاری بھی ناگزیر ہوتی ہے اور عصر حاضر کی نئی نسل میں یہ تقریباً عام بھی ہو چکی ہے اور عہد حاضر کی تبدیلی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور تجارتی صورت حال میں ہمہ جہت تعلیمی ترقی بنا کسی بھی قسم کی ترقی وفروغ بھی تقریباً ناممکن سا بھی ہو چکا ہے، اس لئے بھی مروجہ تعلیم کے متبادل کے طور پر فاصلاتی تعلیم کا رواج دن بدن بڑھتا جارہا ہے اور کسی بھی معاشرتی طبقے میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی مختلف جماعتیں یا گروہ بھی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ تسلسل کے ساتھ باقاعدہ رسمی تعلیم کے خواہاں ہوتے ہیں۔ کچھ میڈیکل یا انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں کچھ جدید ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں کی تعلیم کے حصول میں دلچسپی رکھتے ہیں تو بعض لوگ درس وتدریس کے لئے پڑھتے ہیں اور تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔ معاشرے میں سب سے بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ہوتی جو مختلف وجوہات کی بنا پر رسمی تعلیم حاصل نہیں کر پاتے ہیں یا جس قسم اور جیسی یا جس معیار تک کی وہ چاہتے تھے نہیں کر پائے ہیں اور عمر زیادہ ہوجانے کے باعث یا مجبوراً اب تک مختلف کام دھندوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو اپنی ضرورت کے مطابق تعلیم حاصل کر لینے اور روزگار میں لگ جانے کے باوجود بھی کچھ نیا اور الگ سیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں تاکہ آئندہ اسے بروئے کار لاکر اپنی آئندہ کی زندگی کو مزید روشن اور تابناک بنا سکیں یا ملک وقوم اور معاشرے کے لئے کچھ بنا کر دکھا سکیں، مگر ان کے پاس کوئی ایسی سند یا ڈگری نہیں ہے جو ان کے مخصوص علم، فن یا ہنرمندی کی تصدیق کر سکے۔ مذکورہ بالا تمام قسم کے لوگوں کے لئے فاصلاتی طرز تعلیم نت نئے امکانات اور مواقع فراہم کرتا ہے اور دینی مدارس کے طلبا اور فارغین کے لئے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

فاصلاتی طرز تعلیم یا ڈسٹینس ایجوکیشن سسٹم مختلف خوبیوں کا حامل ایک ایسا جدید طرز تعلیم ہے جس میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض کمزوریاں بھی ہیں اور مسائل بھی، لیکن کمزوریاں اور مسائل تو اس سے بھی رسمی تعلیم میں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر رسمی طرز تعلیم میں استاد اور طالب علم آمنے سامنے ہوتے ہیں اور دوطرفہ ابلاغ کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ طلبا کے چہرے کے تاثرات اور

دوسرے حرکات وسکنات سے استاد کی فیڈ بیک بھی ملتا رہتا ہے۔اگر کوئی چیز طالب علم کو سمجھ میں نہیں آتی ہے تو استاد اس کی وضاحت کر کے طالب علم کو مطمئن کر دیتا ہے،لیکن فاصلاتی طرز تعلیم میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔اس طرز تعلیم میں کسی مسئلے کی وضاحت کے لئے طالب علم کو واٹس اپ یا فیس بک وغیرہ کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔یا پھر اسٹڈی سینٹر یا کانٹکٹ کلاس سے رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔اس لئے اس طرز تعلیم میں طلبا کے اپنے ذاتی ذوق وشوق اور دلچسپی ولگن کی خاص کارفرمائی ہوتی ہے۔اس میں طلبا کو استاد کی براہ راست نگرانی بھی حاصل نہیں ہوتی ہے اس لئے طلبا کو ناجائز وسائل کے استعمال کی بھی آزادی ہوتی ہے لیکن ایسا کرنے والے طلبا اپنی ایسی حرکتوں سے کسی اور کا نہیں بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ویسے بھی حصول تعلیم کے معاملے میں طالب علم کا ایماندار ہونا بڑی سے بڑی کامیابی سے خود کو ہمکنار کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

ہندستان ایک آزاد جمہوری ملک ہے اور جمہوری نظام میں بندوں کو گنا جاتا ہے اس لئے عددی طاقت کی خاص کارفرمائی بھی ہوتی ہے۔لیکن تعلیم ایک ایسی لازوال اور بے مثال طاقت ہے کہ وہ آدمی کو گننے کے بجائے تولنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔جمہوریت میں اگر چہ اکثریت حکمراں ہوتی ہے اور اقلیت اس کی دست نگر،لیکن تعلیم میں اگر برتری اور فوقیت حاصل ہو جائے تو اکثریت خود اقلیت کو اپنا حکمراں اور منتظم بنانے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔عہد حاضر میں بھی اور تاریخ میں بھی اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔اس لئے تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں اور جمہوریت کی اصل بنیاد بھی تعلیم ہی ہے اور تعلیم کی اہمیت وافادیت ہر دور ہر زمانے ہر ملک وقوم اور علاقے وطبقے ہیں رہی ہے اور آج بھی ہم بھی اور ہندوستان کی مسلم اقلیت کے لئے تو اب ایک ناگزیر ہوگئی ہے کیونکہ یہ بات اب بالکل صاف طور عیاں ہو چکی ہے کہ ہندستان کی مسلم اقلیت جو کل قومی آبادی کا تقریباً پانچواں (بیس فیصد) حصہ ہے نہ یہ کہ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے کافی پس ماندہ ہے نہ صرف اکثریت کے مقابلے میں بلکہ دیگر تمام اقلیتوں اور دلتوں سے بھی کافی پیچھے ہے۔تعجب ہے کہ جو مسلم اقلیت ہندستان میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو صدیوں تک حکمراں رہی ہے وہ ہندستان کی آزادی کے

بعد پچھڑتے پچھڑتے اتنی پیچھے ہوگئی ہے کہ اس کی پس ماندگی خود کئی سوالات پیدا کرتی ہے۔

ہندستانی مسلمانوں کو اپنی تیز رفتار اور کارآمد تعلیمی ترقی کے لئے خود ہی منصوبہ بند کوشش کرنی ہوئی اور مختلف قلیل مدتی اور طویل مدتی منصوبے بنانے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہونا ہوگا۔ اس لئے جہاں رسمی اور روایتی تعلیم میں پیش قدمی کرنی ہوگی اور مختلف تعلیمی وسائل سے استفادہ بھی کرنا ہوگا، جس میں فاصلاتی طرز تعلیم بھی اہم اور شارٹ کٹ وسیلہ ثابت ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں کی ہمہ جہت تعلیمی ترقی کے لئے صرف رسمی تعلیمی اداروں، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں کا ہونا ہی کافی نہیں ہے اور صرف کیمپس ایجوکیشن ہمارے سارے مرض کا مکمل علاج نہیں ثابت ہوسکتا اس لئے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ فاصلاتی طرز تعلیم طلبا کی جدید اور عصری تعلیم کے حصول کا ایک اچھا ذریعہ ہوسکتا ہے، اس للئے منصوبہ بند اور تحریکی انداز میں مدارس کے فارغین اور طلبا کو اس فاصلاتی طرز تعلیم سے بلا تاخیر استفادہ کرنا چاہئے۔ نیز دینی مدارس کے ایسے طلبا جو کسی وجہ سے مدرسے کی تعلیم مکمل نہیں کر سکیں اور درمیانی میں ہی تعلیم چھوڑ دیئے انہیں بھی اس طرز تعلیم سے دوبارہ جوڑ کر انہیں باقاعدہ تعلیم یافتہ بنانے کی ضرورت ہے۔ مدارس کے طلبا ایک طرف جہاں اردو میڈیم اور دینی تعلیم سے بہرور ہوتے ہیں وہیں عصری تعلیم کے حصول کے بعد عملی زندگی میں زیادہ مفید ثابت ہوسکتے ہیں اور اپنی زیادہ بہتر کارکردگی کا بھی مظاہرہ کرسکتے ہیں۔

ہندستان میں مختلف مکتب فکر کے مدارس پائے جاتے ہیں لیکن ان طریقہ تعلیم میں عموماً اور مقاصد میں بھی بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے اور ان کی مجموعی تعداد بھی ہزاروں میں ہے اور ان میں جو قدرے مختلف نصاب رائج وہ یکساں مقاصد کی تکمیل کے ذرائع ہیں۔ مثلاً دیوبند مکتبہ فکر اور بریلوی مکتب فکر کے مدارس میں درس نظامی کا نصاب رائج ہے، جن میں صرف ونحو اور فقہ پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن بعض ایسے مدارس بھی ہیں جنھوں نے درس نظامی میں تبدیلی کرکے علامہ شبلی نعمانی کے مرکب تعلیمی نصاب سے استفادہ کررہے ہیں اور ایسے مدارس میں قرآن فہمی پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ شیعہ مکتب فکر کے بھی مدارس ہیں اور ایسے مدارس بھی ہیں

جو ریاستی مدرسہ بورڈ سے ملحق ہیں اور سرکاری گرانٹ پاتے ہیں۔ان مدارس کے علاوہ بہت سے ایسے مدارس بھی ہیں جن میں عالیہ نظام تعلیم رائج ہے اور وہ عموماً سرکاری مدرسے ہوتے ہیں۔ان مدارس کے علاوہ بہت ساری یونیورسٹیوں میں بھی عربی، فارسی اور دینیات کے شعبے قائم ہیں اور بہت سی یونیوسٹیاں مخصوص عربی فارسی اور اورینٹل مضامین کے امتحانات کا بھی اہتمام کرتی ہیں،لیکن ان سبھی قسم کے مدارس میں سب سے بڑی تعداد ان آزاد مدارس کی ہے جو کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر محض اہل خیر حضرات کی اعانت وامداد سے چلتے ہیں اور وہ بھی عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک مکتب کی شکل میں جہاں صرف قرآن پاک ناظرہ وحفظ اور اردو، ہندی یا کوئی دوسری علاقائی زبان اور ابتدائی حساب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ایسے مکتب عموماً محلے کی مسجد یا پھر اپنی عمارت میں چلتے ہیں۔ان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے بھی آس پاس کے ہوتے ہیں۔ان میں کل وقتی مکاتب ہیں وار جز وقتی مکاتب بھی۔جز وقتی مکاتب میں عموماً وہ بچے بھی پڑھتے ہیں جو باقاعدہ اسکولی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد یعنی چالیس فیصد پرائمری سے آگے کی تعلیم حاصل نہیں کرپاتے ہیں۔یہی تناسب اسکولوں میں بھی مسلم بچوں کا ہوتا ہے اور دینی مدارس میں بھی اور تقریباً کل مسلم آبادی کے پچیس فیصد بچے آج بھی کیسی اسکول وار کالج کا منہ تک نہیں دیکھ پاتے۔پرائمری سے آگے بڑھنے والے بچوں کی بہت بڑی تعداد کے سرپرستوں کا صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی ہائی اسکول پاس کرے تاکہ پاسپورٹ بنوا کر اسے خلیجی ملکوں میں بحیثیت لیبر بھیجا جاسکے اور وہ روزی روٹی سے لگ سکے۔لہذا اس ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔

مدارس کی سب سے بڑی اور اہم تعداد دوسرے قسم کے ان مدارس ہوتی ہے جہاں باقاعدہ داخلہ لے کر ایک مخصوص نظام تعلیمی کے تحت طلبا دینی اور مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان میں مختلف اورینٹل علوم فنون کا بندوبست بھی ہوتا ہے اور عالمیت یا فضیلت تک کی باقاعدہ تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ان دونوں قسم کے مدارس ومکاتب میں لاکھوں طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں اور جہاں کے طلبا مخصوص معیار تک کی تعلیم کے بعد پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں اور مختلف قسم کے کام دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔اگر ان طلبا کی باقاعدہ تعلیمی منصوبہ بندی کر کے انہیں رسمی یا فاصلاتی تعلیم سے وابستہ

کردیا جائے تو چند سالوں میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے،لیکن ان طلبا کے لئے ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ عموماً انگریزی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں کیونکہ مدارس میں یا تو انگریزی پڑھائی نہیں جاتی اور اگر پڑھائی جاتی ہے تو اس کی حیثیت ضمنی مضمون کی ہوتی ہے۔مگر اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں اور اسلامی علوم وفنون میں ان کی اچھی صلاحیت ہوتی ہے اور اگر مدارس کے نصاب با قاعدہ انگریزی بھی بحیثیت ایک اہم مضمون کے پڑھائی جائے اور اچھے استاد کے ذریعہ اس کی تدریس پر توجہ دی اور بہت سے مدارس نے ایسا کیا بھی ہے اور اس کے نتائج بھی اچھے سامنے آرہے ہیں،اس لئے تمام دینی مدارس کو اس جانب توجہ دینی چاہئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد وغیرہ یونیورسٹیوں نے مدارس کی اسناد کو اپنے مختلف کورسوں میں داخلے کے لئے منظور کیا ہے اور مدارس کے طلبا کی اچھی خاصی تعداد بھی ان یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم بھی ہے اور بہت سے طلبا اپنی تعلیم کی تکمیل کر کے برسرروزگار بھی ہوگئے ہیں،مگر ان کے مضامین عموماً اردو، فارسی، عربی یا اسلامی علوم ہوتے ہیں۔جدید عصری مضامین یا سائنس وٹکنالوجی کے کورسوں تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے اور اس کے لئے مدارس کے طلبا کو فاصلاتی تعلیم کے توسط جدید عصری تعلیم اور سائنس وٹکنالوجی کے کورسوں تک رسائی کرائی جاسکتی ہے،اس لئے مدارس کے ذمہ داروں کو اس جانب توجہ دینے اور مدارس کے طلبا کو تعلیم کے دوران ہی فاصلاتی تعلیم سے وابستہ کرنے کا انتظام ہونا چاہئے تاکہ ہر قسم کی تعلیم کا حصول اور کسی اپنے پسندیدہ میدان میں مہارت ان کے لئے بھی ممکن اور آسان ہوسکے۔لیکن اس بات پر بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ دینی مدارس کے کچھ بنیاد اور مخصوص مقاصد بھی ہیں،جنہیں کسی بھی حال میں نہ تو ترک کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کوئی گنجائش نکالنی ہوگی اور ایسی منصوبہ بندی اور عملی کوشش کرنی ہوگی کہ مدارس کے یہ طلبا بھی عصری تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمتوں کے حصول کے اہل ہوسکیں کیونکہ جب ایسے طلبا انتظامی محکموں میں پہنچیں گے تو مسلمانوں کی صحیح نمائندگی بھی کریں گے اور ملک وقوم کے لئے ایماندار بھی ثابت ہوں گے۔

مدارس کے طلبا کی فاصلاتی طرز تعلیم سے وابستگی بڑی کارآمد ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ مسلم طلبا چاہے مدارس کے ہوں یا اسکول و کالج کے انہیں ایسے ہی چھوڑ دینا قوم وملت کا بہت بڑا خسارہ ہے اور کوئی بھی قوم اور طبقہ اپنی نئی نسل کو انظرانداز کرکے کبھی بھی قومی عزت وقار حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ یہ طلبا اور نوجوان ملت کا سرمایہ ہیں اور ملت کو ان کے روشن مستقبل کیی بہر حال فکر کرنی ہوگی اور ان کے لئے بہتر سے بہتر مواقع پیدا کرنے ہوں گے اور فاصلاتی طرز تعلیم جیسے متبادل مواقع سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔ تاکہ ہندستان کے مسلم معاشرے میں بھی خوش آئندہ مستقبل کے آثار پیدا ہوسکیں، مگر اس کے لئے طلبا کو بڑے پیمانے پر فاصلاتی طرز تعلیم سے روشناس کرا کر انہیں اس سے منسلک کرنا ہوگا اور اس کی باقاعدہ تعلیمی رہنمائی اور کیریئر گائیڈس کے بھی انتظامات کرنے ہوں گے، کیونکہ یہ دور مسابقتی اور مقابلہ جاتی دور کا ہے اور ہر قسم کے مسابقتی امتحانات دن بدن مشکل ہوتے جارہے ہیں، ایسے میں اگر مسلم طالب علموں کی تعلیمی رہنمائی اور بہتر گائیڈس کا انتظام نہیں ہوگا تو ہم آج کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے والے اشخاص پیدا ہی نہیں کرپائیں گے، بلاشبہ ملک میں بعض ادارے یہ بہت اچھا کام کررہے ہیں، مگر ایسے اداروں کو جہاں وسعت دینے کی ضرورت ہے وہیں ملک کے مختلف شہروں میں نئے اداردوں کے قیام کی بھی حاجت ہے۔ اس کے علاوہ مدارس کو مذکورہ یونیورسٹیوں سے الحاق کرکے ان کی طرف سے ملنے والی تعلیمی مراعات سے ملت کے طالب علموں کو متعارف کرانے اور استفادہ کرنے کے لئے مہمیز بھی کرنا چاہئے۔

اسلام غالباً دنیا کا واحد ایسا مذہب ہے جس میں حصول علم کو فریضے کی حیثیت حاصل ہے ، مکہ کی آبادی سے کافی فاصلے پر غارِ حرا کے پرسکون اور روحانی ماحول میں پیغمبر اسلام پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس کی پہلی آیت ہی ''اقرا'' سے شروع ہوتی ہے، جس کے معنی ''پڑھو'' ہوتا ہے۔ اس کے بعد کی چار آیتیں بھی علم ہی سے متعلق ہیں۔ اسی طرح علماء کرام بتاتے ہیں کہ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے جو سب سے پہلی قسم کھائی ہے وہ قلم کی ہے اور قلم علم و تعلیم کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ ہوتا ہے، جس سے اسلام میں علم اور تعلیم کی اہمیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ارشادنبوی ہے کہ ''علم حاصل کرو، ماں کی گود سے لے کر قبر تک'' کہا جاتا ہے کہ قرآن پاک اسی مرتبہ علم کا ذکر ہے اور سیکڑوں جگہ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔علماء کرام یہ بھی بتاتے ہیں کہ بخاری شریف کی کتاب العلم میں چھیاسی (۸۶) مرفوع حدیثیں اور بائیس (۲۲) اقوال علم اور اہل علم کی اہمیت وفضیلت سے متعلق ہیں۔کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں تعلیم کو اسلامی معاشرے کا سب سے خاص اور بنیادی عنصر تصور کیا جاتا تھا اور بچوں اور بڑوں کی تعلیم پر یکساں توجہ دی جاتی تھی، جس سے آپ کے دور خلافت میں فروغ تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ کئی صدیوں تک قائم رہا یہاں تک کہ مسلمانوں دنیا کی سب سے تعلیم یافتہ اور مہذب قوم بن گئے اور ۱۰۰۰ء تک سائنس وٹکنالوجی اور منطق وفلسفہ اور دوسرے علوم وفنون کے مہارت میں ان کا کوئی ہم سر نہیں رہ گیا۔یورپ کی تعلیمی سائنسی اور تکنیکی ترقی بھی انہیں مسلمان اہل علم ودانش کی مرہون منت ہے۔لیکن آج مسلمان ہی تعلیم کے معاملے میں سب سے پس ماندہ ہے، اس سے زیادہ حیرت وافسوس کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔مغرب کی جدید فکر اور نشاۃ الثانیہ کے روح رواں اور معروف جرمن مفکر مارٹن لوتھر کا قول ہے۔

''کسی قوم کی کامیابی اور سربلندی کا راز یہ نہیں ہے کہ اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے قلعے کتنے مضبوط ہیں؟ بلکہ اس کا تمام انحصار اس بات پر ہے کہ اس قوم کے بیٹے علم اور اخلاق کی تربیت سے کس حد تک بہرور ہیں''۔

عہد حاضر کے ہندستانی مسلمانوں کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ درکار ہے۔انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی، کیونکہ ان کی ہمہ جہت تعلیمی ترقی ہی ان کے سارے امراض کا واحد نسخہ کیمیا ہے، جو آنے والے تیز رفتاری کے دور میں انہیں زندہ اور تابندہ رکھ سکتا ہے اور اس کا کوئی دوسرا متبادل بھی ہے۔اس فاصلاتی طرز تعلیم کے ساتھ ہمیں تعلیم کے سبھی ذرائع اور وسائل کا ہر ممکن استعمال کرنا چاہئے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی ۔ مبارک پور اعظم گڑھ

اصلاح معاشرہ اور ہومیوپیتھی

بزم میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی ہوتا ہے کبھی خاک تریا کی

آج کے معاشرے کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگوں کی ذہنیت زوال آمادہ ہے۔ان کے حرکات وسکنات ،اعمال وکردار افسوس ناک حد تک قابل نفرت نظر آتے ہیں۔مذہب وشریعت کے احکام وتعلیمات سے گریزاں اور صالح اقدار وتہذیب کے حدود وقیود سے آزاد ہوکر زندگی گذارنے کے خواہاں اور اپنی اس خواہش کی طلب وتکمیل میں بے راہ روی اور گمراہی کے راستے پر رواں دواں نظر آتے ہیں۔حد سے بڑھی ہوئی مفاد پرستی،خودغرضی اور ہوا پرستی نے اعلی اخلاق وکردار،شرافت وتہذیب کے شیرازے کو بکھیر رہے ہیں۔اپنے خودساختہ اور خود پسند اغراض مقاصد کے لئے عجیب وغریب،حیرت ناک اور تعجب خیز حربے وطریقے اور ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ اس قہقری چال میں ہر طبقہ کے افراد کی غالب اکثریت شامل نظر آتی ہے،نہ مذہب و جماعت کی انفرادیت،نہ ملک وملت اور قوم کی تقسیم،نہ ان پڑھ کی قید،نہ جدید تعلیم یافتہ میں فرق،نہ علماء وفضلاء کی تخصیص کی جاسکتی ہے،نہ ہی صوفی صافی،جوگی یوگی میں تفریق،نہ راہب وپنڈت اور پیرومرشد اور نہ ہی پروفیسرو ڈاکٹر مستثنی ہیں۔

نشرواشاعت کے اوراق اور اسکرین پر نظر رکھنے والا ہر شخص ہماری باتوں کی تائیدو توثیق کرے گا۔ایسے لوگوں میں بہت کچھ وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں،جو حرام وحلال کی تمیز ہی نہیں کرتے اور اپنے اغراض مقاصد کے حصول کے لئے ہر ناجائز وحرام اور قبیح سے قبیح جرائم وکرائم کرتے ہیں۔ان کی چند شکلیں یہ ہیں۔

(۱) جھوٹ بول کر،حیل وتاویل،تعریض وتوریہ کے ذریعہ

(۲) مکر وفریب، عیاری چال بازی، دغا اور دھوکہ دے کر
(۳) ظاہر داری، تقوی و پرہیز گاری، مذہب و جماعت کا سہارا لے کر
(۴) ذات پات، اشراف رذیل اور اعلی حسب ونسب کو بنیاد بنا کر
(۵) جلن وحسد، تکبر کی وجہ سے حقداروں اور باصلاحیت کے حقوق سلب کر کے
(۶) بے جا احتساب، تنقید و تنقیض، نکتہ چینی وعیب جوئی سے ہراساں وحوصلہ شکنی کرنا
(۷) شاطرانہ چالبازیوں سے فتنہ وفساد اور قتل وغارت کرنا یا کروانا
(۸) جاہ منصب، اقتدار وعہدہ کا ناجائز استعمال اور ہر طرح کی قوت و بالا دستیوں کا استعمال
(۹) بلیک میلنگ، اغوا کرنے اور عزت وعصمت اور عفت پر بٹا لگا کر
(۱۰) حساب وکتاب، ناپ تول میں کمی بیشی، ناواجب ٹیسٹ اور جانچ کروانا اور غلط رپورٹ بنوانا
(۱۱) منشیات، زہریلی ادویات، فحاشیات کے کاروبار کرنا
(۱۲) ہر قسم کی چوری، سرقہ، رہزنی، قزاقی کرنا یا کروانا وغیرہ وغیرہ

ان کج فکری اور کج روی کے اسباب وعلل اور وجوہات کے بارے میں مختلف علم وفن کے ماہرین جو بھی رائے قائم کریں، وہ ان کی صواب دید ہے۔ میری اپنی فکر الگ ہے، میں ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے وابستہ ہوں، اس طریقہ علاج کے اصول ومبادیات میں چار عفونت یا علت تسلیم کئے گئے ہیں۔ پہلی علت کا نام شورا PSORA ہے۔ شورا کا مطلب دماغ میں برے خیالات پیدا ہونا ہے۔ برے جذبات اور احساسات کی تحریک سے مغلوب ہو کر انسان نفس امارہ سے ہار جاتا ہے، تب برے افعال کرتا ہے، پھر تو امراض و تکلیفات میں مبتلا ہو جاتا ہے، گندی مجامعت، غیر فطری فعل سے امراض خبیثہ سے خون میں بگاڑ وفساد پیدا ہو کر موذی اور مہلک بیماریاں ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔

لبالب یہ ہے کہ ذہنی فساد سے ہی انسان حیوان صفت ہو جاتا ہے، یہ مریضانہ ذہنیت ہی ہیں، جن کی نشاندہی نمبر ایک سے ۱۲ تک میں کی گئی ہیں۔ ایسے مریضانہ فطرت کی اصلاح فقط پند ونصائح سے نہیں ہو سکتی، بلکہ ہومیو پیتھک ادویات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان پیتھی ان بے شمار غلط افکار وخیالات، غیر اخلاقی اور غیر شرعی اعمال وافعال سے اجتناب

ونفرت پیدا کرنے کی تاثیر موجود ہے۔

ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس علم میں مہارت پیدا کی جائے تاکہ معاشرے کی اصلاح ہو۔

ذیل میں ان مرضیاتی ذہنیت کی اصلاح کرنے والی دواؤں کا اشاریہ پیش ہے۔

(۱) گالیاں دینا اور سخت رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے: انا کاڈیم، کالی آیوڈ، ہایوسیامس، لائی سین، لیلیئم ٹگ۔

(۲) نفرت اور لاپروائی، عدم دلچسپی کی فطرت کے لئے: سیپیا، فلورک ایسد، ریفے نس، لیک ڈفلوریٹم، کونیم۔

(۳) شک اور بدگمانی کی وجہ سے نفرت ہوتو: ، لیکیےسس، ہایوسیامس، اسٹرامونیم۔

(۴) حسد اور تکبر کی وجہ سے نفرت ہوتو: پلاٹینا، لیکیےسس۔

(۷) دوسروں پر بھروسہ نہ کرنے والوں کے لئے: انا کارڈیم، لائیکو بوڈیم، اورم مٹ، لیکیے سس، ہایوسیامس۔

(۸) جھوٹ بولنے کی بری فطرت کے لئے: اوپیم، کلکریا کارب، سلغر مارفینم۔

(۹) چوری کرنے کی فطرت کے لئے: کلکریا کارب، سلفر، سٹاخی سیگریا، اسٹرامونیم، اوپیم۔

(۱۰) فریب دھوکہ دینے کی فطرت کے لئے: پلمبم مٹ، پلاٹینا، کوکا، کاسٹیم، ہایوسیامس، ٹیرنٹولا ہسپانیہ۔

(۱۱) غرور اور تکبر کی فطرت ہوتو: پلاٹینا، لیکیےسس، لائیکوپوڈیم، پلاڈیم، سلغر۔

(۱۲) مذاق کرنا یا تذلیل کی فطرت ہوتو: پلاٹینا، لیکیےسس۔

(۱۳) نکتہ چینی، عیب جو، نقص نکالنے کی فطرت ہوتو: آرسنک البم، پلاٹینا، لیکیےسس۔

(۱۴) دوسروں کا برا چاہنے والوں کے لئے: لیکیےسس، نکس وامیکا، پلاٹینا، ٹیرنٹولا ہسپانیہ۔

(۱۵) بےحیائی، بےشرمی، فحش مزاجی کی فطر: ہائیوسیامس، فاسفورس، فلورک ایسڈ، انتھرم، اوری گینم۔

(۱۶) عزیزوں وار قریبی لوگوں سے بےرخی: ایسڈ فاس، فلورک ایسڈ، امبرا گریشیا، سیپیا، کونیم۔

(۱۷) اپنے کو اعلی، دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھے: پلاٹینا، لائیکوپوڈیم۔

(۱۸) انتہائی غصہ، تنگ مزاجی: سٹافی سیگریا، نکس وامیکا، فریم مٹ، کالوسنتھ، کالی آیوڈ، آیوڈیم۔

ڈاکٹر سراج احمد انصاری۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد

تعلیم مغربی مفکرین کی آرا کی روشنی میں

تعلیم کی اہمیت ہر قوم اور مذہب وملت میں روزِ ازل سے ہے۔ جب سے انسانی آبادی کا سراغ تاریخوں میں میسر ہے، اس تعلق سے حساس ذہنوں کی خامہ فرسائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ آج سے گذشتہ چودہ سو سال اسلام کا ورود بطورِ دین ہوا۔ خاتم النبین بھیجا گیا اور مقدس کتاب کا نزول ہوا، جس کی شروعات لفظ ''پڑھو'' سے ہوئی۔ اسلام بہت سے نشیب وفراز سے گزر کر ہم تک پہنچا، اعلیٰ سے اعلیٰ علما و مفکرین پیدا ہوئے، جو اس عالم رنگ و بو میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ابتدا سے ہی اسلام ایک جدید، موافقِ انسانیت اور فطری مذہب رہا ہے۔ وقت اور حالات تبدیل ہوئے، تعریفیں بدلیں اور عوام کا رشتہ اصل سے منقطع ہو گیا۔ جو قدامت پسند تھے، جن کی ظلم و جبر سے ایک بڑی تعداد نے اسلام میں عافیت کا گوشہ تلاش کیا، وہ اسلام کے اصول وضوابط پر انگشت نمائی کرنے لگے۔

قرآن ایسی کتاب ہے جو زمان ومکان کی قید سے پاک ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب تحریر کرتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پیغامات زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچے ۔ وہ اس طرح کا اسلوب اور زبان وبیان کا استعمال کرتا ہے کہ با آسانی اس کی رسائی قاری کے ذہنوں تک واقع ہو سکے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ خدائے وحدہ لاشریک نے اپنے پہنچانے والوں کے لیے دستورالعمل مشکل زبان وبیان میں تیار کیا۔ اب تک میں اس مخمصے سے باہر نہیں نکل پایا کہ ایک عام انسان قران کو نہیں سمجھ سکتا۔ مسجدوں میں نماز پڑھانے والے ائمہ حضرات نے ہمشہ عوام کو گمراہ کیا کہ قرآن کا ترجمہ سمجھنے کی کوشش کرنے والے شخص کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ نتیجتاً دستورالعمل ایک ثواب کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ بچوں کو قرآن پڑھایا تو گیا لیکن اسے سمجھنے کی ترکیب نہیں بتائی گئی۔ رفتہ رفتہ حالات یہ پیدا ہو گئے کہ مدارس کے فارغین حضرات بھی

قرآن کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔اب جب وہ خود نہیں سمجھتے تو عوام کی حالت خدا جانے۔ ایسے آیات پر خوب بحث چھڑی جن میں مفکرین کے اختلافات کی گنجائش تھی۔اس کا صلہ ہمیں یہ حاصل ہوا کہ ہم ترجموں اور تفاسیر کی بنیاد پر فرقوں میں منقسم ہو گئے۔

خالقِ دوجہاں نے فرمایا:

ھو الذی انزل علیک الکتاب منهُ آیات امحکمات ھن ام الکتابِ و اُخرُ متشابہٰت۔ فاام الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابه منه البتغاء الفتنة وبتغاء تاویلهِ وما یعلمُ تاویلهُ الا الله۔(سورة آلِ عمران،اٰیت:۷، پارہ:۳)

ترجمہ: وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کی کچھ آیتیں صاف معنیٰ رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے۔وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں، گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو، اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

قرآن مقدس میں واضح مرقوم ہے کہ اس میں صرف دو طرح کی آئتیں، محکمات اور متشابہات ہیں۔جب قرآن کہہ رہا ہے کہ محکمات صاف معنیٰ رکھتی ہیں اور وہی اصل ہیں تو ہمیں سیکھنے اور سمجھنے میں کیا دقت ہے۔خدا عالم الغیب ہے اور طفلِ مکتب کو معاف فرماں دیتا ہے۔اس ناچیز کی ادنیٰ سی گزارش ہے کہ قران کو پڑھنے کے علاوہ سمجھنے پر زیادہ زور دیا جائے۔بچوں کو قاعدہ، یسرن القرآن اور دیگر عربی ریڈنگ بک کے بجائے ایسے کتاب دستیاب کرائی جائیں جس میں عربی ریڈنگ کے ساتھ عربی لرننگ بھی ہو۔مساجد میں ایسے امام منتخب کیے جائیں جو طفلان کو عربی متن کے ساتھ اس کے معنی و مطالب سے بھی آگاہ کریں۔انسانوں کے سارے مسائل کا حل قرآن میں مضمر ہے۔متشابہات پر زیادہ غور وفکر کرنے سے بچیں جس حد تک بات سمجھ میں آتی ہے، ٹھیک ورنہ یہ کہہ کر آگے نکل جائیں کہ خالقِ کائنات زیادہ بہتر جاننے والا ہے۔

ابتدا سے ہی علم کی اہمیت پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔مشرق و مغرب دونوں

اطراف کے مفکرین نے اس کی افادیت کوعوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔کسی نے کہا کہ یہ انسان کی تیسری آنکھ ہےتو کسی نے روح سے تعبیر کیا۔مشرق میں خصوصاً ہندوستان میں بہت سے مدبر پیدا ہوئے جیسے مہاتما گاندھی،مولانا ابوالکلام آزاد،ڈاکٹر ذاکر حسین، بیویکانند، سوامی سنکرا چاریہ،گرونانک دیو،رادھا سروپلی،علامہ اقبال،ربندرناتھ ٹیگور،اے پی جے عبدالکلام وغیرہ،جن کی صلاحیت اورنظریات نے سماج کی بناوٹ اور بناوٹ میں غیرمعمولی تبدیلی رونما کی ہے۔ہماری مذہبی کتب مثلاً قرآن، بیداز، بائبل اوردیگر مذہبی متون میں تعلیم کی قدرومنزلت کوخاص اہمیت حاصل ہے۔

اس مقالے میں ان مشہور مغربی دانشوروں کا ذکر درکار ہے جنھوں نے تعلیم کی فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔مغربی فلسفے کے بابائے اول کہے جانے والے سقراط کے بنائے اصول ونظریات کو ہرعلم وفن کی خاطر اخذ کیا جاتا ہے۔اس نے مخصوص علوم کے لیےنہیں لکھایا کہا بلکہ صاف گوئی سے معاشرے کی بہتری کی واسطے جومحسوس کرتا تھا بیان کردیا۔S.P. Gupta کے مطابق وہ علم کوانسان کی اغلاط کودورکرنے اور سچ کی تلاش کا ذریعہ مانتاہے۔(Dispelling error and discovering truth.)سقراط کا سچ کوئی عام سچ نہیں بلکہ اس دنیااور بنانے والے کی حقیقت کوجاننے اور پہچاننے کا ہے۔

سقراط کے خاص شاگرد پلیٹو نے جس کی کتاب The poetics،جس کے ترجمے کو بوطیقہ سے موسوم کیا گیا،خوب مشہور ہوئی،اس نے کہاعلم ایسی شئی ہے جوانسان کے اندرموجودخوبیوں کو کمال بخشتی ہے۔(Developing the body and the soul of all the perfections which they are capable of.)یعنی ہر شخص کے اندر جسمانی یا روحانی جوہر ہوتا ہے۔ جب تک علم حاصل نہ کیا جائے اندرون میں پوشیدہ ہنرکوتابانی عطانہیں کی جاسکتی۔Desidderius Erasmus نے فرمایاعلم غوروفکر کے مادے میں اضافہ کرتا ہے۔(Developing the real wisdom)یعنی جس قدر انسان کا ذہن علم کی روشنی سے معمور ہوگا اس کی سوچ میں تنوع اوروسعت پیدا ہوگی۔John Locke نے فرمایا:علم صحت مند جسم میں تروتازہ ذہن عطا

کرتا ہے۔(Attainment of a sound mind in a sound body.)
) یعنی جب تک علم کی دولت نہیں ہے فربا اور صحت مند جسم کا کوئی مستحکم وجود نہیں ہے۔
Johann Heinrich Pestalozzi نے کہا، تعلیم انسان کے اندرون میں پوشیدہ طاقت کو فطری، پر امن اور کشادہ ذہن کے طور پر فروغ دیتی ہے۔ (Natural, harmonious and progressive development of innate powers.) یعنی تعلیم یافتہ انسان فطرت سے قریب تر، پرامن اور کشادہ ذہن ہوتا ہے۔
Johann freidrich Herbart کے مطابق علم سے اخلاقیات کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔(Developing morality) یعنی کسی شخص کے مہذب ہونے کی خاطر علم کا حصول شرط اول ہے۔ Herbart Spencer کے مطابق علم مکمل زندگی گزارنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (Prepareing for complete living) جو شخص تعلیم کی زیور سے آراستہ ہوجاتا ہے اس میں پوری زندگی گزارنے کا شوق پیدا ہوجاتا ہے۔

بالا مفکرین کے علاوہ بہت سے ایسے معتبر دانشوران ہیں جن کی آرا کو علم کی افادیت کی خاطر کوٹ کیا جاسکتا ہے۔Confucious، ایک اعلیٰ مفکر جو چین کے لوصوبہ میں پیدا ہوا جس کا مشہور مضمون The Great Learning ہے۔اس نے فرمایا:

The Great learning consists in manifesting the clear character, loving the people and abiding in the highest greed. Those who wish to make their wills sincere would first exted their knowledge.

اعلیٰ تعلیم کی یہ خاص بات ہوتی ہے کہ انسان کا کردار صاف ہوجاتا ہے، دل میں عوام کی محبت پیدا ہوجاتی ہے اور لالچ سے گریز کرنے لگتا ہے۔ جو لوگ اپنی خواہشات کو سچا بنانا چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے اپنے علم کے دائرے کو وسیع کریں۔

کنفیوشش کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ انسان کے دل و دماغ سے قدورت رفع ہوجاتی ہے۔ وہ انسان کی محبت کو اولیت دینے لگتا ہے۔ حرص و طمع سے

پاک ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی یہ چاہے کہ اس کی خواہشات اچھے اور سچے ہوں تو وہ اپنے علم کی حدود میں وسعت پیدا کرے۔ بعد ازاں وہ کہتا ہے کہ علم کی توسیع نئی چیزوں کی تلاش کو اہمیت دیتی ہے۔ نئی اشیا کی تلاش و جستجو علم میں اضافہ کرتی ہے۔ جب علم میں اضافہ ہوتا ہے تو چاہت (Will) سچی ہو جاتی ہے۔ جب چاہت سچی ہو جاتی ہے تو ذہن پاک ہو جاتا ہے۔ جب ذہن پاک ہو جاتا ہے تو ذاتی زندگی ذرخیز ہو جاتی ہے۔ جب ذاتی زندگی ذرخیز ہو جاتی ہے تو خاندان کے لوگوں کے حالات اچھے ہو جاتے ہیں۔ جب کنبے کی حالت بہتر ہو جاتی ہے تو ملک ایک صحیح تناسب میں ہو جاتا ہے۔ اور اگر ملک اچھا ہے تو پوری دنیا میں چین و سکون اور آپسی بھائی چارگی ہونا لازمی ہے۔

Nunn اپنی فکر کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: علم کسی شخص کی مکمل ترقی کا ذریعہ ہے، اور سکت کے مطابق انسانیت کے بہتر ہونے میں اپنی شراکت ظاہر کرتا ہے۔ کوٹ:

"Education is the complete development of the individuality so that he can make an original contribution to human life to his best capacity."

اکثر میں نے اپنے بزرگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ ورثے میں ملی ہر چیز تقسیم ہو جاتی ہے، پر والدین کا دیا ہوا اور اپنی محنت سے حاصل کیا ہوا علم منقسم نہیں ہوتا۔ ہر منفرد شخص کی اپنی کمائی ہے، پس ہمیں یہ چاہیئے کہ تعلیم کی دولت سے سرفراز ہوں اور ایک بہتر معاشرے کی تخلیق کا ضامن بنیں۔

متذکرہ مفکرین کے علاوہ پورا مغرب علمی بیداری سے معمور ہے۔ جس کسی سے بھی اگر تعلیم کے متعلق جاننے کی کوشش کی جائے وہ تعلیم کی پرزور وکالت کرے گا۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ مغربی مفکرین کی آرا سے مکمل طور پر میری آگہی ہو گئی ہے پر اتنا ضرور ہے کہ اس ناقص کوشش نے میرے علم کے دائرے میں ضرور اضافہ کیا ہے۔ علم خدا کی بیش قیمت اور بے بہا نعمت ہے۔ وہ عالم ہے اور علم والوں کو عزیز رکھتا ہے۔ علم ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے طفیل بڑے خوش اسلوبی سے خدا اور اس کی خدائی کی شناخت آسان ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سمیہ تمکین

اکیڈمیک کنسلٹنٹ اردو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی جوبلی ہلز حیدرآباد

قوت تعلیم: ایک مختصراً جائزہ

علم ایک بحر بیکراں کی مانند ہے اس کی مثال ایک ایک ایسے قیمتی موتی کی طرح ہے جو سمندر کی تہہ میں چھپا ہوتا ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے بہت تگ و دو کی ضرورت کرنی پڑتی ہے۔ تعلیم، علم کے قلم رو میں کلیدی رول ادا کرتی ہے اگر تعلیم ساتھ نہ دیں تو علم تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے۔

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

علم کا تعلق خواہ داخلی ہو یا خارجی اس کی ترقی و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا۔ لفظ چاہے بولی کی شکل میں ہو یا لکھا ہوا وہ نسل در نسل علم کی منتقلی کا بہترین سامان فراہم کرتا ہے۔ لکھے ہوے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جیسے جیسے زمانے نے ترقی کی لفظ کے معنی ہی بدل گئے اور وہ جملوں کی شکل اختیار کر گئے۔ اسی مناسبت سے کتابیں لفظوں کا ذخیرہ بنتی چلی گئی اور مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ بھی۔

چوں کہ تعلیم کا موضوع انسانی سیرت اور اس کی زندگی کی تشکیل ہے اس لئے اس کے مطالعہ کے لئے وسعت نظر کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر فنڈ لے اپنی کتاب ''مدرسہ'' میں تعلیم کی تعریف کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے جو نوعمروں کو تمدنی اور زندگی کا اہل بنانے کے لئے بالارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعہ ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے۔'' (خواجہ غلام السیدین۔ اصول تعلیم۔ ص ۵۷)

تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی مخصوص طبقے سے وابستگی ضروری نہیں یہ ایک ایسا ہنر ہے جو ہر کسی کے لئے بے حد ضروری ہے یعنی ''تعلیم ایک ایسی ابر رحمت ہے جو ہر طالب علم پر یکساں برستی ہے''۔ لہذا موجودہ دور میں بچوں کا تعلیم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے' کیوں کہ آج کا بچہ کل کا جوان ہوتا ہے اور ملک وقوم کا معمار بھی۔ ونیز وہ تعلیم کے ذریعے نہ صرف خود کی بلکہ ملک وقوم کی خدمت کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ ماہر تعلیم کے مطابق:

''بچوں کی تعلیم نہایت ہی ضروری ہے۔ یہ جان لیجیے کہ ان کے اندر قدرت کا ایک تعلیمی خزانہ چھپا ہوا ہے جو صرف تعلیم ہی کی کنجی سے کھل سکتا ہے'' (ایم۔نسیم۔اعظمی تعلیمی جہات)

تعلیم پر خرچ کرنا ایسا ہے جیسے ہم اپنی کچھ رقم ہر مہینہ بینک میں جمع کراتے ہیں اور وہی رقم دس' بارہ برس بعد بینک ہمیں لوٹاتا ہے۔ لہذا جو کچھ ہم دس' بارہ برسوں میں بچوں کی تعلیم پر خرچ کرتے ہیں تو اس سے کئی گناہ زیادہ نفع ہم ساری زندگی حاصل کرتے رہیں گے۔ تو قصہ مختصر یہ ہے کہ تعلیم پر خرچ کرنے سے کسی قسم کے مالی نقصان سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا بلکہ تعلیم ایک نفع بخش سامان فراہم کرتی ہے۔

''تعلیم ایک ایسی نہر ہے جس سے خاندان کا ہر فرد سیراب ہوتا ہے' جس سے ہر کوئی مستفیض ہونے کی کوشش کرتا ہے'' یعنی خاندان کا اگر فرد واحد بھی تعلیم حاصل کر لیتا ہے تو وہ پورے خاندان کے لئے قیمتی سرمایہ ثابت ہوتا ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم بے حد ضروری ہے کیوں کہ اگر ایک عورت تعلیم یافتہ ہو تو وہ پورے کنبے کے لئے کفالت کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے ونیز لڑکیوں کی تعلیم کی وجہ سے ''انسانی ترقی کے بنیادی ستون قائم کرنے میں مدد ملتی ہے''

بے علم ہی کو حق ہی نہیں رہنے کا جہاں میں
جیسے تن بے روح کو دبادو کہ جلادو

تعلیم زندگی کے ہر موڑ پر اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا امتحان ہے جس میں ضرو ری نہیں کہ ہر کسی کو کامیابی ملیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ ہر کوئی ناکام ہو۔ بلکہ تعلیم ایک ایسا میدا ن ہے جہاں سچی لگن' محنت' خلوص اور صبر کے ساتھ تعلیمی مراحل کے سنگلاغ وادیوں سے گزرتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی جانب قدم بڑھاتے رہنا چاہئے' کیوں کہ دیگر شعبہ جا ت سے ربط پیدا کرنے کی صلاحیت بغیر تعلیم کے ممکن نہیں۔

علوم تا زہ نئی وسعتیں بھی دیتا ہے
علوم تا زہ سے اپنی اڑان پیدا کر

احادیث شریف سے بھی ظاہر ہے کہ علم کی کتنی بڑی فضیلت ہے مثال کے طور پر یہ حدیث دیکھئے:

''علم حاصل کرو مہد سے لحد تک''

ایک اور حدیث سے مروی ہے:

''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے''

اسلام کی تعلیمات تمام انسانوں کے لئے یکساں ہیں۔ آپ ﷺ نے تعلیم کو اللہ کی نظر میں بہت محبوب قرار دیا۔ اس لئے آپ ﷺ نے سب کو تعلیم حاصل کرنے کی تلقین بار ہا فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے حصول علم کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور تمام مسلمانوں خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تعلیم کا حاصل کرنا بہت ضروری قرار دیا۔

تعلیم کے تعلق سے قرآن مجید میں متعدد آیتیں آئی ہیں۔ سورہ اقراء قرآن مجید کی سب سے پہلی سورۃ ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی وہ پڑھنے کے حکم سے شروع ہوتی ہیں و نیز اسلام میں تعلیم کی جو اہمیت ہے وہ اس بات سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں روشنائی، قلم اور کاغذ جو تعلیم کے حصول کے لئے نہایت ضروری ہے ان کو بڑا درجہ دیا گیا۔ سورہ اقراء میں قلم کا ذکر کیا گیا جو علم کے حصول کے لئے بنیادی رول ادا کرتا ہے۔

تعلیم کے تعلق سے سید امیر علی ''اسپرٹ آف اسلام'' میں ایک حدیث کا مفہوم اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

علم حاصل کرو اس لئے کے جو شخص اللہ کی راہ میں علم حاصل کرتا ہے وہ تقوی اختیار کرتا ہے جو اس کے بارے میں زبان سے کچھ کہتا ہے وہ اللہ کی تعریف بیان کرتا ہے۔ جو اس کی تعلیم دیتا ہے وہ صدقہ ادا کرتا ہے اور جو اسے اس کے مناسب مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے وہ ریاضت کرتا ہے۔ علم اپنے حاصل کرنے والوں کو اس بات کی تمیز سکھاتا ہے کہ کن باتو ں سے منع کیا گیا ہے اور کن باتوں سے نہیں۔ یہ جنت کی راہ میں روشنی کرتا ہے، یہ صحراہ میں ہما

رار فیق بنتا ہے؛؛!!!ا'' (ایضاً ۳۶)

ہر قسم کی تعلیم کے لئے یہ تین اہم بنیادی محور ہیں جس پر تعلیمی عمل کا انحصار ہوتا ہے'

(۱)طا لب علم (۲)تعلیم اور طر یقہ کا ر(۳)ا ستا ذہ یا معلم

۔تعلیم اور تدریس نہ ہی کوئی تجارت ہے اور نہ ہی کوئی دولت پیدا کرنے والی مشین بلکہ یہ نسل درنسل علم وآ گہی منتقل کرنے کا ایک عظیم الشان مشن ہے۔

علم وہ ہے جس سے چونک اٹھے احساس ضمیر
علم خوابوں میں خیالوں میں سرابوں میں نہیں

تعلیم انسانی ترقی' سماجی بھلائی کے ذریعہ فرد کو بااختیار بناتی ہے اور اچھی حکمرانی کرنے میں موئثر رول ادا کرتی ہے۔تعلیم لوگوں کو الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ بہت سی معلومات فراہم کرتی ہے ۔تا کہ فرد اپنے کام اور خاندان کی ذمہ داریوں کو نبھا سکے اور حالات کے مطابق خود کو ڈھال سکے۔

تعلیم ساری قوم کو اس قابل بناتی ہے کہ تعلیم یافتہ شہری اور کام کرنے والے اس بات کے اہل ہوں کہ وہ جمہوری اداروں کو موئثر انداز میں چلا سکیں ۔تعلیم سماجی تبدیلیوں کا ایک اہم ذریعہ ہے یعنی کہ جب کوئی تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ جدید خیالات' تصورات سے آ گاہی حاصل کرتا ہے اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتا ہے اور خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

الغرض میں اپنی بات ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس اقتباس سے ختم کرنا چاہوں گی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے مطابق:

''تعلیم سیاست کی طرح کوئی پہاڑی نالا نہیں ہے جو شور مچاتا ہوا' اچھلتا کودتا کسی دریا میں جا گرتا ہے۔

تعلیم تو ایک خاموش دریا ہے جو مسلسل بہتا رہتا ہے اور آس پاس کی وادیوں کو سرسبز وشاداب کرتا جاتا ہے''

الغرض تعلیم ایک بیش بہا دولت ہے جس سے ہم تمام کو مستفیض ہونا ضروری ہے

جہاں علم وہنر ہے آ گہی ہے ☆ وہیں لوگوں کے ہیں اطوار روشن

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں ۔اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

فارسی کی اخلاقی مثنویوں میں علم کی اہمیت وافادیت

ادبیات فارسی میں خلاقیات کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ شاید ہی کسی زبان کا ادب اس خصوص میں فارسی ادب کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ فارسی نثر میں مقامات حمیدی، قابوس نامہ، کلیلہ و دمنہ، سیاست نامہ، جوامع الحکایات، اخلاق جلالی، اخلاق محسنی، اخلاق ناصری، گلستان، انور سہیلی، روضۃ الخلد، لطائف الطّوائف، بہارستان، پریشان، نگارستان وغیرہ جیسی اخلاق آموز تصانیف منصۂ شہود پر آئیں۔

فارسی شاعری کی ابتداء ہی سے یہ نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ رزم ہو یا بزم مدح ہو یا ذم پند وموعظت وحکمت و اخلاق کے نکات بالضرور شعر فارسی کا خبر رہے ہیں۔لیکن مستقل طور پر اس موضوع پر لکھنے کا آغاز محمد بن محمود بلخی بدیعی کے ''پند نامہ'' سے ہوتا ہے جو کہ نوشیروان کے مسائل اخلاق پر قلمبند خیالات کا ترجمہ ہے۔ بدیعی نے اس کو نظم کا جامہ پہنچایا جو''پند نامہ نوشیرواں'' کے نام سے موسوم ہے اور فارسی علم و ادب کی بہترین یادگار محسوب ہوتا ہے اور اس کے بعد سے اخلاقی شاعری نے مستقل شکل اختیار کر لی۔

اصناف شعری میں تصوف وعرفان اور اخلاقیات کو رواج دینے میں صنف مثنوی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کیونکہ مثنوی ایک ایسی ہمہ گیر صنف ہے جس میں تصوف، فلسفہ اور اخلاق کے مضامین بالتفصیل ادا کئے جاسکتے ہیں اور جو وسعت اس صنف شعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو حاصل نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں اور اسی صنف شعری میں شاعر شاعری کا کمال حسب مراد دکھلاسکتا ہے۔ چنانچہ فارسی شعراء نے اس صنف کو کثرت سے استعمال کیا، لہذا فارسی شاعری میں مختلف موضوعات

وعنوانات کے تحت بے شمار مثنویاں لکھی گئی ہیں جیسے رزمیہ مثنویوں میں گرشاسب نامہ، شاہنامہ، شہنشاہ نامہ، بہران نامہ، سکندر نامہ، بزور نامہ، شہریار نامہ، تیمور نامہ، قیصر نامہ، بہمن نامہ، شام نامہ، فرامرز نامہ وغیرہ۔

بزمیہ مثنویوں کے تحت یوسف وذلیخا، وامق وعذرا، خسرو شیرین، لیلی ومجنوں، ہمای وہمایوں، گل ونوروز، گوہر نامہ، عشاقنامہ وغیرہ

صوفیانہ مثنویوں میں حدیقہ، منطق، الطیر، مثنوی معنوی جام جم، گلشن راز، گوئی وچوگان، شاہ وگدا، ناق وحلوا وغیرہ

اخلاقی مثنویوں میں پندنامے، بوستان، کریما، مخزن الاسرار، روشنائی نامہ، سعادت نامہ، سلسلہ الذھب، سبحت الابرار وغیرہ جیسی شاہکار جیم وضخیم مثنویاں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

فارسی کی چند مشہور اخلاقی مثنویوں کا مختصر تعارف یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شیخ فریدالدین عطار کا ''پندنامہ'' اس موضوع پر ایک بے نظیر مثنوی ہے جس میں حسب ذیل عناوین بیان مخالفت نفس امارہ، بیان حسن حلق بیان مہلکات، بیان اہل سعادت، بیان سبب عافیت، بیان تواضع، بیان دلائل شقاوت، بیان ریاضت، مجاہدات نفس، بیان عقل وعاقلان بیان مذمت خشم وغضب، صفت زندگانی، تعظیم مہمان بیان تقویٰ، علامات نادان، علامات متقی، بیان فوائد خموشی وغیرہ وغیرہ کے تحت آداب معاشرت اور تہذیب واخلاق کے ایسے عمیق اور سودمند مسائل ومطالب بیان کئے گئے ہیں جس سے ہر شخص اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔

نظامی گنجوی نے ۵۷۰ ھجری میں اس موضوع پر ''محزن الاسرار'' لکھی۔ بیس مقالوں پر محیط اس مثنوی میں دو ہزار دوساٹھ اشعار شامل ہیں۔ پند وموعظت اور حکمت و اخلاق کے بہترین نکات سے مملو اس شاہکار مثنوی کی تقلید وتتبع میں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں۔

سعدی شیرازی نے گلستان (نثر) کے علاوہ اخلاقیات کے موضوع پر دو معرکتہ الاراء مثنویاں ''بوستان'' اور'' کریما'' لکھی جو صدیوں درسی نصاب کا جز رہیں۔

بوستان ۶۵۵ ہجری میں لکھی گئی اور یہ حسب ذیل دس ابواب پر محتوی ہے۔ باب اول عدل و انصاف، باب دوم احسان و بخشش، باب سوم عشق و مستی، باب چہارم تواضع و فروتنی، باب پنجم تسلیم و رضا باب ششم قناعت باب ہفتم آداب و تربیت، باب ہشتم شکر بر عافیت، باب نہم توبہ و صواب، باب دہم مناجات۔ بوستان کی کئی شروحات لکھی گئیں جیسے باغستان محمد سعد پٹنوی، تحفہ دوستان،عبید اللہ خویشگی ، بہار بوستان، منشی ٹیک چند بہار، خلدستان مولوی غلام قادر نذیر مدراسی، انہار الاسرار شیخ علیم اللہ حسینی،شرح بوستان نور احمد، عندلیب بوستان سید محمد حسین تمنا مدراسی، شرح بوستان قادری علی،شرح بوستان سعدی حکیم محمد ساجد رامپوری وغیرہ۔

شروحات کے علاوہ بوستان کی کئی ایک فرہنگیں بھی لکھی گئیں اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں بوستان کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

کریما میں سعدی شیرازی نے حسب ذیل عناوین بیان صفت سخاوت بیان مذمت بخیل، بیان صفت تواضع، بیان مذمت تکبر، بیان فضیلت علم، بیان صفت عدل، بیان مذمت ظلم، بیان صفت قناعت، بیان مذمت حرص، بیان صفت طاعت وعبادت، بیان مذمت شیطان، بیان شراب، بیان صفت وفا،فضیلت شکر، بیان صبر، بیان راستی، بیان مذمت کذب وغیرہ کے تحت اصول اخلاق، وادب معاشرت کے مسائل بیان کئے ہیں۔ کریما کے کئی شعراء نے تضمین کی، بعض نیاس کی تخمیس کی اور چند ایک نے اسے مسدس کے روپ میں ڈھالا ہے۔ اس کے علاوہ کریما کی متعدد شروحات جیسے شرح کریما از محمد کامل، دریکتا حافظ محمد نذیر بن حاجی محمد صدیق، فیض کریم از فیض احمد ککروی، معین المبتدی از نصیر الدین بن فقیر عبد اللہ وغیرہ لکھی گئیں اور کریما کی کئی ایک فرہنگیں بھی مرتب کی گئیں۔

سلسلتہ الذہب مولانا نورالدین جامی کی موضوع اخلاق پر ایک بہترین مثنوی

ہے۔ یہ مثنوی مولانا جامی نے نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کے جواب میں لکھی تھی۔اس کے تین دفتر ہیں جو۸۷۳ہجری تا ۸۹۰ہجری کے دوران لکھے گئے ہیں۔اس میں بہت سے فلسفیانہ، عرفانی اورخلاقی مسائل پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ آئین ملک داری، عدل و انصاف، سیاست اور مدنیت وغیرہ پر بھی نہایت حکیمانہ انداز میں بحث کی گئی ہےاور جگہ جگہ سبق آموز تاریخی واقعات و حکایات، قصص سلاطین بطور اشتہاد و استسناد آیات قرآنی اور احادیث نبوی مدلل بیان کئے گئے ہیں۔

سبحۃ الابرار مولانا جامی نے ۸۱۷ھجری میں لکھی۔اس مثنوی میں نہایت لطیف اور نادر حکایات وتمثیلات بیان کی گئی ہیں۔اس مثنوی کو مولانا جامی نے چالیس عقدوں میں تقسیم کیا ہے جومختلف اخلاقی اورعرفانی موضوعات پر مشتمل ہیں جیسے شرح تصوف، مقام توبہ، مقام زھد، بیان صدق، بیان اخلاص، بیان حلم، بیان تواضع، بیان قناعت، بیان سرفقر، بیان صبر وغیرہ پر عقد کی شرح کے بعد اس کے ضمن میں دو ایک حکایتیں بطور تمثیل بیان کی گئی ہیں اور ان تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تہذیب النفس ہے۔

فارسی کے اکابر شعراء مثلاً سنائی، عطار، نظامی، اوحدی، عراقی سعدی، رومی جامی وغیرہ محض شاعر نہ تھے بلکہ صوفی اور عارف بھی تھےاس لئے ان کی شاعری کا اخلاق سے مبرا ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ تصوف کا اخلاق سے نہایت قریبی تعلق ہے لہذا تصوف میں ابتداءہی سے اخلاق کے مسائل شامل ہو گئے تھے۔اس طرح سے فارسی شاعری میں اخلاق کا ایک وسیع سرمایہ اکٹھا ہوگیا وار یہ سب تصوف میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ بے شائبہ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی کی اخلاقی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ فارسی کی صوفیانہ شاعری سے منسلک ہے۔اور یہ ادبی سرمایہ علم کی اہمیت کو اُجاگر بھی کرتا اور تعلیم کی طاقت کا لوہا بھی منواتا ہے۔

توانا بود هر که دانا بود

حکیم شمیم ارشاد اعظمی (ریڈر، اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد، اتر پردیش

آزاد ہند میں طب یونانی کا تعلیمی منظر نامہ

انیسویں صدی سے قبل ہندوستان میں طب یونانی کا مکتبی اور شاگردی نظام تعلیم رائج تھا۔ طبی درسگاہوں کا وجود انیسویں صدی کے آخری دہائی میں شروع ہوا۔ فاضل طبیبوں کے یہاں درس وتدریس کی محفلیں سجتی تھیں۔ اطبا مطب میں طلبا کو عملی مشق کے ساتھ طب یونانی کے نظریات اور تعلیمات سے بھی روشناس کراتے تھے۔ یہاں انہیں نظری وکتابی تعلیم کے ساتھ مطب میں عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ ماہر اطبا طلبا کو علاج ومعالجہ کے اسرار ونکات اور نسخہ نویسی سکھاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی درسگاہوں میں شروع سے ہی طبی کتابیں نصاب تعلیم کا حصہ تھیں۔ یہاں مبادیات طب اور علاج ومعالجہ پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ اتر پردیش کے علاوہ دیگر صوبہ جات کے مدرسہ بورڈ میں بھی فاضل طب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اتر پردیش کے مدرسہ بورڈ میں اب بھی فاضل طب کا نصاب جاری ہے۔ ایک زمانہ میں فاضل طب کی سند سرکاری سطح پر بھی منظور تھی۔

انیسویں صدی کے آخری دو دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی طبی درسگاہوں کی طرف بہی خوان طب نے دھیان دیا۔ اور طبی تعلیم کو عام کرنے کا پروگرام بنایا۔ سب سے پہلی طبی درسگاہ غیر منقسم ہندوستان میں 1872 میں لاہور کے اورینٹل کالج میں شروع ہوئی۔ اس کالج سے حکیم حاذق اور زبدۃ الطب کی سندیں دی جاتی تھیں۔ 1883 میں حکیم عبد المجید خاں نے مدرسہ طبیہ کی بنیاد ڈالی۔ تیسرا مدرسہ طبیہ حیدر آباد میں 1891 میں قائم ہوا۔ 1893 میں حکیم عبدالحق نے امرتسر میں طبی مدرسہ قائم کیا۔ اول الذکر دونوں طبی درسگاہوں نے طبی تعلیم کو نئے تعلیمی نظام کے طور پر پیش کیا۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی حکیم عبد العزیز لکھنوی نے 1902 میں تکمیل الطب کالج قائم کیا۔ 1903 میں نواب سلطان جہاں

بیگم نے اپنی بیٹی آصف جہاں بیگم کی یاد میں آصفیہ طبیہ کالج قائم کیا۔ اسی طرح 1904 میں حکیم احمد حسین نے الہٰ باد میں مدرسہ طبیہ قائم کیا، آج یہ اسٹیٹ یونانی کالج کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ 1904 میں لکھنؤ میں حکیم حسین رضا نے منبع الطب کے نام سے ایک طبی درسگاہ قائم کی۔ 1913 میں مدراس کے اندر قدوسیہ طبیہ کالج قائم کیا گیا۔ حکیم وہاج الحق نے 1914 میں لکھنؤ میں طبیہ وہاجیہ قائم کیا۔ حکیم سید ابراہیم کی کوششوں سے گیا میں 1923 میں مدرسہ طبیہ قائم ہوا۔ 1925 میں شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں نے مہاراجہ پٹیالہ بھوپ اندرا سنگ کے نام پر بھوپ اندرا طبیہ کالج پٹیالہ قائم کیا۔ ان کے علاوہ آزادی سے قبل قائم ہونے والے طبیہ کالجوں کی طویل فہرست ہے۔ ان کالجوں نے طبی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے پوری کوششیں کی ہیں۔ شروع میں ان درسگاہوں میں خالص یونانی مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے سب سے پہلے قدیم مضامین کے ساتھ نصاب میں جدید مضامین کو شامل کر کے طبی نصاب تعلیم کو زمانہ سے ہم آہنگ کیا۔ حکیم اجمل خاں کی یہ کوشش تھی کہ اطبا طبی تعلیمات اور طب کے بنیادی نظریات کے ساتھ جدید طبی تعلیمات و نظریات سے بھی واقف ہوں۔ اسی طرح نصاب تعلیم میں قدیم طبی کتب کے ساتھ جدید معلومات اور انکشافات کا بھی اضافہ کرتے رہیں۔ حکیم حافظ اجمل خاں نے 1925 کی ایک تقریر میں کہا کہ۔ ''جب آپ تحقیقات کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سدیدی، نفیسی، حمیات قانون وغیرہ آپ کے لیے کافی نہیں۔ آپ کو پرانی کتب کی کھوج اور تلاش کر کے جدید تحقیقات کے ساتھ ملا کر نیا کورس بنانا ہوگا۔''

حکیم اجمل خاں نے طبی علوم میں تحقیق کے لیے جولائی 1926 میں ریسرچ و تحقیق کا شعبہ قائم کیا۔ دیسی طبوں میں ریسرچ و تحقیق کا قائم ہونے والا یہ سب سے پہلا شعبہ تھا۔ آپ نے طب کی علمی تحقیق کے ساتھ ادوویہ کی تاثیر اور افعال وخواص کو سائنٹفک طور سے پیش کرنے کے لیے علاحدہ سے ریسرچ و تحقیق کا شعبہ قائم کیا اور ڈاکٹر

سلیم الزماں کو اس کا ڈائریکٹر بنایا۔ اس شعبہ کا مقصد مفرد و مرکب ادویہ کا کیمیاوی وتجزیاتی مطالعہ پیش کر کے ان ادویات کو معیاری بنانا تھا۔

آزادی کے بعد علیگڈھ میں حکیم عبد اللطیف فلسفی کی کوششوں سے 1955 میں ڈپارٹمنٹ آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن قائم ہوا۔ جس میں حکیم افہام اللہ نے ریسرچ آفیسر کے طور پر کام کیا تھا۔ یہ شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے طب یونانی میں ریسرچ وتحقیق اور پوسٹ گریجوٹ کا باقاعدہ شعبہ قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ بعد میں یہ خواب 1972 میں شرمندہ تعبیر ہوا جب اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبہ علم الادویہ میں پوسٹ گریجوٹ تعلیم کا آغاز ہوا۔

آزادی کے بعد طب یونانی میں ریسرچ وتحقیق کے لیے اطبا حکومت کی سرپرستی چاہتے تھے۔ کیونکہ 1952 میں حکومت ہند نے دیسی طریقہ علاج میں تحقیق کے لیے جام نگر میں آیورویدکا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تھا۔ طب یونانی کے بہی خواہان کا حکومت ہند سے مستقل اصرار تھا کہ آیورویدک کی طرح یونانی کا بھی علاحدہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہو نا چاہیے۔ چنانچہ اطبا کی کوششیں رنگ لائی اور 1971 میں حیدرآباد میں طب یونانی کا سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (CRI) قائم ہوا۔ پھر 1969 میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی کا قیام عمل میں آیا۔ یونانی طب میں ریسرچ کا بنیادی کام اسی کونسل سے شروع ہوا لیکن 1979 میں جب یونانی طب کی تحقیقات سے متعلق علاحدہ کونسل کا قیام ’سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن‘ کے نام سے ہوا تو اس سے یونانی طبی تحقیقات کی رفتار میں تیزی آئی۔ 1972 میں اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبہ علم الادویہ میں پوسٹ گریجوٹ کے بعد نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد میں بھی پوسٹ گریجوٹ کا شعبہ قائم ہوا۔ علیگڈھ اور حیدرآباد کے علاوہ کئی کالجوں اور انسٹی ٹیوٹ میں پوسٹ گریجوٹ کی تعلیم کا سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ہمدرد طبی کالج ، دہلی ، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ ، دہلی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن ، بنگلور جیسے سرکاری اداروں میں پوسٹ گریجوٹ کی سطح

پر تعلیم و تحقیق اور درس و تدریس کا انتظام ہے وہیں پرائیوٹ کالجوں میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا طبیہ کالج ممبئی، محمدیہ طبیہ کالج، جامعہ طبیہ دیوبند اور زلیخا بائی یونانی میڈیکل کالج، پونہ جیسے پرائیوٹ اداروں میں بھی پوسٹ گریجوٹ کی تعلیم رائج ہے۔ پرائیوٹ کالجوں میں پوسٹ گریجوٹ کی سطح کی تعلیم کے سلسلہ میں بعض طبی دانشوران نے غیر اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔

گریجوٹ اور پوسٹ گریجوٹ سطح کے پورے ہندوستان میں تقریباً پچاس کالج ہیں۔ جن میں گیارہ کالجز ایسے ہیں جنھیں سرکاری سر پرستی حاصل ہے۔ سرکاری کالجوں میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ ،دہلی (1883)، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ (1902)، اسٹیٹ یونانی طبیہ کالج ،الہٰ آباد (1904) ،گورنمنٹ طبی کالج ،پٹنہ (1926) ،اجمل خاں طبیہ کالج علیگڈھ (1927)، ہمدرد طبی کالج دہلی (1933) ،گورنمنٹ نظامیہ طبیہ کالج ،حیدرآباد (1938) ،گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج ،بنگلور (1975)، گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج چنئی (1979)، حکیم سید ضیاء الحسن یونانی میڈیکل کالج ،بھوپال (1998) نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن ،بنگلور (2004) کے نام شامل ہیں۔

آزادی سے پہلے قائم ہونے والے طبی کالجوں میں آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج ،دہلی (1883) اسٹیٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ (1902) اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج ،الہٰ آباد (1904) راجپوتانہ یونانی میڈیکل کالج ،جے پور (1926)، گورنمنٹ طبی کالج ،پٹنہ (1926)، اجمل خاں طبیہ کالج، علیگڈھ (1927) ،گورنمنٹ نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد (1938) کے نام قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد قائم ہونے والے طبی کالجز میں سب سے پہلا کالج ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج، کرنول (1953) ہے۔ سیفیہ حمیدیہ یونانی کالج ،برہان پور (1962)، جامعہ ہمدرد ،دہلی (1933/1963) انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ

والاطبیہ کالج ممبئی (1970) ،گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج ،بنگلور(1975) ،گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج چنئی (1979) ،ذوالفقار حیدر یونانی میڈیکل کالج ، سیوان(1979)،راجستھان یونانی میڈیکل کالج ،جے پور(1980)،ابن سینا طبیہ کالج ،اعظم گڈھ(1981)،محمدیہ طبیہ کالج اینڈ اسائرہ ہاسپٹل ،مالیگاؤں(1981) ،سلفیہ یونانی میڈیکل کالج دربھنگہ (1981)زلیخا بائی یونانی میڈیکل کالج ،پونہ(1984)،نظامیہ یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل ،گیا(1984)جامعہ طبیہ دیوبند (1987) ،لقمان یونانی میڈیکل کالج ،بیجا پور(1996) ،دیوبند یونانی میڈیکل کالج ،دیوبند(1996)،علامہ اقبال یونانی میڈیکل کالج ،مظفرنگر(1992) ،کلکتہ یونانی میڈیکل کالج ،کلکتہ (1993)احمد غریب یونانی میڈیکل کالج ،نندور(1996)،الفاروق یونانی میڈیکل کالج ،اندور(1997)،سید ضیاء الحسن گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج ،بھوپال(1998)،حکیم ٹیپو سلطان یونانی میڈیکل کالج ،گلبرگہ(1998)،ایچ۔ایم۔ایس،یونانی میڈیکل کالج ،ٹمکور(1998)انسٹی ٹیوٹ آف انسینٹ میڈیکل سائنس ،جموں اینڈ کشمیر(1998)،کشمیر طبیہ کالج ،ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سنٹر(1999)،علیگڈھ یونانی میڈیکل کالج ،علیگڈھ(1999)، اقرا یونانی میڈیکل کالج ،جلگاؤں (2000)،محسن ملت یونانی میڈیکل کالج ،چھتیس گڈھ(2002)،حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج ،دیواس (2002)،شمع غوثیہ یونانی میڈیکل کالج ،غازیپور (2000)،نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن ،بنگلور(2004)،ارم یونانی میڈیکل کالج ،لکھنؤ (2006)،ڈاکٹر عبدالعلی طبیہ کالج ،ملیح آباد ،لکھنؤ (2007)،یونس فضلانی یونانی میڈیکل کالج اینڈ فضلانی یونانی ہاسپٹل ،اورنگ آباد(2009)،حکیم رئیس یونانی میڈیکل کالج ،سنبھل اترپردیش (2010)،غوثیہ یونانی میڈیکل کالج،فتح پور کانپور،العارف یونانی میڈیکل کالج،حیدر آباد،مرکز یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل،کیرلا،اترانچل یونانی میڈیکل کالج،اترا

کھنڈ،الحیات یونانی میڈیکل کالج ،لکھنؤ، یونانی کالج ،متھرا وغیرہ عصر حاضر میں طب کی تعلیم وتدریس اور فنی فروغ میں سرگرم عمل ہیں۔

آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد قائم ہو کر بند ہونے والے کالجوں کی بھی تعداد کم نہیں ہے۔ان میں کچھ ڈگری سطح کے کالج تھے اور کچھ میں ڈپلومہ کی تعلیم رائج تھی۔اول الذکر کالجوں میں ذبیریہ طبیہ کالج ،جے پور(1978)،تاج طبیہ کالج ،ناگپور(1990)۔ رشاد یونانی میڈیکل کالج ،اعظم گڈھ(1972)مؤخر الذکر کالجوں میں بھارت طبیہ کالج ،سہارنپور(1929)،جامعہ طبیہ دار العلوم ، دیوبند(1962) سہارنپور طبیہ کالج ،سہارنپور(1984)،فخر الدین علی احمد طبیہ کالج ،مظفرنگر(1991)اجمل خاں طبیہ کالج ،مظفرنگر قابل ذکر ہیں۔

عصر حاضر میں طبی یونانی کی درسگاہوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی تعداد پچاس تک پہونچنے کو ہے۔کسی بھی فن کو معیاری اور مفید بنانے میں اس فن کا نصاب تعلیم بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔زمانہ قریب میں فائنل ایر میں نسخہ نویسی سے متعلق ایک بہت اہم مضمون شامل نصاب تھا،مگر نہ جانے کیوں اسے نصاب سے خارج کر دیا گیا۔اس مضمون کو نہ صرف یہ کہ دوبارہ نصاب میں شامل کرنا چاہئے بلکہ اس پر علاحدہ سے ورکشاپ بھی کرنا چاہئے۔ادویہ مفردہ میں تین سو سے زائد دوائیں نصاب میں شامل ہیں،اس میں پچاس فیصد دوائیں ایسی ہیں جو ہندستان میں نہیں پائی جاتی ہیں ،ایسی دواؤں کو نصاب میں شامل کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہے۔مختلف نظامہائے جسم سے متعلق چنندہ دواؤں کا انتخاب کیا جائے۔ان ادویہ کی تعداد 150 سے 200 سے زیادہ نہ ہو،تا کہ بآسانی ان ادویہ کی کاشت کی جا سکے اور طلبا کو ادویہ کے افعال و خواص کے ساتھ ان کی شناخت بھی کرائی جا سکے۔ ادویہ کے ساتھ اغذیہ (Nutrition) کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔اسی طرح معالجات کے نصاب میں ان امراض کا اضافہ کیا جائے جن کا ذکر قدیم طبی کتب میں نہیں ہے۔کلیات امور طبیعیہ کے

مضمون پر خاص توجہ دی جائے ،کیونکہ یہ مضمون طب کا اساسی اور نہایت اہم مضمون ہے۔یہ مضمون علاج و معالجہ کے لئے انتہائی اہم ہے۔ دانشوران فن کو چاہئے کہ وہ خالص طبی نصاب تیار کریں ،جس میں ایلوپیتھی کتب کی شمولیت صرف طب قدیم کے مفاہیم کو سمجھنے میں معاون ہو۔پوسٹ گریجوٹ سطح ریسرچ کے معیار کو بلند کیا جائے۔ ریسرچ وتحقیق کے لئے یونانی میتھا ڈولوجی تیار کیا جائے۔ریسرچ کے لئے ان دواؤں اورامراض کومنتخب کیا جائے جن کی آج زیادہ ضرورت ہے۔غیر مدونہ امراض جیسے ایڈز و کینسر پر کام کیا جائے۔طبی نظریات پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کی جائے۔مفرد و مرکب دواؤں کی افادیت کوتحقیق کے ذریعہ اجاگر کیا جائے۔علاج بالتدبیر طب یونانی کا مابہ امتیاز سرمایہ ہے،ان کے ذریعہ علاج و معالجہ کو عام کیا جائے۔عصر حاضر میں حجامت کی طرف اطبا کا رجحان ایک اچھی بات ہے مگر طب یونانی کوصرف حجامت تک محدود کر دیا گیا ہے۔اس کی بڑی وجہ اساتذہ اور معالجین کا یونانی نظریات اور علاج و معالجہ کے اسرار ورموز سے عدم واقفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا کا رجحان جدید طب کی طرف بڑھتا جارہا ہےاورطب یونانی اپناوقاراورمقبولیت کھوتی جارہی ہے۔آج طبیہ کالجز کے بیشتر فارغین ایلوپیتھی میں پریکٹس کرتے ہیں۔بہت کم طلبا یونانی مطب کرتے ہیں۔گورنمنٹ کالج سے فارغ کچھ طلبا یونانی مطب کی طرف اب دلچسپی ظاہر کرنے لگے ہیں،مگر یہ تعداد بہت کم ہے۔طب یونانی کے وقار اور معیار کو بحال کرنے کے لئے اساتذہ اور دانشوران فن کو بھی محنت کرنی پڑے گی۔کلاسوں کے علاوہ سیمنار اور ورکشاپ کے ذریعہ طب یونانی سے متعلق خوداعتمادی اورایمانداری کے ساتھ اپنے تجربات شیئر کرنے ہونگے ، ماضی قریب کے معالجین کے علاج و معالجہ سے متعلق مستنداور معیاری واقعات اوران کے تجربات سے طلبا کوروشناس کرانا پڑے گا۔طب یونانی کے نظریاتی تعلیمات کا مطالعہ وسیع کرنا پڑے گا۔اس سے طلبا کے اندرخوداعتمادی پیدا ہوگی ،انہیں ایک نیا حوصلہ ملے گا اورطب یونانی درخشاں ماضی کی طرح حال اور مستقبل کی روشن اورنمائندہ پیتھی ہوگی۔

ڈاکٹر عرشیہ جبین ۔اسوسیٹ پروفیسر،شعبہ اردو،یونیورسٹی آف حیدرآباد،حیدرآباد،۴۶۔

نذیر احمد کا تصور تعلیم نسواں

علم کا جاننا اور سیکھنا ہر کسی کے لیے ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر ہر مذہب میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مذہب اسلام میں اس طرف خصوصی توجہ دی گئی۔قرآن کی پہلیسورۃ''سورہ خلق''میں بھی پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔تعلیم کی اہمیت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول بھی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے فرمایا تھا:

''اگر تعلیم حاصل کرنے کے لیے تمہیں چین تک جانا پڑے تو ضرور جاؤ۔''

اسلامی ممالک سے چین چوں کہ اس زمانے میں کافی دور تھا اس لیے تعلیم کی اہمیت بتانے کے لیے چین کی مثال دی گئی تھی۔علم کا حاصل کرنا مرد اور عورت دونوں کے لیے ضروری ہے۔نہ صرف مردوں کی تعلیم سے زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے بلکہ عورت کا تعلیم یافتہ ہونا بھی ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے بہتر ہوتا ہے کیوں کہ تعلیم ہی ایک ایسا حربہ ہے جس سے جہالت اور کم عقلی کے سے پیدا ہونے والے مسائل کو دور کیا جا سکتا ہے۔اور چوں کہ عورتوں میں اس کی وجہ سے کئی عیب در آتے ہیں اس لیے عورتوں اس کے حاصل کرنے کی طرف ہمارے ادیبوں نے بھی توجہ کی ہے۔اردو ادب میں نذیر احمد وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے تعلیم نسواں کا پرچم بلند کیا تھا نذیر احمد چوں کی تعلیم کے قدرداں تھے اسلامی تعلیمات اور مذہبی و دینی ماحول میں ان کی پرورش اور ذہنی تربیت ہوئی تھی اس لیے ان کے نزدیک بھی تعلیم کی خاصی اہمیت تھی۔ساتھ ہی اس عہد کے حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے جہاں ایک طرف پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی شکست نے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو معاشی طور پر بدحال کر دیا تھا تو دوسری طرف مرد اور عورت دونوں میں تعلیمی پستی اور جہالت کی وجہ سے کئی ایک اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی تھی۔کئی دانشور اور سماجی مصلح خواتین پر ہو رہے مظالم کے خلاف کھل کر آواز بھی اٹھا رہے تھے،کئی سیاستداں جیسے

بدرالدین طیب جی مسلمانوں کی تعلیمی وتہذیبی بیداری کی کوششوں میں مصروف تھے۔ایسے ماحول میں نہ صرف تعلیم بلکہ بے شمار سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج بھی ہونے لگے۔سرسید احمد خاں اوران کے رفقانے بھی اس سلسلے میں اپنی تحریروں کے ذریعے نوجوانوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنے کی کوششوں میں جٹ گئے۔ان میں ایک اہم نام نذیراحمد کا بھی تھا نذیراحمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کی پستی اور بے چارگی کو صرف علم کی روشنی کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔نذیراحمد نے مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، رویائے صادقہ اور ایامیٰ جیسے ناوللکھ کر معاشرتی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔انھوں نے اپنے ناولوں میں نہ صرف اس عہد کے معاشرے کی خرابیوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کردیں بلکہ تعلیم نسواں اور خانگی زندگی کے مسائل کی یکسوئی کی طرف ہماری توجہ مبذول بھی کرائی۔نذیراحمد کا عہد ایک طرف کئی ایک اخلاقی خامیوں کا عہد تھا تو دوسری طرف اس معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا نذیراحمد نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت او ران کی اخلاقی تربیت کی طرف توجہ دے کر اس سلسلے میں پہل کی۔کیوں کہ نذیراحمد عورتوں کی تعلیم کو معاشرے کے سدھار کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔تعلیم کے حصول کا مقصد صرف نوکری کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ گھریلو بلکہ معاشرتی مسائل کی یکسوئی کے لیے تعلیم ہی ہماری رہنمائی و مدد کرتی ہے اس لیے اس کا حاصل کرنا ہر فرد کے لیے ضروری ہے خصوصاً عورتوں کے لیے کیوں کہ وہ اپنی تعلیم کی بدولت سلیقہ منداور بہتر زندگی گذار سکتی ہیں۔

عصری تعلیم و ہنرمندی کی طرف ہندوقوم کے برخلاف مسلمان دانشور تذبذب کا شکار رہے۔یہاں تک کہ سرسید کی تعلیمی اصلاحی کی کوششیں صرف مردوں تک ہی محدود تھیں۔چونکہ اس عہد میں اکثر نوجوان انگریزوں سے متنفر تھے اور اسی نفرت کی وجہ سے مغربی علوم سیکھنے کو عار سمجھتے تھے۔ایسے وقت سرسید احمد خاں مغربی علوم وفنون سیکھنے پر زور دے رہے تھے اس سلسلے میں انھیں بے پناہ مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔یہی وجہ تھی کہ وہ اس تناظر میں خواتین کی تعلیم کو قبل از وقت تصور کر رہے تھے۔چنانچہ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔:

''میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جائے۔مگر موجودہ حالت میں کنواری عورت کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا ہے اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے عورت کی تعلیم قبل از وقت ہونے مردوں کے لئے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفت درماں ہے۔یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورتوں کی تعلیم کے لئے کچھ نہیں کہا''۔ ؎۱۰

(خط بنام مولوی ممتاز علی، سرسید اور ان کا عہد، ص ۳۵۷۔۳۵۶، بحوالہ مطالعات نسواں ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۲)

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے عورتوں کی تعلیم کو دوسرے درجہ پر رکھا کیونکہ وہ سماج کو مغربی طرز زندگی کی خرابیوں سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔مغرب میں تعلیم کو صرف اور صرف ذریعہ معاش کے لئے حاصل کیا جاتا رہا ہے۔اس لیے ممکن ہے سرسید عورتوں کو عصری تعلیم دلا کر ملازمت کی مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔جیسا کہ سرسید کا خیال تھا جب مسلم معاشرہ کے مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں گے پھر خواتین کو بھی تعلیم کی خواہش پیدا ہوگی۔جبکہ نذیر احمد کے نظریات اور تصورات سرسید سے مختلف تھے وہ مرد اور عورت دونوں کی تعلیم کے حق میں تھے اور دونوں کی تعلیم کو وقت کی اہم ضرورت تسلیم کرتے تھے۔نذیر احمد کے نظریات کو واضح کرتے ہوئے سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اس دور کے لوگوں میں نہ تو نئی تعلیم سے پوری طرح ٹکر لینے کا حوصلہ ہے اور نہ اسے نظر انداز کرنے کی ہمت، نہ مذہب کو محض عقیدے کے قلعے میں بند رکھنے میں آسودگی ہے نہ اس کو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر کسنے کی جرأت۔نذیر احمد اسے خوب سمجھتے تھے کہ نئے سماجی ماحول میں مذہب خاندانی وقار کے رکھ رکھاؤ، پرانی اور نئی تعلیم میں توازن قائم کرنے کی کیا صورت ہوگی۔اس کشمکش کے سمجھنے ہی کے سلسلے میں، اصغری، نصوح، کلیم، مرزا ظاہر دار بیگ، ہریالی، مبتلا، مولانا عارف، حجتہ لاسلام اور ابن الوقت کے کردار ابھرتے ہیں۔''

(سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ)

اس طرح نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی

۔انھوں نے اپنا پہلا ناول تو اسی غرض سے لکھا کیوں کہ جس وقت نذیر احمد ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس دوران انہیں اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کی تعلیم کی فکر رہا کرتی تھی۔لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اس وقت کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جسے وہ دلچسپی سے پڑھے اور ان کی اخلاقی و مذہبی تعلیم بھی ہوجائے چنانچہ اسی غرض سے نذیر احمد نے ناول ''مراۃ العروس'' لکھی۔انھوں نے اپنی بڑی بیٹی سکینہ کے لیے کتاب لکھنی شروع کی دو چار صفحے لکھ کر اسے دے دیتے تھے چار، پانچ روز میں وہ پڑھ لیتی تو پھر آگے لکھ کر دیتے۔اس طرح انھوں نے باقاعدہ ناول لکھنے کی غرض سے کتاب نہیں لکھی تھی بلکہ انھوں نے بچوں کی تعلیم وتربیت کی غرض سے پہلے کیا تھا کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو سبق آموز بھی ہو اور دلچسپ بھی اور تعلیم کی افادیت بھی ظاہر کرے۔

خود ناول ''مراۃ العروس'' کو لکھنے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''خاندان کے دستور کے مطابق میری لڑکیوں نے بھی قرآن شریف،اس کے معنی اور اردو کے چھوٹے چھوٹے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے،گھر میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا تھا۔میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک طرح کی خاص رغبت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دل افسردہ،ان کی طبیعتیں منقبض اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں،تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق ونصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج روئی کی وجہ سے ہمیشہ ان میں مبتلائے رنج ومصیبت رہا کرتی ہیں،ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کسی قدر دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے،طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتا پر نہ ملا۔تب میں نے اس قصہ کا منصوبہ باندھا۔''

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس،کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا،۲۰۰۳ء،ص ۳۔۴)

ان کی ناول نگاری کا مقصدلڑکیوں میں تعلیمی شعور کو بیدار کرنا تھا۔ نذیر احمد کا خیال تھا کہگھریلو زندگی کی مسرت قومی ترقی میں بہت بڑی حدتک ممدومعاون ہوسکتی ہے۔اس غرض کے لیےانہوں نےعورتوں کوبہتر زندگی تعلیم کوضروری سمجھااوراس کی اہمیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔اپنے ناول ’’مراۃ العروس کے ذریعےانھوں نے ایک تعلیم یافتہ اور دوسری جاہل دو بہنوں کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کس طرح اصغری جیسی تعلیم یافتہ عورتیں اپنے اخلاق اورخوش سلیقگی سے اپنے گھر کو جنت بنائے رکھتی ہیں اوراپنے شوہروں کوزندگی کو بہتر بنانے اور ملازمت میں ترقی کرنے کے گر سکھاسکتی ہے۔اوراسی طرح تعلیم نہ حاصل کرنے کی وجہ سے اکبری جیسی عورتیں اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے نہ صرف خودتکلیف اٹھاتی ہیں بلکہ اپنےشوہر کی زندگی بھی عذاب بنا دیتی ہیں اورانھیں زندگی میں ترقی کرنے سےمحروم رکھتی ہیں۔کیوں کہ نذیر احمد جانتے تھےعورتوں کی اس بے وقعتی کا سبب جہالت کے سوا اور کچھ نہیں ، معاشرتی زندگی میں تعلیم اور جہالت، ہنرمندی اور بے ہنری کےنتائج دکھانے کی غرض سے نذیر احمد نے اکبری اوراصغری کی زندگیوں کے دومثالی کرداروں کے رومیں پیش کیا۔

تعلیم کے بارے میں نذیر احمد کا تصورتھا کہ اتنی تعلیم ہرعورت کے لیے لازمی ہے جس سے وہ اپنے گھریلوفرائض کوسرانجام دینے کے لائق بن سکے۔اس تعلیم میں سینا پرونا، کھانا پکانا، پڑھنا لکھنا،حساب کتاب وغیرہ بنیادی اہمیت کی چیزیں ہیں۔لیکن نذیر احمد کے نزدیک عورت کا دائرہ عمل صرف خانہ داری کےمعمولی انتظامات تک محدودنہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے اپنے شوہر کی دکھ سکھ کی ساتھی اور زندگی کے تمام معاملات میں اسکی بہترین ساتھی ، مشیرومعاون بھی ثابت ہونا چاہیےاور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عورت تعلیم یافتہ ہوگا۔مراۃ العروس کے دیباچے میں نذیر احمد نے عورت اور مرد کو گاڑی کے دوپہیے بتاتے ہوئےعورتوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ علم حاصل کر کےعورت کوکس طرح خوشی اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔چنانچہ فرماتے ہیں:

''اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی، جب تک ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی مردوں کو روپیہ کمانے سے اتنا وقت نہیں بچتا کہ اس کو گھر کے کاموں میں صرف کریں۔ اے لڑکو! وہ بات سیکھو کہ مرد ہو کر تمہارے کام آئے اور اے لڑکیو! ایسا ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اس سے خوشی اور فائدہ ہو۔''

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص ۸)

نذیر احمد جانتے تھے کہ عورتیں اپنی جہالت کی وجہ سے تعلیم کو اہمیت نہیں دیتی تھی اور خود کو کمتر اور بے ہنر رہنا ہی اپنا مقدر جانتی تھیں ایسی ہی عورتوں کو سمجھاتے ہوئے وہ ملکہ وکٹوریہ کی مثال دیتے ہیں کہ عورت ذات ہو کر انھوں کس طرح سلطنت کا سارا انتظام سن کتنی ناموری اور عمدگ کے ساتھ سنبھالا کہتے ہیں:

ملکہ وکٹوریہ کو دیکھو عورت ذات ہو کر کس دھوم اور کس شان اور کس ناموری اور کس عمدگی کے ساتھ اتنے بڑے ملک کا انتظام کر رہی ہیں ک دنیا میں کسی بادشاہ کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔''

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص ۸)

نذیر کے عہد میں بہت کم عورتیں تعلیم حاصل کرتی تھیں کیوں عورتوں کا یہی خیال ہوتا تھا کہ علم حاصل کر کے ہمیں نوکری تو نہیں کرنی ہے تو پھر اسے حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن نذیر احمد کا ماننا یہ تھا کہ اگر علم صرف نوکری کے لیے نہیں حاصل کیا جاتا بلکہ علم سے انسان کو دوسرے فائدے بھی پہنچتے ہیں۔ لیکن جو عورتیں صرف نوکری حاصل کرنے کا ذریعے ہی سمجھتی ہیں ایسی عورتوں کو نادان تصور کرتے ہوئے ان کی غلط فہمی کو یوں دور کرتے ہیں:

''بعض نادان عورتیں خیال کرتی ہیں کہ کیا لکھ پڑھ کر ہم مردوں کی طرح نوکری کرنی ہے لیکن اگر کسی عورت نے لکھ پڑھ لیا ہے اور اس نے نوکری نہیں کی تو اس کا لکھنا پڑھنا اکارت بھی نہیں گیا۔ اس کو اور بہتر ے فائدے پہنچے جن کے مقابلے میں نوکری کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ جو لوگ علم کو صرف نوکری کا وسیلہ سمجھ کر پڑھتے ہیں ان کو علم کی قدر نہیں۔ سچ

پوچھو تو علم کے آگے نوکری ایسی ہے جیسے سودے کے ساتھ روگھن۔''

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص ۸)

بعض خواتین اپنی لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کو گناہ تصور کرتی ہیں ایسی عورتوں کی کم عقلی پر نذیر احمد نہ صرف حیران ہوتے ہیں بلکہ انھیں طرح طرح سے سمجھاتے ہیں کہ علم کے حاصل کرنے سے اخلاق بگڑتے نہیں بلکہ سنورتے ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''اکثر عورتوں کے لکھانے پڑھانے کو عیب اور گناہ خیال کرتی ہیں۔ان کو خدشہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو لکھنے پڑھنے سے عورتوں کی چار آنکھیں ہو جائیں۔لگیں غیر مردوں سے خط و کتابت کرنے اور خدانخواستہ کل کلاں کو ان کی پاکدامنی اور پردہ داری میں کسی طرح کا فتور واقع ہو۔یہ صرف شیطانی وسوسے ہیں اور ملک کی خصوصاً عورتوں کی بدقسمتی لوگوں کو بہکا اور بھڑکا رہی ہے۔''

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص ۹)

نذیر احمد نہ صرف اپنے دیباچے میں ان خواتین کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو علم کے حاصل کرنے کو محض نوکری حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کرتیں یا پھر علم کے حاصل کرنے کو اخلاق کے بگاڑ کی وجہ تصور کرتیں تھیں بلکہ انھیں مثالوں کے ذریعے بھی سمجھایا کہ پڑھنے لکھنے سے انسان کے اخلاق بہتر ہوتے ہیں اور علم سے ہی ہماری بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔دنیا کا تجربہ جو مرد باہر جا کر حاصل کر لیتا لیکن عورتیں گھر بیٹھے مختلف کتابیں پڑھ کر حاصل کر لیتی ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''پس سوائے پڑھنے کے اور کیا تدبیر ہے تمہاری عقلوں کو ترقی ہو؟ بلکہ مردوں کی نسبت عورتوں کو پڑھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔مرد تو باہر کے چلنے پھرنے والے ٹھہرے ۔لوگوں سے مل جل کر بھی تجربہ حاصل کر لیں گے۔تم گھر میں بیٹھی بیٹھی کیا کرو گی؟ سینے کی بقچی سے کیا کرو گی؟ سینے کی بقچی سے عقل کی پڑیا نکال لو گی یا اناج کی کوٹھری سے تجربے کی جھولی بھر لاؤ گی؟ سینے کی بقچی سے پردے میں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر لیا کرو۔علم حاصل کرو کہ گھر کے گھر میں زمانے بھر کی باتیں تم کو معلوم ہوا کریں۔پھر سمجھنے کی باتیں تم کو معلوم ہوا

کریں۔‘‘

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۵)

نذیر احمد نے مراۃ العروس میں صرف اپنے کردوروں کے ذریعے علم کی اہمیت اور پڑھنے لکھنے کے فوائد نہیں بتائے بلکہ وہ اپنے دیباچہ میں عورتوں سے راست مخاطب ہوکر انھیں پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کرنے کی ممکنہ حد تک کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ پڑھنے کے فوائد و بے شمار گنائے ہیں ساتھ ہیں وہ لکھنے کے عمل کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔لکھنا کیسے آتا ہے۔اس کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں۔مثلاً لکھتے ہیں:

’’لکھنے کو لوگوں نے ناحق بد نام کر رکھا ہے کہ مشکل ہے مشکل کچھ بھی مشکل نہیں ۔۔۔اگر کوئی شخص شروع شروع میں کسی کتاب سے، زیادہ نہیں ایک ایک سطر روز نقل لر لیا کرے اور اسی قدر اپنے دل سے بنا کر لکھا کرے اور اصلاح لیا کرے اور نقل کرنے اور لکھنے میں جھنپے اور جھجکے نہیں تو ضرور چند مہینوں میں لکھنا سکھ جائے گا۔خوش خطی سے مطلب نہیں۔لکھنا ایک ہنر ہے جو ضرورت کے وقت بہت کام آتا ہے۔اگر غلط ہو یا حرف بدصورت اور نادرست لکھے جائیں تو بے دل ہوکر مشق کو موقوف مت کرو۔کوئی کام ہوابتد میں اچھا نہیں ہوا کرتا ۔۔۔فرض کرو تم کو لڑکوں کی طرح اچھا لکھنا نہ بھی آیا تا ہم بقدر ضرورت تو ضرور آجائے گا اور یہ مشکل تو نہ رہے گی کہ دھوبن کی دھلائی ور پیسنے والی کی پسپائی کے واسطے دیوار پر لکیریں کھینچتی پھرو یا کنکر پتھر جوڑ کر رکھو۔۔۔اگر عورتیں اتنا لکھنا بھی سیکھ لیا کریں کہ اپنے سمجھنے کے واسطے کافی ہو تو کیسی اچھی بات ہے۔‘‘

(ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۸)

غرض نذیر احمد نے اپنے ناول کے دیباچے میں بھی عورتوں کو لکھنے پڑھنے کی اہمیت اور فوائد ہی نہیں بتائے بلکہ سیکھنے کے طریقے بھی بڑی اچھی مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ۔کیا یہ تعلیمی شعور نہیں تھا جو اس وقت انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے عہد کی عورتوں میں پیدا کر رہے تھے۔نذیر احمد ایک اچھے ناول نگار تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے کردار تخلیق کیے جو سمجھدار، عاقل اور فہم وفراست کے حامل تھے ان میں اصغری کا کردار بھی ایسا ہی

ہے جو پڑھی لکھی اور اچھی سوچ بوجھ رکھنے والی لڑکی ہے۔جو اپنی تعلیمی قابلیت اور صلاحیتیوں کی وجہ سے کس طرح اپنے گھریلو فرائض بخوبی انجام دیتی ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے شوہر پر بھی تعلیم کی اہمیت واضح کرتی ہے اور اُسے اچھی نوکری حاصل کرنے کا مشورہ بھی دیتی ہے۔ اصغری اپنے شوہر کو سیالکوٹ جانے پر راضی کرتی ہے۔اسکے نتیجہ میں اس کے شوہر محمد کامل کی تنخواہ میں اضافہ ہوجاتا ہے کیوں کہ ان کے افسر جیمس صاحب اس کی تنخواہ دس رپیے ماہوار سے پچاس روپے کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے خسر کو نوکری چھوڑنے اور گھر پر بیٹھنے کا مشورہ دیتی ہے اور ان کی جگہ اپنے بہنوئی محمد عاقل کو ملازمت دلا دیتی ہے۔اصغری اپنی تعلیم کی وجہ سے اپنے سسرال میں جہالت کو دور کرتی ہے اور اپنی نند محمودہ میں تعلیم کا شوق پیدا کر کے اسے ہنر مند بنا دیتی ہے۔اس طرح اصغری کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے مسلم گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی کیا اہمیت ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔عورتوں کی مسائل کو عورتوں ہی کے کرداروں کے ذریعے پیش کرنے کی وجہ سے نذیر احمد کو جو شہرت و مقبولیت اس زمانے میں حاصل ہوئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ جعفر ایک جگہ لکھتی ہیں:

''اعلیٰ اور متوسط طبقے کا کوئی ایسا گھرانہ نہ تھا جہاں نذیر احمد کے ناولوں کا چرچا نہ ہو،ان کے مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے گھریلو اور خاندانی مسائل سے بھی دل چسپی کا اظہار کیا تھا۔اور سماج کے ایسے طبقے کو بھی اپنا موضوع بنایا تھا جس کے مسائل کو مردوں نے بہت کم درخور اعتنا سمجھا تھا۔عورتوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو یا مسئلہ ہوگا جس سے نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں بحث نہ کی ہو۔''

(سیدہ جعفر،تنقیداور اندازِ نظر،نسیم بکڈ پو،۱۹۶۹ء،ص ٦٦)

ڈپٹی نذیر احمد نے اصغری اور اکبری کے کرداروں کے ذریعے اس دور میں جبکہ لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا،عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے ڈاکٹر ابولیث صدیقی لڑکیوں کی تعلیم سے ان کی دلچسپی کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عورتوں کی تعلیم سے انھیں (نذیر احمد) خاص دلچسپی تھی۔اس زمانے میں عورتوں

کی تعلیم کا چرچا بہت کم تھا۔لیکن نذیراحمد سمجھتے تھے کہ تربیت اولاد اور اصلاح رسوم کا کام اس وقت تک انجام نہیں دیا جا سکتا جب تک عورتوں میں تعلیم عام نہ ہو‘‘۔

(بحوالہ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی ،نذیراحمد شخصیت اور کارنامے،اردو اکیڈیمی اتر پردیش،سن اشاعت ۱۸۷۶، ص ۵۵)

اس ناول میں نذیراحمد نے قدیم نظام تعلیم کی جگہ عام مسلم گھرانوں کے لیے نئے تعلیمی نظام کا تصور پیش کیا ہے۔اس زمانے کے سماجی مسائل کا ایک بہت بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا جس سے پورے معاشرے کی تہذیبی اور تمدنی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں عورتوں میں جہالت اور بے ہنری کی وجہ سے معاشرہ کے مختلف عیوب میں مبتلا تھا اس زمانے میں ایک قدامت پسند طبقہ تھا جو تعلیم نسواں کا مخالف تھا تو دوسرا روشن خیال طبقہ تھا جو تعلیم نسواں کی اہمیت کو بہت عزت کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔نذیراحمد اس دوسرے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم نسواں پر بہت زور دیتے تھے۔اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے انہوں نے بہت محنت ومشقت کی اور انہوں نے اس کی ابتدا اپنے گھر ہی سے کیا اور اپنی لڑکیوں کے لیے مضامین بھی لکھے اور یہ ثابت کیا کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکھتے ہیں:

’’انہوں (نذیراحمد) نے عام مسلم گھروں کے تعلیمی نظام میں انقلاب برپا کر کے بورڈنگ اسکول کی جگہ لڑکیوں کے لیے نئے گھریلو تعلیمی نظام کا تصور پیش کیا اور سماج کی قدامت پسندی کو دور کرنے کے لیے نئے طریقۂ زندگی کو اپنانے کی پرزور تائید کی۔اس قسم کی تبدیلیاں وہ سب سے پہلے طبقۂ نسواں کے درمیان لانا چاہتے تھے۔تاکہ ان کے ذریعہ گھروں میں نئی روشنیاں جگمگا اٹھیں اور اس سے زندگی کا ایک نیا نظام کامیابی کے ساتھ شروع ہو۔‘‘

(ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی ،نذیراحمد شخصیت اور کارنامے،اردو اکیڈیمی اتر پردیش،سن اشاعت ۱۸۷۶، ص ۳۹)

نذیراحمد نے اپنے ناولوں میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کے

گھریلوامور یعنی کھانا پکانا اور سینا پرونا وغیرہ سے واقفیت کو بھی ضروری خیال کیا ہے۔جس کی کمی کی بنا پر لڑکیوں کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کا نظریہ یہی تھا کہ عورتیں تعلیم سے دور رہیں گی تو وہ اپنی گھریلو زندگی کو بحال نہیں کر سکیں گی اور اپنی اولاد کی تربیت میں بھی اس سے کوتاہی ہوگی۔عورتوں سے متعلق صرف یہی مسائل نذیر احمد کے پیش نظر نہیں تھے بلکہ وہ عورتوں کو مردوں کے ہمراہ اچھی خوشحال زندگی گذارتے دیکھنا بھی پسند کرتے تھے۔اس طرح وہ ایک اچھے معاشرے کی بنیاد کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ڈاکٹر ہارون ایوب اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نذیر احمد نے اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم نسواں پر خصوصیت سے زور دیا جائے، کیوں کہ صحتمند معاشرہ کی ذمہ داری خاص طور پر طبقۂ نسواں پر ہوتی ہے۔''

(ڈاکٹر ہارون ایوب، اردو ناول پریم چند کے بعد، اردو پبلیشرز، لکھنو، ۱۹۷۸ء، ص ۳۰)

اس لیے انھوں نے مراۃ العروس کے بعد دوسرا ناول بنات النعش میں حسن آرا کے کردار کو پیش کرتے ہوئے اس کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حسن آرا کے اندر بھی ابتدا میں یہ کمی تھی (یعنی گھریلو زندگی خانہ داری کی کمی) اسے گھر اور مکتب کی تربیت سے ہی دھیرے دھیرے گھریلو کاموں سے دلچسپی ہوتی گئی۔ڈاکٹر اشفاق احمد نے حسن آرا کے اسی شوق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''مکتب میں کڑھائی چڑھانے کے ساتھ ساتھ پکانے کا ڈھنگ عملی طور سے سکھایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں آگ جلانا، مصالحہ پیسنا، ادرک کاٹنا بھی اپنا ایک طریقہ رکھتا ہے، جو اناڑی لڑکیوں کے بس کا کام نہیں ہے۔حسن آراء کو بھی اس پروگرام میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔''[۱]

(ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، نذیر احمد شخصیت اور کارنامے، اردو اکیڈیمی اتر پردیش، سن اشاعت ۱۸۷۶، ص۴۰)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے اس ناول میں حسن آراء کے کردار کے

ذریعے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو کس طرح علم کے ذریعے خوشحال بنایا جا سکتا ہے، اسے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔یعنی گھریلو امور کی تعلیم بھی لڑکی کے لیے اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ زندگی گذانا۔ کیوں کہ اگر لڑکی گھریلو امور کو انجام دینے میں کامیاب رہی تو اس کی زندگی بھی خوشگوار ہوگی۔ اس لیے نذیر احمد عورت کو ہر معاملہ سمجھدار اور ہر فن میں ماہر ہونے کو ضروری خیال کرتے تھے اس لیے انھوں نے عورتوں میں علم کے فوائد بتائے ہیں۔ خصوصاً انھوں نے اس ناول میں علم کی اہمیت کو استانی جی کے کردار کے ذریعے یوں سمجھایا ہے:

''آدمی کسی حالت میں کیوں نہ ہو، علم سے اس کو فائدہ ہی ہوگا۔ اگر مصیبت میں ہے تو علم اس کی ایسی غمگساری کرے گا جو کسی دردمند سے نہ ہو سکے اور اگر خوشی میں ہے تو علم اس خوشی کو بے خرخشہ اور پائدار کرے گا۔ آسودگی اور قائم مزاجی اور استغنا اور سیر چشمی جیسی علم سے حاصل ہوتی ہے نہ دولت سے حاصل ہوتی ہے، نہ حکومت سے۔ واری جایئے پڑھنے کے اور صدقے جایئے کتاب کے۔ فرصت کا مشغلہ، دل بہلاؤ۔ گھر بیٹھے کی سیر۔ استانی کی استانی اور سہیلی کی سہیلی۔ جو عورتیں پڑھنا نہیں جانتیں، کیسی بری طرح ان کا وقت کٹتا ہے کہ معاذ اللہ۔ اس کی غیبت، اس کی بدی، مجھ سے لڑ، تجھ سے بھڑ، اٹھوانٹی کھٹوانٹی لے پڑ رہیں۔ پڑھنا آتا ہو تو کتاب ہاتھ میں لے لی۔ جس ملک کی چاہی، سیر کر آئے۔ پڑھنا حاضرات کا ایک عجیب و غریب علم ہے۔ جس کو چاہا، پکڑ بلایا اور اسی سے باتیں کرنے لگے۔''

(بنات النعش، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳، ص ۳۲)

نذیر احمد کتنی عمدگی سے استانی کے کردار کے ذریعے نہ صرف عورتوں کے لیے علم کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ کتابیں کس طرح سے ان کی رہنمائی اور مشغلے کا ذریعے بن سکتی ہیں۔ یہ نذیر احمد کا احسان ہے کہ طبقہ نسواں میں علم کا شوق پیدا ہوا اور کتابوں کے ذریعے دنیا بھر کی معلومات عورتوں نے حاصل کیں۔ بلکہ آگے چل کر ملازمتیں بھی اختیار کیں۔

نذیر احمد کے ناولوں میں اولاد کی تعلیم و تربیت کو بھی ماں باپ کے لیے فرض بتایا گیا ہے کہ کیوں کہ نصوح کو اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت نہ کرنے سے کس طرح کے نتائج بھگتنے

پڑتے ہیں نذیر احمد نے اس طرف ہماری توجہ دلائی ہے،ان کے مطابق ان حالات کے پیدا ہونے کی وجہ بھی چوں کہ والدین ہوتے ہیں اس لیے ان کا تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری خیال کیا ہے کیوں کہ ماں باپ کی کوتاہی کی وجہ سے بھی بچوں کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناول ''توبۃ النصوح''میں تربیت اولاد اور دینی تعلیم کی افادیت پر روشنی ڈالیہے ۔انھوں نے اولاد کے عادات واطوار اور اخلاق وکردار کی تربیت کو والدین ہی کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔اگر والدین خود اپنے طرزِ گفتار اور کردار سے مثال نہیں قائم کر سکتے اور اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت سے غفلت برتتے ہیں تو ان کی اولاد یقیناً راہ راست پر نہیں رہ سکتی ۔بری صحبت سے اپنی اولاد کو دور رہنے کا مشورہ بھی دینا والدین کا فرض ہے۔ساتھ ہی انھوں نے اس حقیقت سے بھی آشنا کیا کہ عورت کا پڑھا لکھا ہونا بھی اولاد کی تربیت میں کس قدر ضروری ہے کیوں کہ اگر عورت تعلیم یافتہ ہوگی تو نہ صرف وہ گھریلو امور کی انجام دہی میں شوہر کا ہاتھ بٹائی گی بلکہ کسی اہم مسئلہ پر اپنے شوہر کو مفید مشورہ بھی دینے کے لائق ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ نذیر احمد کا ماننا ہے کہ عورتوں میں سمجھداری بھی تعلیم اور کتابوں کے ذریعے ہی آسکتی ہے۔ چنانچہ اپنے ناول توبتہ النصوح میں عورت کی فہم وادراک اور سوجھ بوجھ کے ہونے کو ضروری تصور کرتے ہوئے نصوح کے دریعے فہمیدہ کی تعلیم اور گھریلو زندگی میں اس کے مشوروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔چنانچہ نصوح کو اولاد کی تربیت میں کوتاہی ہوجاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کس سے مدلی جائے تو اسے اپنی پڑھی لکھی بیوی کا خیال آتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اصلاح خاندان ایک بڑا مشکل کام تھا وہ بخوبی واقف تھا کہ دین داری اور خدا پرستی میرے خاندان کے لیے بالکل نئے الفاظ ہیں جن سے چھوٹے بڑے کسی کے کان آشنا نہیں ۔وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ گھر بھر ایک طرف ہوگا اور میں ایک طرف نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا اور میں ایک سور ما چنا بن کر کیوں کر معصیت کے پہاڑ کو توڑ ڈالوں گا۔پس وہ غور کرنے لگا کہ کس کو اپنا مددگار بنائے ۔کس کو صلاح کار قرار دے۔آخر یہی دل

میں آیا کہ اصلاے خاندان کے لیے بی بی سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں اور خدا کو اس خاندان کی کچھ فلاح ہی منظور تھی کہ نصوح نے بی بی کو پڑھا لکھا بھی لیا تھا جب نصوح کا نیا نیا بیاہ ہوا اور انھی دنوں تعلیم نسواں کا چرچا شروع ہوا تھا نئی نئی کتابیں عورتوں کے لیے جاری ہوئی تھیں، نصوح نے اس کو شوق سے دیکھا تھا۔ اس کا دل اس بات مان گیا تھا کہ عورتوں کو پڑھانے لکھانے میں چند در چند فوائد دینی و دنیاوی مضمر ہیں۔ چنانچہ اس نے بعض کتابوں میں سے بعض مقامات دلچسپ پڑھ کر سنائے۔ بھلائی کی بات سبھی کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بی بی نے بھی اس کو تسلیم کیا کہ عورتوں کے لیے پڑھنا بہت مفید ہے بال بچوں کا کچھ بکھیڑا نہ تھا میاں سے پڑھنا شروع کیا تو چار پانچ مہینے میں اردو لکھنے پڑھنے لگی۔ تب سے اب تک تھوڑا بہت مشغلہ چلا ہی جاتا تھا۔''

(توبتہ النصوح، کلیات نذیر احمد، کتابی دنیا، ۲۰۰۳، ص ۲۳)

نذیر احمد نے اپنے دور میں تعلیم کی کیا صورتحال تھی اور ایسی صورتحال میں جبکہ مسلم گھرانوں عورتوں کو پڑھانا بھی معیوب سمجھا رہا تھا بڑی بے باکی سے عورتوں کو اپنے ناولوں اور اس کے کرداروں کے ذریعے تعلیم کی اہمیت اور اس کے فوائد بتائے اور اس دور میں جبکہ عورت کو گھریلو مسائل میں بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی عورتوں میں عزت نفس کو بیدار کرنے اور دنیا کی دیگر عورتوں کی طرح باعزت اور عالی شان زندگی گذارنے کا شعور پیدا کیا ہے۔ نذیر احمد کا دور اصلاحی تحریکات کا دور تھا۔ اس عہد میں مذہب، سیاست، معاشرت اور تعلیم غرض یہ کہ ہر میدان میں اصلاح کے لیے قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی ان اصلاحی تحریکات کا اثرات قبول کیے اور اپنے ناولوں میں اس عہد کے سماجی و معاشرتی خرابیوں کی طرف بھی اشارے کر کے عورتوں کو باشعور ہونے کی تعلیم بھی دی ہے مثلاً نذیر احمد کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے عہد کے معاشرے کے عیوب پر سے پردے اٹھائے اور اپنی قوم کی اخلاقی ابتری میں سدھار لائے کیوں کہ اس عہد کے مسائل میں لڑکیوں کی دوسری شادی کرنے کو برا تصور کیا جاتا تھا جبکہ اسلام میں عورت کی دوسری شادی کی اجازت دی

گئی ہے لیکن ہندوستانی معاشرے کے باعث اس عہد میں یہ برائی درآئی تھی کہ عورت بیوہ ہوجاتی تو اس کی دوسری شادی کو اچھا نہیں مانا جاتا تھا۔انھوں نے ناول ایامیٰ میں ان مسائل کو دینی تعلیم کے ذریعے حل کرنے کی طرف توجہ دلا کر والدین کی اصلاح کی کوشش کی اوراس کوشش اس میں کامیابی بھی ملی یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے عہد کا نباض بھی کہا گیا ہے۔

نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں میں عقل و فراست اور تعلیم وتربیت کی اہمیت کو پیش کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ چاہے مرد ہو یا عورت دونوں کے لیے تعلیم لازمی ہے۔انھوں نے تعلیم کے لیے اگر چہ کوئی باقاعدہ اصول نہیں بتائے لیکن اپنے کرداروں کے ذریعے تعلیم کی اہمیت اور طبقہ نسواں میں اس کی ضرورت پر زیادہ زور دینے کی کوشش کی ہے۔کیوں کہ گھریلو زندگی اور معاشرتی رشتوں، ناتوں کے لیے علم کا جاننا کتنا مفید ثابت ہوگا ان کے ناولوں کے کرداروں کے ذریعے ہم اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔غرض نذیر احمد کی ناولوں میں ان کے تصور تعلیم کے اس تجزیے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں علم کی اہمیت اور اس کے فوائد بتائے ہیں خصوصاً ایک مرد کے مقابلے ایک عورت کو تعلیم دینے سے معاشرے کو کس طرح بہتر بنایا سکتا ہے اس تصور کو پیش کیا ہے خواتین کے مسائل میں اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ جہالت کا تھا اس مسئلہ کے حل کے لیے ضروری تھا کہ عورت تعلیم یافتہ ہو اور اپنے مسائلکی یکسوئی کی طرف سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو، وہ خود اپنی اصلاح کرنے اور معاشرے کے خرابیوں کو دور کرنے کے لائق ہو اور یہ اسی وقت ممکن تھا جبکہ عورتوں میں تعلیمی شعور کو بیدار کیا جاتا اور ان کی ترقی کی جو راہیں ہموار کی جاتیں یہ کام نذیر احمد ب نے اپنے ناولوں کے ذریعے بخوبی انجام دیا ان کی تعلیم نسواں کے سلسلے کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں اور جب کبھی ہندوستان کی ادبی تاریخ میں تعلیم نسواں کا ذکر ہوگا نذیر احمد کا نام ہمیشہ سرفہرست ہوگا۔

ڈاکٹر غوثیہ بانو۔ٹرسٹی شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

تعلیم اور خواتین پر سماجی موقف

اسلام میں علم کا حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔اس میں مرد وعورت میں کسی قسم کی تخصیص نہیں برتی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ علم کی منور روشنی کی طاقت کو سمجھتے ہوئے مذہبی طور پر بھی اسے حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی۔ دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی ہم اس رجحان کو دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں قدیم ویدک دور 1000 قبل مسیح 1000 BC میں تعلیم نسواں کی کاوشیں نظر آتی ہیں۔ اس مذہبی عقیدے کے مطابق ''سرسوتی'' کو علم کی دیوی قرار دیا گیا۔اور قوت یا طاقت کے لیے''شکتی'' تانیثی اصول وضع کیا گیا۔

ویدک دور میں خاتون دانشوران بھی نظر آتی ہیں۔ جیسے، امبھرنی، روماسا، گارگی،کھونا وغیرہ۔لوہامودرا نے اپنے سوامی کے ان صفات کو حاصل کرنے کے لیے اشعار پر مشتمل نظمیں پیش کیں۔

میتری Maitreyi جو ایک فلاسفر تھی اس کے شوہر یا جن والیکی (Yajnavaliky) اور اس کے درمیان فلسفیانہ گفتگو کے مکالمے پائے جاتے ہیں۔ بعد کے دور میں رسمی پابندیاں، امتیازات کی بنا پر دھیرے دھیرے خواتین کی تعلیم کا میدان محدود ہونے لگا۔ مذہبی درجوں کی بنیاد پر مخصوص طبقے کی خواتین پر علم کے حصول پر پابندیوں کا ماحول بھی پایا گیا۔ 1882ء میں شرح خواندگی 0.2% تھا 1947ء تک 6% پہنچ گیا۔ 1848ء میں پونے شہر میں لڑکیوں کے لیے باقاعدہ اسکول شروع کیا گیا۔ مذہبی اور بنیادی تعلیم کا نظم مدارس ومکاتب کے ساتھ گھروں میں بھی پایا جاتا تھا۔1878ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے گریجویشن پروگرام میں خواتین کو بھی پہلی مرتبہ داخلہ دیا۔

آزادی کے بعد خواتین کی تعلیم میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ 1968ء میں مہیلا سمکھیا پروگرام، 2004 میں کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ اسکیم، لڑکیوں کے لیے قومی تعلیمی پروگرام بھی مرتب کیا گیا۔

حدیث میں علم کے تعلق سے ملک چین کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یوں تو ملک چین علم کا مرکز رہا ہے۔ لیکن یہاں قدیم روایتوں کی سختی سے پاس داری بھی پائی جاتی رہی ہے۔ جس کے تحت مخلوط تعلیم کا تصور نہیں تھا۔ قدیم طرز تعلیم کی اشاعت تو رہی ہے لیکن کرسچن مشنریوں نے 19ویں صدی میں یہاں جدید وعصری تعلیم کی بنیادیں رکھیں۔

ڈاکٹر میری فلٹن (1927-1854) نے پہلے میڈیکل کالج کی بنیاد رکھی جو خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ 1950ء میں ابتدائی تعلیم کا تہذیبی پروگرام قائم کیا گیا۔ 1980ء یا تعلیمی قانون بنایا گیا جس کے تحت کہا گیا کہ مڈل اسکول تک پڑھنے کا سب کو حق ملنا چاہئے۔ خوش آئند بات یہ رہی کہ 1960ء میں ابتدائی تعلیم کے لیے 20% خواتین نے داخلے لیے اور اگلے بیس برسوں میں 1995ء تک یہ اعداد وشمار 98.2% تک جا پہنچے۔

ابتداء میں خواتین کی تعلیم کو لے کر اس ملک میں بھی یہی رجحان رہا کہ لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکے تعلیم کے زیادہ مستحق ہیں، لڑکیوں کی تعلیم پر زیادہ صرف کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

21 اکیسویں صدی میں یہ رجحان تبدیل ہونے لگا۔ 1977ء میں کالج انٹرنس اکزام میں 4.8% کی جگہ 74.86% لڑکیوں نے رجسٹریشن کروایا۔

اسکالر ابن عسکری نے 80 خواتین سے علمی استفادہ کیا۔ جس کی بناء پر ہم خواتین کی علمی حیثیت کو اس دور میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ روایتی جماعتوں کے علاوہ علمی مجالس بھی مساجد ومدرسوں میں منعقد کی جاتی تھی۔ جہاں خواتین کی شرکت پر پابندی عائد نہیں تھی۔ ان کے لیے علیحدہ نظم رہتا ہوگا جیسا کہ موجودہ دور میں مکہ مکرمہ کی مساجد میں رہتا ہے۔

15ویں صدی میں خاتون اسکالرس کی بڑی تعداد سامنے آتی ہے۔ السخاوی نے 1875 خاتون اسکالرس سے متعلق معلومات پیش کی ہے۔ حالیہ عرصہ میں اکرم ندوی نے

آکسفورڈ منسٹر فار اسلامک اسٹڈی کے تحت اپنی تحقیق میں 8000 محدثین خواتین کے تعلق سے لکھا ہے۔

ایران اسلامی جمہوری ملک میں 1979ء کے بعد خواتین کی تعلیم کے تعلق سے ایک انقلاب برپا نظر آتا ہے۔اس وقت 31% خواتین یونیورسٹی سطح پر زیرِ تعلیم تھیں۔14% خواتین تدریسی عملہ سے وابستہ تھیں۔2007 تک ان اعداد وشمار میں کافی تبدیلی پائی گئی۔ 43% فیصد خواتین ماسٹر ڈگری اور 33% پی ایچ ڈی سطح پر تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔یہ تبدیلی کی ایک وجہ 1984ء میں خواندگی کا پروگرام بھی ہوسکتا ہے۔جس کے تحت خواتین کو دو مرحلوں میں تعلیم دی گئی۔تربیت دی گئی۔دوسرے مرحلے میں اسلامی مطالعہ،سماجی علوم، تجرباتی سائنس اور فارسی زبان کی تعلیم دی گئی۔اس پروگرام میں 71% خواتین شرکاء کار تھی جو 45-15 سال کی عمر سے تعلق رکھتی تھیں۔

1987ء سے 1997 تک 20% شرح خواندگی میں اضافہ پایا گیا۔مذہبی تعلیمی ادارے آیت اللہ خامنئی کے دور میں 1984ء میں جامعۃ الزہرہ کے نام سے شروع کیے گئے۔جہاں سے یہ ادارے اسکول کی سطح سے یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم کا موقع فراہم کرتے تھے۔2010ء میں کئی مختلف تعلیمی اداروں نے خواتین کی صحت سے متعلق شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف تعلیمی پروگرام مرتب کیے۔خواتین کی عصری تعلیم کا جب ہم ذکر کرتے ہیں تو یورپین تاریخ میں خواتین کی تعلیمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔قدیم روم کی تہذیب میں اعلیٰ طبقہ کی خواتین تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔کورنیلیا Cornelia علم الجبراء ادب موسیقی اور فلاسفی کا علم رکھتیں تھیں۔اس وقت کی خواتین علم خطاطی میں بھی مہارت رکھتیں تھیں۔

نیٹ ایٹا آئرلینڈ (وفات 570 AD) نے ایک اسکول قائم کیا تھا جہاں انہوں نے سینکڑوں خواتین کو تعلیم دی۔

سینٹ Stilda نے 680 AD میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا۔

سینٹ Bertilla 700 AD اور سینٹ لیبا کے نام بھی تعلیمی اشاعت میں پائے جاتے ہیں۔

1524ء کے مارٹن لوتھر کے متن نے بھی عوام کو اسکولوں کے قیام کی جانب توجہ دلائی۔

1727ء میں پولش کامن ویلتھ نے تاریخ میں پہلی وزارت تعلیم قائم کی۔ پولینڈ فلائنگ یونیورسٹی کی طالبہ نوبل انعام یافتہ میری کیوری نے تاریخ میں اپنا نام درخشاں کیا۔

1824ء میں ایلن نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک اکیڈیمی قائم کی۔

1848ء میں کوئین کالج کا افتتاح لندن میں عمل میں آیا۔

1878ء میں میری لیون (1849-1797) نے امریکہ میں پہلا خواتین کا کالج قائم کیا۔ 1849ء میں ایلزبیتھ بلیک ویل میڈیسن سے گریجویشن کرنے والی پہلی خاتون قرار پائی۔ اس کے بعد تعلیمی شعور کی بدولت خواتین مسلسل تعلیمی میدان میں بڑھتی چلی گئی۔ لیکن یہ ترقی دنیا کے ہر ملک میں یکساں نہیں رہی۔ افریقہ کے ممالک میں صورت حال مختلف نظر آتی ہے۔ قدیم رسم ورواج اور پابندیوں کی بناء پر خواتین تعلیم سے دور رہیں جس کی وجہ سے صحت کے مسائل سے بھی وہ دوچار ہوتی رہیں۔ موجودہ دور میں بھی یہاں تعلیمی صورتحال تسلی بخش نہیں کہی جاسکتی ہے۔ پاکستان کا ماحول ان ممالک سے اس لیے مختلف ہوجاتا ہے کہ وہاں اعلیٰ اور متوسط طبقے کی خواتین تعلیم سے مستفید ہونے کی سہولت پاتی ہیں لیکن دیہاتی اور قبائلی خواتین آج بھی بہتر تعلیمی ماحول کی منتظر ہیں۔ ملالہ یوسف زئی کی داستان آج دنیا کے سامنے موجود ہے۔ ملالہ نے جس عزم واستقلال سے اپنا مقام بنایا ہے اس طرح دنیا میں پہلے کے مقابلے موجودہ دور میں خواتین نے تعلیم کے ذریعہ اپنے سماجی مقام میں نمایاں تبدیلی لائی ہیں۔

برطانیہ کی وزیر اعظم تھریسا سے اور یورپ کی طاقتور لیڈر انجیلا مرکل سیاسی افق پر درخشاں ہیں۔ امریکہ کی سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہیلری کلنٹن نے وکالت کی اور خاندان اور بچوں کے لیے Arkansas Advocates کا قیام عمل میں لانے میں مددگار رہیں۔

کانگریس لیڈر سونیا گاندھی نے پارٹی صدر کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا۔ ابتداء کی تعلیم کے بعد وہ 1964ء میں انگلش تعلیم کے لیے کیمرج شہر کے ایجوکیشنل ٹرسٹ میں داخلہ لیا۔

برما کی آنگ سانگ سوئی کی نے بیرون ملک سے فلسفہ، سیاسیات اور معاشیات کی تعلیم حاصل کی اور اپنے ملک میں جمہوری حقوق کے لیے آواز بلند کی۔

معاشی طور پر بھی خواتین نے تعلیم کے ذریعہ مستحکم شناخت قائم کی ہے۔ Opranwinfrey نے غریب خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود آج وہ افریقین امریکہ کی پہلی بلبنیر خاتون ہے۔ جس نے ہائی اسکول کی تعلیم کے ساتھ ہی اپنا کیریئر بطور anchor شروع کیا اور وہ اب دنیا کی با اثر خواتین میں پہلے درجہ پر شمار کی جانے لگی ہے۔ پیپسی کو Pepsico کی CEO اندرا نوئی دنیا کی چوتھے نمبر کی سب سے بڑی غذائی کمپنی کی منتظمہ ہے۔ جنہوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بناء پر دنیا کی تاریخ میں پیپسی کو کوکا کولا پر سبقت دلائی۔

چندا کوچر نے بھی ICICI بینک کی CEO بن کر ایک نئی تاریخ رقم کی۔

اروندھتی بھٹاچاریہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا سے جڑی ہے۔ خواتین نے تعلیم کے میدان میں بھی اپنی تعلیم کے ذریعہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ مشعل صدر چلی Michelle Bachelet نے خواتین کی تعلیم پر توجہ مرکوز کی اسے ایسی سرمایہ کاری بتایا جو خواتین کو عظیم تر معاشی مواقع فراہم کرتے ہوئے انہیں معاشرے کا شراکت دار بنا سکتی ہے۔

آسٹریلیا کی سابقہ وزیر اعظم جولیا وہ ساری دنیا کی لڑکیوں کی تعلیم کی پرزور وکالت کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ گھریلو اور قومی پیمانے پر ان کی تعلیم پر توجہ دینا ضروری ہے۔

''لڑکیوں کو پڑھنے دو'' مہم کی تشہیر مشعل اوباما نے کی اور کہا کہ لڑکیاں ہمارے معاشرے کو تبدیل کرنے والی ہوتی ہیں اس لیے ہمارے خوابوں کو پورا کرنے والی ان لڑکیوں کی تعلیم انتہائی اہم قرار پاتی ہے۔ ہیلری کلنٹن نے 2014 میں ایک ادارہ قائم کرتے ہوئے Million 600 لڑکیوں کی تعلیم پر صرف کرنے کا پروگرام بنایا جس کے تحت 14 Million دنیا کی لڑکیوں کو اسکول جانے میں مدد ملی۔

ارنا سولبرگ Erna Solberg وزیر اعظم ناروے نے کہا کہ اگر آپ لڑکیوں کی

تعلیم پر سرمایہ کاری کرتے ہیں تو وہ خود مکتفی ہوں گی اپنے مستقبل کے بچوں کو تعلیم یافتہ بنائیں گی۔اپنے معاشرے کو بلند مقام پر لے جائیں گی جس سے قوم کی ترقی ہوگی۔

Ellen Johnson صدر Liberia نے تحریر کیا کہ افریقہ میں 30 million لڑکیاں اپنے بنیادی تعلیم پانے کے حق سے محروم ہیں۔اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ ہر بچہ تعلیم پاسکے اور قدروں کو جان سکیں۔عراق کی جنگ سے متاثرہ زینب سالبی نے خواتین کی تعلیم کے لیے متاثر کن اقدامات اٹھائے۔

خواتین نے اپنی تعلیم کے ذریعہ مختلف میدانوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ششی کلا ہنسا نے سائنس شعبہ میں میزائیل پروجیکٹ کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا انہوں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ کسی اور پر منحصر نہ ہو۔ 2001 سے فل ٹائم سائنس داں کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والی ششی کلا نے AAD میں اپنی رہبری میں سوپر سونک بالسٹک میزائیل سسٹم کا کامیاب تجربہ کرواتے ہوئے نہ صرف خود کو طاقتور حیثیت پیش کی بلکہ ملک کو بھی فخر کا اعزاز دیا۔ وہ اب Missile Women کے نام سے جانی جاتی ہیں۔

لیکن پروفیسر سندر سروکئی Sarukkai سائنس کے میدان میں خواتین کی پیش رفت سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے ایک ذہن کارفرما ہے کہ خواتین سائنس کے شعبہ میں بہتر کارکردگی نہیں دکھا سکتی ہے۔ بالخصوص وہ ہندوستانی خواتین کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیگر ممالک میں خواتین نے سائنسی تحقیق میں بہتر اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ جیسے امریکہ میں خاتون سائنس دانوں کی کافی تعداد ہے۔ یہاں تک کہ سری لنکا 37%، پاکستان 20%، ایران 20%، سوڈان 40% سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہندوستان کی صرف 14% خواتین ہی اس شعبے میں نظر آتی ہیں۔

پروفیسر صاحبہ نے یہاں ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ مرکوز کرواتے ہوئے کہا کہ سائنس کو صرف دنیا کے چند حقائق تک محدود نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس میں تاریخی اور فلسفیانہ

شعور بھی ہونا چاہئے۔ جو خواتین اور غیر ترقی یافتہ طبقات کو مستفید کر سکے۔ خواتین سائنسی میدان میں اپنے سماجی، ادبی اور عمرانی تجربات سے کامیاب ہوتی ہیں تو یہ معاشرے کے لیے ایک نئی وسعت ہوگی۔

مہا بانو مودی کوتوال بھی خواتین کے ساتھ امتیازات برتنے پر سوال اٹھاتی ہیں۔

''ہندوستان ہر چیز کو عورت کی تشہیر کے ساتھ بیچتا ہے ویکیوم کلینز سے لے کر پان مصالحہ لیکن یہاں عورت کو اپنی خواہشات کے اظہار کا حق نہیں۔ اسے آج بھی Taboo سمجھا جاتا ہے''

وہ ایک بہترین مشورہ دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہماری آنے والی نسلوں کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ نفسانی خواہشات صرف ایک مسرت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عظیم ذمہ داریاں ہوتی ہے۔ وہ خواتین کے ساتھ تشدد کے واقعات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ ہندوستان میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے بہت سے قوانین موجود ہیں لیکن قدامت پرستی و توہمات کی بنا پر ان پر کہاں تک عمل آوری ممکن ہو پاتی ہے۔ آج بھی قانون اور انصاف میں ایک بڑا فرق موجود ہے۔

خواتین کی تعلیمی ترقی کے باوجود یہ تعجب خیز امر ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود ہے کہ خواتین امتیاز اور تشدد کا شکار ہے۔ ایک روشن پہلو یہ ہے کہ 30% اعلیٰ انتظامی سطح کے عہدوں پر خواتین براجمان ہیں۔ 9% خواتین سیاسی جماعتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ 6% ٹریڈ یونینوں کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔ 7% خواتین سول سرویس میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ 3% خواتین ججوں کے اعلیٰ مرتبت درجے پر ہیں۔ یہ حقائق اور اعداد جہاں دل خوش کن ہیں وہیں پر خواتین کے ساتھ کی جانیوالی وحشتناک کاروائیاں دل دہلا دینے والی ہیں۔ یہ صرف کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عالمی پیمانے پر نوے سکنڈ میں ایک عورت مناسب تعلیم اور توجہ نہ ملنے کی وجہ سے چاہے دوران ملازمت ہو یا جنسی امتیاز کی وجہ سے موت کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہجرت کرنے والی خواتین کی عصمتیں غیر محفوظ ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں جہاں کئی ایسے ممالک ہیں جہاں اب بھی خواتین کے تعلیم کے حق کو نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ 608 ملین

خواتین ایسے ممالک میں بھی رہتی ہیں جہاں گھریلو تشدد کو جرم نہیں مانا جاتا ہے۔ 60 ملین خواتین کی عمر 18 سال ہونے سے پہلے انہیں ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیے بغیر اور مناسب تعلیم وتربیت کے بغیر ہی رشتوں میں باندھ دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف وہ خود کی بلکہ اپنے خاندان کی بہتر نگہداشت سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ مایوس کن پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ خواتین کو آج بھی ایک کھلونے کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ صرف ہمارے ملک میں ہر نوے منٹ میں ایک خاتون کی ہلاکت، ہر 102 منٹ میں جہیز ہراسانی موت، ہر 43 منٹ میں اغوا، ہر 42 منٹ میں زیادتی، ہر 34 منٹ میں عصمت ریزی ہر 26 منٹ میں ہراسانی ریکارڈ کی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی زیادتی ہے خواتین کو مردوں کے مقابلے اجرتیں بھی کم مقرر کی جاتی ہے۔ شہری خواتین کو 60% اجرت دی جاتی ہے جبکہ دیہاتی خواتین کو 60% سے کم اجرت دی جاتی ہے۔

میر علی کالم نگار خواتین کو ہر انقلاب کا دل قرار دیتے ہیں۔ رام گوپال ورما فلم ڈائرکٹر خواتین کو ایک فلمی ایکٹرس کی طرح دل بہلانے والی ہونا چاہئے کہہ کر یوم خواتین پر ٹویٹ کیا جسکا خواتین نے بھرپور جواب دیتے ہوئے دفاع کیا۔ ساہا گپتا نے بھی اس درد کو بیان کیا ہے کہ لوگ خواتین کو ایک خوبصورت گڑیا کے طور پر ہی دیکھنا چاہتے ہیں حالانکہ اس کے خدوخال اس کے رنگ وروپ سے زیادہ اس کی صلاحیتوں کی قدر ہونا چاہئے۔ آپ کے کام سے آپ کی قدر ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنی اس کے رنگ یا ہمارا پرفیکٹ فگر نہیں ہے تو اس کے لیے شرمندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خواتین کا یہ ردعمل دنیا میں مختلف جگہوں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ وال اسٹریٹ کے آگے ایک نڈر لڑکی کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ جو معاشی طور پر مستحکم مردوں کی برتری والے ماحول کو چیلنج پیش کررہی ہے۔ جس کو بین الاقوامی یوم خواتین کے موقع پر Be Bold for Change کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ خواتین کی حیثیت کو تسلیم کرنا اور انہیں ان کی شرائط کے ساتھ معاشرے کا حصہ بنانے کا رجحان بھی سامنے آرہا ہے۔ جیسے Nike نے مسلم خواتین کے لیے جو کھیلوں میں حصہ لینا چاہتی ہو۔ ان کے لیے Sport Hijab تشکیل

دیا ہے۔ جیسے دنیا میں کہیں بھی آن لائن خریدا جاسکتا ہے۔اس فعل پر مختلف آرا سامنے آرہی ہیں۔لیکن یہ تو ثابت ہورہا ہے کہ وہ خواتین کی شرائط کو قبول کیا جارہا ہے۔اگر چہ کہ وہ صرف ایک مخصوص طبقے ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو۔لیکن اس بات کی کوئی یقینی ضمانت نہیں ہے کہ ہر جگہ یکساں سلوک ہوسکتا ہے۔لندن کی تہذیب یافتہ سوسائٹی سے خواتین نے اس بات پر احتجاج کا اظہار کیا ہے کہ ان کے صنف مخالفت سے تعلق رکھنے آفیسرس نے نہ صرف ان کے ساتھ نسلی امتیازات پر مبنی سلوک کیا بلکہ ان کی صنف کے تعلق سے بھی ناشائستہ کلمات ادا کیے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی تین آفیسرس اوشاUsha Evans، Nighat Hobbard یہاں کی پہلی مسلم پولیس خاتون ہیں جنہیں اعزازی طور پر ملکہ نے عہدہ عطا کیا ہے۔اور تیسری کتھرائین بیل کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم اور خود اعتمادی کی بدولت خواتین اس طرح کے عمل کو خاموشی سے برداشت نہیں کررہی ہے۔وہ مستقبل کے تمام خطروں کو جو اس کے کیریئر میں آسکتے ہیں انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی عزت نفس کی حفاظت کے لیے آگے آرہی دنیا کے سامنے اس قسم کے واقعات کو پیش کررہی ہے۔

جدید ٹکنالوجی نے جہاں خواتین کو تیز رفتار دنیا کے ہمراہ آگے بڑھانے میں مدد دی ہے وہیں ان کے ساتھ انٹرنیٹ کو استعمال کرتے ہوئے نازیبا حرکتیں بھی انجام دی جارہی ہے۔ ویسٹ گوداوری کے ایک شخص رتنم نے انسپکٹر کا FB اکاؤنٹ Hacked کرکے کئی نمبرات حاصل کیے اور خواتین کو تنگ کرنے لگا۔خواتین نے مخصوص تشکیل شدہ She Teams سے رابطہ کیا اور سائبر مجرم کو گرفتار کیا گیا۔ یہ تعلیم کی طاقت کے ثمرات ہے کہ خواتین خاموشی سے ظلم وستم کو نہیں سہہ رہی ہے وہ اپنے حقوق سے واقف ہے اور اس کے لیے جدوجہد بھی کررہی ہے۔لیکن وہ اپنی نسوانی فطرت کو نہیں چھوڑ پاتی ہے۔ہیمانی کوٹھاری اس بات پر تعجب کا اظہار کرتی ہے کہ معاشی طور پر خود کفیل خواتین کیوں تکلیف دہ رشتے سے جڑی رہتی ہے۔وہ مشہور پاپ سنگر ریحانہ کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"This one question remains a mystery why do

so many women especially these who are financially independent chose to stay in abusive relationships?"

وہ ابھیشک گتانی اور نیہا رستوگی کے واقعے کو پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ابھیشیک امریکہ کی Silicon Valley کاCEO ہےاس کی بیوی نیہانے شکایت درج کی کہ اس کے شوہر نے کئی بار اسے جسمانی اور زبانی اذیتیں دی ہیں۔

" Neha Rastogi, told the court he hit me multiple times during each incidents on my face, arms, head, belly pulled my hair and abused me." She

10 سال اذیتوں کو بھگتنے والی نیہا کے شوہر کو California، Santa Clara، Superior Court نے صرف ایک ماہ قید کی سزا سنائی جس کے خلاف نیہا نے اپیل کا ارادہ کیا ہے۔

ماہر نفسیات کا ماننا ہے کہ اس طرح کے تعلقات میں رہنے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہے۔ ایک بچپن سے اس طرح کے ماحول کو دیکھتے رہنا دوسرے بہتر مستقبل کی امید کہ حالات بدل جائیں گے۔اور تیسری اہم ذہنی وجہ برتری یا کم تری کا احساس جس شخص میں وہ دوسرے شخص کے لیے باعث اذیت بن جاتا ہے۔خواتین پر جسمانی یا ذہنی اذیتوں زیادتیوں کی یہی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ جونفسیاتی طور پر کسی الجھن میں مبتلا ہو وہ خواتین کی برتری کو تسلیم نہ کرتے ہوئے انہیں تکلیف سے دوچار کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ اعلیٰ عہدے پر فائز شخص بھی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرسکتا ہے۔اور ایک کم تعلیم یافتہ معمولی قسم کی تنخواہ رکھنے والا شخص ہوسکتا ہے کہ خواتین کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آئے۔

بہر طور یہ ایک حقیقت ہے کہ خواتین اپنی ترقی میں تعلیم کی قوت حاصل کرتے ہوئے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔لیکن اب بھی ایک بڑا حصہ ان تمام مسائل سے دوچار ہورہا ہے۔ جو

ایک کمزور طبقے کو برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ حالانکہ تعلیمی شرح میں پہلے کی بہ نسبت کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ جہاں ہندوستان میں سال 16-2015 میں 24,171، پی ایچ ڈی ڈگریاں ایوارڈ کی گئی جبکہ 15-2014 یہ 21,830 کی تعداد میں تھی۔ ریاستی سطح پر تلنگانہ میں 15-2014 میں 202 اور 16-2015 میں 723 تھ جبکہ آندھرا پردیش میں یہ رجحان اور زیادہ نظر آتا ہے۔ 15-2014، 292 جبکہ 16-2015 میں 393 تک یہ تعداد بڑھ جاتی ہے۔ یہ اعداد وشمار اپنے ساتھ مسائل بھی لا رہے ہیں۔ بالخصوص خواتین کو ان ریاستوں میں معیاری ملازمتوں کے مواقع دستیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ اور مسلم خواتین میں سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ تعلیمی اعتبار سے مناسب رشتے کا مل پانا اور اس کے بعد ذہنی ہم آہنگی کا معاملہ، طلاقوں کی بڑھتی شرح بھی معاشرے کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ ان تمام تر مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ تعلیم کی قوت میں کئی شئے کی کمی ہے۔ جو خواتین کو ان کے جائز مقام سے دور رکھ رہی ہے۔ یہ دعویٰ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کو مردوں کے مساوی درجہ ملنا چاہیئے۔ جبکہ دونوں کی اپنی جگہ ایک علیحدہ حیثیت اور مقام ہے۔ نہ ہی فطری، ذہنی یا جسمانی اعتبار سے یہ دونوں ایک ایک درجہ میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ مردوں کے برابر حقوق طلب کیے جائے خواتین کو بطور انسان اپنی شناخت اپنے درجہ کا اپنی فطرت کے مطابق مطالبہ کرنا چاہئے۔ اور اس کاز میں تعلیم سے بڑھ کر کون سی طاقت ہوسکتی ہے۔ لیکن جس طرح پروفیسر سندر سکوئی نے کہا ہے کہ سائنس حقائق کو تاریخ، فلسفہ، ادب اور عمرانیات کی قدروں کے ساتھ معاشرے تک پہنچایا جائے تو وہ معاشرے کی ترقی وبلندی میں ممد ومعاون ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم کی قوت سے ہر کوئی فیض یاب ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں اخلاقیات اور روحانیت کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو خواتین کو مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ جن سے وہ متاثر ہیں۔ جبکہ وہ خود بھی تعلیم یافتہ ہے اور تعلیم یافتہ معاشرہ ہی کا ایک حصہ ان کے ساتھ ناروا سلوک کر رہا ہے۔ ایک پرخار وادی کا سفر خواتین نے طے کیا ہے۔ لیکن اب بھی سنگلاخ راہیں طے کرنا باقی ہے سماج میں شناخت ومقام کی منزل ابھی دور ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (لیکچرار شعبہ اُردو) حسن کھیامی گورنمنٹ ڈگری کالج بانڈی پورہ

جدید نظام تعلیم پر اقبال کے اعتراضات

علامہ اقبال تعلیم کی اہمیت سے کماحقہ آگاہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ انسان کی تہذیب باطن اور تزکیہ نفس کے لئے تعلیم کس قدر ضروری ہے۔ اقبال نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر مفکرانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا۔ ان کے تعلیمی نظریات اگرچہ ایک خاص دور سے متعلق ہیں لیکن ان کی اہمیت کو آج کے دور میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اقبال عورت اور مرد دونوں کے لئے لازمی تعلیم کے حق میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم پر بہت زور دیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نظامِ تعلیم، چاہے وہ روایتی ہو چاہے جدید نظام تعلیم ہو، اقبال کے اعتراضات بھی تھے۔ اقبال کے نزدیک روایتی اور مشرقی نظام تعلیم جو مدارس اور خانقاہوں میں رائج تھا، اپنی اصل اور روح سے ہٹ کر بہت دور جا چکا تھا۔ اصل علوم سے صرف نظر کر کے فروعی باتوں پر توجہ دی جا رہی تھی۔ اس نظام میں جمود اور کورانہ تقلید کا رویہ پایا جاتا ہے۔ اس قدیم نظام تعلیم کا نمائندہ ''مُلا'' ہے جس کے ہاں دین کی اصل روح مفقود ہے۔ اقبال مختلف انداز سے اس پر طنز کرتے ہیں:

قوم کیا چیز ہے ، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دورکعت کے امام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام!

اس قدیم نظام کے پہلو بہ پہلو جدید نظام تعلیم رائج تھا جسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انگریزوں نے متعارف کرایا۔ فورٹ ولیم کالج میں اُردو زبان وادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کو بھی امداد ملی۔ اقبال کو اس جدید نظام کا بہت تجربہ تھا، کیونکہ انہوں نے مشنری اداروں، گورنمنٹ کالج لاہور اور انگلستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھا تھا۔ وہ اس نظام کی خرابیوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ چنانچہ بعض وجوہ کی بنا پر وہ جدید نظام تعلیم

کومسترد کرتے ہیں۔ایک تو یہ کہ اس تعلیم سے جو نئی نسل پیدا ہورہی ہے اس میں صرف یہی نقص نہیں ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کے دینی اور روحانی اصول پر قائم نہیں ہے بلکہ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں یورپین قوموں کی خصوصیات بھی نہیں پائی جاتیں:

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ!

اقبال کے نزدیک الحاد، بے دینی اور مذہب سے بیزاری کی خرابی اس نظام میں بنیادی اہمیت کے حامل ہے، کیونکہ اس نظام کے پس منظر میں مغربی طرزِ فکر کارفرما تھی جس میں مذہب کو سیاست سے جدا کر کے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا تھا ؎

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
لی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش سے فقط دین ومروت کے خلاف

علی گڑھ کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی اس دور میں جدید تعلیم کا سمبل تھے۔اقبال اس طرز تعلیم کے مرید نہ تھے۔۱۹۱۰ء میں اقبال علی گڑھ میں اپنے خطبے ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں فرماتے ہیں ''مجھے رہ رہ کر یہ رنجیدہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال قائم رہی تو اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔'' یہ چیز اقبال کی مایوسی کو ظاہر کرتی ہے۔ان کے خیال میں اس

سے ہمارا دینی تشخص اور شناخت ختم ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزازا
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تنزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدالا الہ اللہ

بے ربطی خیال اور پراگندگی خیالات کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ نوجوان مذہب کو فرسودہ اور ناقابل عمل توہمات کا مجموعہ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ مذہب سے بیگانگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں الحاد اور لادینیت ان کے منتشر اور پراگندہ ذہن و دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

اقبال نے جدید تعلیم کی غرض و غایت پر غور کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ تعلیم محض مادی اور محدود نوعیت کی ہے۔ جس میں فکر معاش کو اولیت حاصل ہے اور یہ بے مقصدیت کی طرف لے جاتی ہے۔ جب کہ علم کا مقصد معاش کے ساتھ قلب و ذہن کی وسعت بھی ہے۔ ان کے خیال میں جدید تعلیم انسان کو معاش کا لالچ دے کر اس کے قلب و ذہن اور صلاحیتیں رہن رکھ لیتی ہے۔ اس تعلیم کا مقصد محض معیار زندگی کی بلندی ہے اور اقبال ایسی تعلیم کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔

وہ علم نہیں ، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو!

ایسا نظام تعلیم انفرادی مقاصد رکھتا ہے اور اجتماعیت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس کا مقصد معاش ہے مگر یہ معاش بھی مکمل نہیں بلکہ یہ دفتری نظام کے معمولی کل پرزے اور نچلے درجے کے کارندے پیدا کرنا ہے۔ اقبال کے زمانے میں مسلمانوں کو اعلی سائنسی و فنی تعلیم نہیں دی جاتی تھی اور محض عام تعلیم کے بعد معمولی کلرک بنا دیا جاتا تھا۔ موجودہ طریقہ تعلیم مسلمانوں کی قومی اور تاریخی زندگی سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

شکایت ہے مجھے یا رب ! خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

ڈاکٹر سید عبداللہ اقبال کے تعلیمی نظریات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: ''اقبال کی نظر میں مروجہ انگریزی طرز تعلیم کا بڑا عیب یہ ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ تعقل زدہ ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ عیب اس کا یہ ہے کہ یہ عملی تجربے سے بھی محروم ہے اور یہ چند نظریات کی تکرار ہے جو یقینی تجربے کی پیداوار نہیں بلکہ دوسری اقوام سے بلا تنقید لے لئے گئے ہیں۔'' اسی طرح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں ''مغرب نے اپنی تمام عقل عالم محسوسات پر تصرف حاصل کرنے میں صرف کی ہے لیکن دماغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ دل بے نور ہوتا گیا۔ یہ تہذیب عالم روحانی کی منکر اور الحادکی طرف مائل ہے۔ اس کی ظاہری ترقی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ لیکن اس میں حقیقی انسانیت کا جوہر ماند پڑ گیا ہے۔

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

اقبال کی سنجیدہ رائے یہ ہے کہ جدید تعلیم نے انسان کو اخلاقی و روحانی تربیت سے قطعی بے بہرہ کر دیا ہے قلب و روح کی نشونما، روحانی ارتقا، تزکیہ نفس اور پاکیزگی اخلاق جیسے اوصاف سے بالکل صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ جس کے سبب طلباء کے کردار اور شخصیت کی تشکیل غیر متوازن اور غیر متناسب خطوط پر ہوتی ہے۔ اور ان کی زندگی بجائے رابط و نظم اور ہم آہنگی کے، بے اعتدالیوں اور تخریب کی حامل بن جاتی ہے۔

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ!

نوجوان کے خون میں آزادی و حریت کی گرمی ہوتی ہے لیکن موجودہ نظام تعلیم اس حرارت کو سلب کر چکا ہے، نتیجہ کے طور پر تعلیم یافتہ نوجوان فرنگی کا صید زبوں بن کر رہ گیا ہے۔

آہ مکتب کا جوان و گرم خوں ساحر افرنگ کا صید زبوں

اقبال کے نزدیک جدید نظام تعلیم میں ایک اور خرابی یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے انسان کی خودی، اعتماد اور مشرقی روایات کو ختم کر دیا ہے نا امیدی اور بے یقینی کا لازمی اثر یہ ہوتا

ہے کہ انسان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موموں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
تعلیم کے تیز اب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیرا

اقبال قدیم اور جدید دونوں نظاموں سے غیر مطمئن اور مایوس ہیں۔انہوں نے دونوں کو مسترد کر دیا ہے کیونکہ ان سے نہ تو فرد کی شخصیت بنتی ہے نہ ہی علمی تشخص اور نہ ملت کے لئے مفید بننے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے
اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی ، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ ونظر کا فساد!
مرے کدو کوغنیمت سمجھ کر بادۂ ناب
نہ مدر سے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے

مذکورہ بالا اعتراضات کے باوجود اقبال تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے بلکہ اس پر بہت زور دیتے ہیں۔اقبال تعلیم کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ تعلیم محض مجروح معلومات کے حصول کا نام نہیں بلکہ یہ کچھ واضح مقاصد اور مفاہیم رکھتی ہے۔وہ تعلیم برائے زندگی کے قائل ہیں ان کے نزدیک تعلیم زندگی کو آراستہ و پیراستہ کرتی ہے اور اسے منفی وتخریبی قوتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔اور یہ سب کچھ خودی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔لہٰذا اقبال کے نزدیک تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد استحکام خودی ہے۔

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اقبال کے نزدیک تعلیم کا ایک بڑا مقصد خدا تعالیٰ کی پہچان ہے۔ وہ مذہبی و دینی تعلیم کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ تعلیم خواہ کیسی ہو متعلم کا رشتہ مذہب سے استوار رہنا چاہئے۔ اقبال کے دور میں جدید نظام تعلیم میں مذہب کا کوئی مقام نہ تھا۔ دینی اور اخلاقی اقدار ثانوی حیثیت رکھتی نہیں۔ چنانچہ علامہ اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال کے فلسفہ تعلیم میں تعلیم نسواں کا نکتہ بہت اہم ہے۔ وہ خواتین کے لئے تعلیم لازمی قرار دیتے ہیں۔ اقبال خواتین کو دی جانے والی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''یہ بات نہایت ضرورت ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر، خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے۔'' جدید تعلیم بظاہر بڑی دلکش ہوتی ہے مگر انسان کے دل کے لئے موت ثابت ہوتی ہے۔ وہ مشرق کی شناخت کو ختم کر دیتی ہے اس کا تشخص ختم کر دیتی ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں'' مگر اس شرط پر کہ ''میں آزاد نظام تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم بھی دیگر امور کی طرف قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔ ہمارے مقاصد کے پیش نظر مسلم بچوں کے لئے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے۔ ایسے تمام مضامین جس میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے، احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں کے نصاب سے خارج کر دیئے جائیں۔''

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

اقبال کا تعلیمی فلسفہ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یعنی وہ روحانی ضروریات کے ساتھ ساتھ مادی و معاشی تقاضوں سے بھی غافل نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے فنی و صنعتی تعلیم پر بھی

زور دیا ہے۔تا کہ طلبا جدید سائنسی اور دیگر فنی علوم بھی سیکھیں۔اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

''تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایک ایسی قابلیت کا پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسن وجوہ اپنے تمدنی فرائض کے ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔مسلمانوں کو تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر زور دینا چاہئے۔ واقعات کی رُو سے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی اس نہایت ضروری شاخ کی طرف توجہ نہیں کرے گی وہ یقیناً ذلیل وخوار ہو جائے گی۔''

اقبال کے نزدیک طلباء کی اخلاقی وروحانی تربیت بھی بے حد ضروری ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ متعلمین میں بصیرت ، جذبہ عشق ، اور خودی کے استحکام کے ساتھ ساتھ محبت واخوت، مساوات انسانی، حق وصداقت اور دیگر اخلاقی اوصاف بھی پیدا ہوں۔اقبال کے نظریہ تعلیم میں کشمکش حیات، جدوجہد اور تسخیر کائنات کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ ایسے علم کے خواہشمند ہیں جو انسان کو تحریک پر آمادہ کرے۔ علمی جدوجہد پر ابھارے اور تسخیر کائنات میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل بنائے۔وہ ہمیشہ حق وصداقت کا علمبردار اور باطل کا مخالف ہو۔اقبال کے فلسفہ تعلیم کے بارے میں حتمی بات یہی کہی جا سکتی ہے کہ''اقبال کے نظریہ تعلیم کے لئے کلیدی حیثیت صرف اس نکتے کو حاصل ہے کہ تعلیم کو مسلمان بنایا جائے۔'' نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ موجودہ دور کی تعلیم میں جو اخلاقی وتہذیبی گھراوٹ آرہی ہے یہ سب اسلامی تعلیمات سے دور ہونے کا نتیجہ ہے۔اسلامی تعلیم میں انسانیت کا درس دیتی ہے اور اس وقت پوری دنیا انسانیت کا رونا رو رہی ہے اور مسلمانانِ عالم مسلمانیت کا رونا رو رہے ہیں۔جب انسانیت ختم ہو جائے گی تو مسلمانیت بھی گم ہو جائے گی اور جب مسلمانیت ختم ہو جائی گی تو دنیا میں اخلاقی اور تہذیبی گھراوٹ آئے گی۔موجودہ تعلیمی نظام میں معاشیات پر تو زور دیا جاتا ہے پر اخلاقیات پر نہیں کیونکہ موجودہ دور میں زندگی کا مقصد فکرِ معاش کو بنایا گیا ہے اس نظریہ کی نفی کرتے ہوئے اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کو حاصل ہے جہاں میں دوکفِ جو

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ۔ کشمیر

جدید تعلیم اور مسلمان

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ ''علم'' ہے اور اسی کے معنی کسی چیز کا ادراک حاصل کرنا ہے۔ تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں جب تک نہ طالب علم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

انگریزی زبان کا لفظ Education لاطینی لفظ Edex بہ معنی نکالنا اور Ducer-Dug بہ معنی رہنمائی سے ماخوذ ہے لفظی طور پر اس کا معنی معلومات کا جمع کر دینا اور مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا ہیں۔

تعلیم یا علم کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں کئی طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں جیسے تعلیم کیا ہے؟ کیا صرف درس وتدریس کا نام تعلیم ہے؟ کیا کاغذ کی چند ڈگریاں حاصل کرنا ہی تعلیم ہے؟ ان سب سوالات کا ایک باشعور انسان نفی میں جواب دیے گا کیونکہ اہل دانش تعلیم کو ایک ایسا عمل مانتے ہیں جس سے فرد یا قوم کا احساس وشعور خود آگاہی کے رموز سے واقف ہو جائے اور اس کا فہم وادراک ترقی کرے جو کہ ایک مسلسل عمل ہے اور یہ سارا عمل بعد میں فرد یا قوم کی سرخ روئی کا سبب بنتا ہے۔ یہ وہ آفاقی اور غیر تغیر پزیر عمل ہے جس سے ہر آنے والی نسل اپنے سے بعد کے نسل کے لئے ایک واضح میدان عمل کی نشاندہی کرتی ہیں جہاں زندگی گزارنے کا طریقہ کے ساتھ مقاصد اور فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے ایک قوم اپنی پہچان، اپنی تہذیبی وفکری ورثے کو آئندہ کے نسل تک پہنچا تا ہیں اور ان کے اندر زندگی اور قوم کے مقاصد سے لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو ذہنی وجسمانی عمل کے ساتھ اخلاقی اور فکری تربیت بھی کرتا ہے۔ تعلیم کا مقصد سماج میں تہذیب یافتہ اور با

شعور افراد کو پیدا کرنا ہوتا ہے جس سے سماج یا قوم بہتر انداز سے اپنے فرائض انجام دے سکیں۔

جان ملٹن تعلیم کے تعلق سے لکھتے ہیں

’’جو انسان کو بحالت جنگ و امن اپنی اجتماعی اور نجی زندگی کے فرائض دیانت و مہارت اور عظمت کے ساتھ اداء کرنے کے لئے تیار کرتی ہے‘‘

ڈاکٹر محمد اقبال تعلیم کے تعلق سے ایک خط میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

’’علم سے میری مراد وہ علم جس کا دار مدار حواس پر ہو عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔‘‘

مغرب و مشرق کے مفکرین کی آراء کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں علم نام ہے عمل کے ساتھ ساتھ احساسات و ادراک کا، شعور کی ترقی کا، فکر و نظر کے اعلیٰ و ارفع مقام کا جہاں بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح و بہبودی ہوتی ہیں جو کہ ہر تہذیب یافتہ معاشرے کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

آج تک کی تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں مین تعلیم کا اہم رول رہا ہے جیسا کہ برطانیہ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں وہاں نئے پبلک اسکولوں کا وجود میں آنا، امریکہ کی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد آزاد تعلیم کا شروع ہونا، جاپان میں مسیحی ریفارمیشن کی تحریک میں نئے تعلیمی نظام کے کردار کا ابھر کر سامنے آنا اور روسی انقلاب میں اشتراکی تعلیم ترقی ان سب تبدیلیوں میں تعلیم کی اہمیت اور اس کے موثر طریقہ کار کو واضع کرتا ہے۔ جب ہندوستان میں برطانوی سامراجیت اور اس کو دوام بخشنے کے لئے میکالے کا نظامِ تعلیم متعارف کیا گیا تو اسی دور میں ہندوستانی مسلمانوں نے دارلعلوم دیوبند، علی گڑھ اور ندوالعلوم جیسے اداروں کی بنیادیں رکھیں۔ مسلمان قوم کے صاحب فکر و نظر افراد نے قوم کی ذبوں حالی کے تدارک کے لئے ابتدائی کام شروع کیا تھا لیکن بعد مین ہماری کم فہمی نے ان سارے اداروں میں ذہنی و فکری جمود کی فضاء قائم کی جس سے وہ نتائج برآمد نہ ہو سکے جس کے لئے ان

کی بنیادیں رکھی گئی تھیں۔

عصر حاضر میں جب ہم تعلیم کی بات کرتے ہیں تو ہمارے یہاں اس کو سابقہ و لاحقہ سے جوڑا جاتا ہیں اور لفظ تعلیم کو ایک مخصوص معنی میں لیا جاتا ہے اور جب مجھ جیسے تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اکثر بزرگوں کی بھونیں تن جاتی ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کی یہ لوگ دارالعلوموں سے انجینیر اور ڈاکٹر جبکہ علی گڑھ اور IIT سے شیخ الحدیث کی بازیافت چاہتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک ہم ایک ایسی مشترکہ چھت چاہتے ہیں جہاں شیخ احمد سرہندی (جید عالم الدین) نواب سعد اللہ خان (مغلیہ دور کا مشہور سیاست داں) اور استاد احمد معمار (تاج محل کا معمار) اکھٹے تعلیم حاصل کرسکیں اور ایک ہی چھت کے نیچے اپنی ذہنی وفکری نشو ونما کے گُل کھلائے لیکن ایسیس تجربے اب ہمارے ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔

ہمارے یہاں جونفسیات پیدا ہوچکی ہیں اس میں دین و دنیا کو دو الگ الگ چیزیں شمار کی جاتی ہیں اس طریقہ فکر نے ہماری انکھوں کو وحدت نظر Unity of vision سے محروم کر دیا ہے ہماری حالات اس شخص جیسی ہوگئی ہے جس کی دوانکھیں دو مختلف سمتوں میں دیکھ رہی ہیں اور اس میں وحدت نظر باقی نہیں رہا ایسی نفسیات نے بحثیت قوم ہمیں Split Personality یعنی منقسم شخصیت کی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے جس سے قوم کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے۔اس بکھراؤ نے ہمارے اندر جو Vacuum خالی پن پیدا کیا ہے اس کو دوسرے نظریات نے بھرنا شروع کیا جس سے ہماری تنزلی کی رفتار میں اضافہ ہوا ہے ہماری حالات آج ایسی ہوگئی ہے کہ منبر ومحراب معنی و فقی موشگافیوں کو جولاں گاہ بن چکی ہے ہمارے دانش کدے اشتراکیت، دہریت اور خدا بیزاری کے مرکز کے بن رہے ہیں ایسے میں قوم کا ذرخیز ذہن (Fertilised Mind) تباہ و برباد ہورہا ہے اس غیر یقینی صورت حال میں ذہنوں میں کنفیوزن پیدا کیا جا رہا ہے اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قومیں کمزوریوں سے کہیں زیادہ کنفیوزن سے برباد

ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کی غیر منطقی ردعمل کی تاریخ طویل ہے ایک دور آیا جب یونانی علم و فلسفہ کو عربی میں ترجمہ کیا جانے لگا چونکہ ارسطو اور افلاطون متقی مسلمان نہیں تھے اور شومئی قسمت اس علم کے یہی موجد تھے تو ہمارے یہاں ان کے علم کا انکار کیا گیا اور اس کے خلاف شدت کا منفی ردعمل سامنے آیا۔ یونانی علوم کا سیکھنا ناجائیز اور حرام گردانا گیا یہی حال ۱۴۵۰ء میں ہوا جب جرمنی میں پرنٹنگ پریس قائم ہوا تو ہم نے یکہ جنبش اسے حرام قرار دیا اور ڈھائی سو سال تک ہماری قوم نے اسے شجر ممنوء سمجھ کر ہاتھ نہیں لگایا۔ ایسا رویہ ہم نے ہر اس علم وفن کے ساتھ کیا جو ہمارے یہاں شروع نہیں ہوا تھا پھر چاہے وہ تصویر ہو یا ٹی وی، وہ اجسام کی پیوندکاری ہو یا باڈی سپیکینر وغیرہ اور جب دوسری قومیں آگے نکل گئی پھر ہمیں ہوش آیا اور وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیں اپنی غلطی کا احساس کرایا لیکن اس وقت تک ہماری شکست و ریخت کی تاریخ رقم ہو چکی تھیں بعس ازیں اس احساس کمتری سے چھٹکارا پانے کے لئے ہم نے سلطان پدرم بود کا نعرہ لگایا المیہ تو یہ ہے جن کو کل تلک ہم دہریے اور زندیق کے خطابات سے نوازتے رہے ان کو ہم نے اپنی نفسیاتی برتری کا آئیڈیل کہا۔ بدقسمتی سے قوم کی نبض جن ہاتھوں میں تھی انہوں نے رفتار زمانہ کے ساتھ ہماری تعلیم وتربیت نہیں کی اور ہم کو علم وفن، سائنس وٹکنالوجی سے کوسوں دور رکھا جس میں ان کی ذاتی اور سیاسی فائدہ تھا اپنی زاتی انا اور مفادات کے خاطر ہمارا استحصال کیا۔ دنیا جب سائنس اور ٹکنالوجی کی باتیں کر رہی تھیں وہ فقی موشگافیوں اور فلسفے کی بھول بھلیوں میں گھما رہے تھے انہوں نے پوری قوم کو تقلید اور ذہنی جمود کا شکار بنایا رکھا اور اگر خدانخواستہ کبھی آوارہ ہوا کے جھونکے نے ہمارے ذہن کے دریچے پے دستک دی تو انہوں نے اپنی چرب زبانی اور تقلیدی موشگافیوں کے ذریعے ہمیں آنے والی روشنی سے اس قدر ڈرایا کہ ہم نے ظلمات کو ہی نور تصور کرلیا۔

قوم کے اس نفسیات کی بھی ایک منطقی وجہ تھی جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ساتویں

صدر (قطب الدین ایبک) میں ہمارے روابط عرب سے کمزور ہونے شروع ہوئے۔ ہمارا علمی روایت اور روابط افغانستان اور وسطہ ایشاء سے ہوئے جہاں زیادہ تر زور فقہ، اصول، عربی زبان وادب پر ہی رہا۔ آزادانہ تحقیق ومطالعے سے ہماری دلچسپی کم ہوتی گئی۔ ہم نے عربی کتابوں پر حواشیات در حواشیات لکھے۔ ہمارے یہاں علم وتحقیق کا معیار زبان دانی ٹھہری اور ہم نے شرح، شرح کی شرح، پہلی شرح پر حواشی، دوسری شرح پر حواشی، تیسری شرح پر حواشی لکھی اور اپنی ذہنی وفکری طاقت کو علم کے دوسرے درجے تک ہی محدود رکھا۔ ہمارا سارا علمی وتحقیقی معیار پست ہوگیا اور ہم نے لفظی موشگافیوں پر سارا زور صرف کیا اس لیے پانچویں یا چھٹی صدی تک جو کچھ مسلمانوں نے علم وفن میں اضافہ کیا بعد میں بہت کم اس ذخیرے میں اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں تو یہ کیفیت باضابطہ دو دبستانوں میں تقسیم ہوگئی۔ پہلا دبستان فرنگی محل (مولانا نظام الدین سہالوی) کہلایا جہاں وسطی ایشاء کے طریقہ کار یعنی متن، مختصر متن اور متن پر متن کی روایت کے ساتھ فقہ اور اصول فقہ کی بحثیں ہوتی تھیں جبکہ دوسرا دبستان جون پور میں قائم ہوا جہاں ملا احمد جون پوری کے مقلدین نے فلسفہ اور منطق پر زور دیا اور ان کی فکر ونظر کا مرکز ایران رہا اس طرح پورا قومی سرمایہ حیات ان دو دائروں تک ہی سمٹا رہا جسکا ذکر شاہ ولی اللہ نے اپنی خودنوشت سوانح میں بھی کیا ہے۔

مسلمان جب دوسری صدی ہجری میں دنیا کے تین براعظموں تک پہنچے تو ان کو نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں رومن لا Romman Law سے واسطہ پڑا۔ ایرانی تصورات سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ ہندوستانی تہذیب کے علاوہ بدھ ازم، عیسائیت اور یہودیت سے ان کا سامنا ہوا انہوں نے سب سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی فکری و نظریاتی دنیا کی تعمیر کی اور ان سب سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے اندر جو مثبت فکر ونظر ہیں اس کو اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا۔ اس بنیاد نے بعد ازیں ایک ہزار سال تک ملت کے شیرازے کو سنبھالے رکھا وگرنہ عرب میں جب اسلام کا سورج طلوع ہوا

توبقول بلاذری قبیلہ قریش جو کہ تمام عرب پر سیاسی وسماجی برتری رکھتا تھا اس قبیلے میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن عرب سے طلوع ہوئے سورج کی منور کرنوں کی ضیاپاشیوں میں بعد ازیں البیرونی، الرازی، ابن الفرناس، الخوازی، الفارابی، ابن سینا، جابر بن حیان وغیرہ جیسے درخشاں ستارے جگمگائے جن پر اج ہم اپنی برتری کی عمارت کو قائم کیے ہوئے ہیں۔

اسلام سراپا علم بن کر آیا۔ اسلام کی ابتداء ہی ''اقراء'' سے ہوئی لیکن آج اس کے ماننے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ 1.8 بلین کی آبادی میں 775 ملین بالغ افراد ان پڑھ ہیں۔ 2010 کے اعداد شمار کے تناظر میں بات کریں تو ہمارے یہاں یونیورسٹیوں کی تعداد 2313 ہے جبکہ ہم پچپن سے زائد ممالک پے حکومے کرتے ہیں اس کے برعکس اکیلے USA میں 2138، برازیل میں 1844 اور فلپین میں 1321 یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ مسلم ممالک نے 2010 تک 5933 ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تفویض کی ہیں جبکہ اکیلے فن لینڈ نے 7722، چائنہ نے 48987 اور یو۔ایس۔اے نے 49096 پی۔ایچ۔ڈی ہولڈرز نکالے ہیں۔ دنیا کی دس بہترین یونیورسٹیوں میں ہمارا کہیں نام ونشان نہیں اور سو بہترین یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی دو یونیورسٹیوں نے جگہ بنا پائی اور ان سو میں سے چوپن یونیورسٹیاں یوایس اے کی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی پچاس بہترین یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی دو یونیورٹیاں جگہ بنا پائی جن میں Sains Malisia اور Kng Fahid University Of Petrolium and Minerals شامل ہیں۔ انجینرنگ میں ہم خالی ہاتھ ہیں۔ لائبریوں کا حال یہ ہے کہ مسلم دنیا کوئی بھی لائبری USA کی Library of Congress کا مقابلہ نہیں کر پا رہی ہیں جہاں 34528818 کتابیں موجود ہیں جبکہ بوسٹن پبلک لائبیری میں 19090261، ہاورڈ یونیورسٹی میں 16342365 اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں 11545418 کتابیں موجود ہیں اوران میں سے کسی بھی لائبری کے مقابل ہم ٹھر پا رہے ہیں۔ یہودی ابادی کے لحاظ سے

ہم سے 117% کم ہیں لیکن 180 نوبل پرائیز ز جیتے جبکہ مسلمانوں نے 9،خلاء کا سفر کرنے والے یہودی چودہ،مسلم نو،عیسائی چار سوستاسی اور ہندو تین ہے۔مسلم مما لک کی ترقی کو جانچیں تو تمام مسلم مما لک کا GAD 2012 کے تعلق سے 2.190 ٹریلین ڈالر جبکہ اکیلے چین کا 2.021 اور USA کا 1.612 ٹریلین ڈالر ہیں۔تجارت میں ہمارا تناسب 16% ہیں جبکہ عیسائیوں کا 60% ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی بیسویں صدی کی چیز نہیں بلکہ اس کا آغاز تو اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب انسان نے دو پھتروں کو ٹکرا کر آگ پیدا کی تھی آج مسلم دنیا کو گزشتہ سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ہماری زندگی کا ہر میدان خواہ وہ معیشت ہو یا ملک کا دفاعی نظام اس میں سائنس اور ٹکنالوجی کا ایک اہم رول ہے۔سائنس کا تعلق ان تمام علوم سے ہے جو ہم مشاہدے اور تجربے سے حاصل کرتے ہیں جبکہ ٹکنالوجی اس کے انطباق کے ذریعے وجود میں آتی ہے اور وہ قوت فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے ایک معاشرہ،ایک قوم اور ایک ملک اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لائق بنتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے تین میدان ہوتے ہیں جہاں ہمیشہ حرکی کیفیت رہتی ہے سب سے پہلے تعلیم کا ادارہ،دوسرا تحقیق اور تیسرا صنعت وحرفت ہے یہ وہ تین مقامات ہے جہاں پر سائنس اور ٹکنالوجی پروان چڑتی ہے تحقیق کے لیے تجربات ضروری ہیں اور تعلیم کے ذریعے ہم ان تجربات کے لیے زمین ہموار کرتے ہیے جبکہ ان دونوں کا مرکزی دائرہ صنعت وحرفت رہتا ہے اور تینوں کی صورت حال ہمارے سامنے ہیں اس لئے مستقبل کی شناخت کا دار مدار ہمارے صحیح فہم کے ساتھ ساتھ ہمارے اہل دانش کی بصریت اور ان کے عزم وارادے پر ہے تا کہ نئے دور میں نئے چلینجوں سے جب ہمارا سامنا ہو تو ہمیں شرمندگی نہ اٹھنی پڑے۔اس سب کے لئے ہمیں اپنی تہذیبی تاریخ،قومی شناخت اور ماہرانہ بصریت کے علاوہ اپنے زوال کے اسباب اور ان کے صحیح تجزیے پر رکھنی چاہے تب جاکے قوم کے لئے وہ بنیاد قائم ہوگی جس کے لئے مستقبل کا نقاد ہمیں شرمندہ نہ کر پائے۔

ڈاکٹر فریدہ تبسم ۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد

تعلیم کی اہمیت حالی کی نظر میں

(مسدس حالی کے حوالے سے)

الطاف حسین اردو ادب میں ایک ناقد ایک سوانح نگار اور ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ سرسید تحریک میں اہم رول ادا کیا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندوستان خاص کر مسلمانوں کو گوشہ گمنامی کی زندگی گذارنے پر مجبور کردیا تھا مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور تعلیمی سطح پر کافی نقصان اٹھانا پڑا۔شمالی ہندوستان میں ہزاروں مدارس کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔قوم تباہی و بربادی کے راستے پر چل رہی تھی، انیسویں صدی کے نصف اواخر میں جدید علم و آگہی اور تعمیر و ترقی کی جو مغربی راہیں کھلنے لگی تھیں اس سے مسلمان یکسر بے بہرہ دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ سرسید تحریک نے قوم کو اس پس ماندگی سے ابھارنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔سرسید کے ساتھ ان کے رفقاء اس تحریک میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اپنی بے پناہ ادبی صلاحیتوں کے ذریعہ اس تحریک کو مضبوط و مستحکم کیا ان میں ایک اہم نام الطاف حسین حالی کا ہے، چنانچہ سرسید کا خیال تھا کہ جدید انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے اس وقت تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت کمی تھی، ان کا خیال تھا کہ جدید انگریزی تعلیم سے انگریزوں اور مسلمانوں میں مفاہمت پیدا ہو سکے گی اور انگریزی حکومت میں نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے سرکاری نوکروں کا راستہ کھلے گا، اور معاشی بدحالی کے خاتمے سے دیگر تمام شعبوں میں مسلمان اپنے آپ کو مستحکم کرنے

میں کامیاب ہوسکیں گے، لیکن حآلی کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض سرکاری ملازمت کا حصول نہیں تصور کرتے تھے بلکہ قوم کی ہمہ جہت ذہنی،فکری،عملی ،سیاسی اور معاشی کامیابی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔حالی صرف ایک شاعر یا نقاد ہی نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ وہ سرسید کی صحبت میں ایک ذہنی معمار بن گئے تھے، حالی مسلمانوں میں ایک ذہنی انقلاب کے خواہاں تھے، حالی کی تحریروں میں سماجی اصلاح حب الوطنی اور قوم پرستی کا جذبہ بار بار ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ تعلیم کے ہر شعبے میں مسلمانوں اور مسلم طلباء کی بہتر کارکردگی کے خواہاں تھے۔حآلی کے یہاں تعلیمی تصور دراصل سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک اور نظریات کے زیراثر پیدا ہوا سرسید کا مقصد مسلمانوں کی ہمہ جہت تعلیمی ترقی اور علی گڑھ کالج کا قیام تھا۔حآلی کی تمام تر توجہات کا مرکز سرسید کے مقاصد کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلم مرد وخواتین دونوں میں شعور اور بیداری پیدا کرنا تھا۔حآلی نے اپنی بعض نظموں میں عورتوں کی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ان کی اصلاح ان کے مسائل کے حل کے لئے ہمیشہ کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ان کی نظموں مثلاً ''چپ کی داد'' اور ناول مجالس النساء کے ذریعے انہوں نے خواتین کی تعلیم پر زور دیا اور ان کی مظلومیت کا جونقشہ کھینچا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حالی عورتوں کو سماج میں انصاف دلانے کے حق میں تھے اور انہیں اس پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ وہ معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتے تھے وہ جانتے تھے خواتین کو تعلیم سے محروم رکھ کر کبھی معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا ان کا کہنا تھا کہ تعلیم یافتہ عورت ہی اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کرسکتی ہے، حآلی کی تحریروں اور ان کے مضامین اپنے زمانے کے معاشی وتمدنی روابط کی ترجمانی کرتے ہیں اقتصادی میلانات اور مختلف طبقات کی جذباتی اور ذہنی کیفیات کے ساتھ نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں خصوصاً ''مسدس حالی'' میں اس دور کی قوم کی حالت ان کی ذہنی کیفیت کی سچی تصویریں پیش کی ہیں حالی کا بس یہی مقصد تھا کہ قوم کو بیدار کریں اور ان میں تعلیمی جستجو پیدا کریں، اسی مقصد کے تحت انہوں نے

اس مسدس کو مرتب کیا:

''حالی خود مسدس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

''زمانہ کا نیا ٹاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر یہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی رہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے بخارات درونی جس کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا۔ دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ دھونڈتے تھے، قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے''۔ (مسدس حالؔی، ص:6)

''مسدس حالی'' کے نام سے ان کی اس طویل نظم سے اردو شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اس کا مقصد سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا اور ان کی قوت کو مہمیز کرنا تھا۔

اس نظم کو بہت شہرت ملی۔ مسدس حالی ان چند اصلاحی نظموں میں سے ایک ہے جسے تاریخی حیثیت اور تہذیبی شعور نے دستاویزی اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے ناقدین حالی کی اس مسدس کی کچھ اس طرح سے تعریف کی ہے:

شجاعت علی سنویلوی نے مسدس حالی کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسدس نے صور اسرافیل کا کام کیا ہے''

سردار جعفری ترقی ہند ادب میں اس نظم کو ایک عظیم نظم قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ہم عظیم کہہ سکتے ہیں۔ اس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا''۔

اور سرسید نے کہا ''اگر خدا پوچھے گا تو کیا لایا ہے؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں''۔

حالی اپنی اس نظم کے ذریعے نوجوانوں میں تبدیلی کے خواہ تھے وہ اس نظم میں تعلیم و ہنر کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے تھے، کہ کس طرح قوم تباہ و برباد ہو رہی ہے گھر

گھر میں کس طرح اخلاس پھیل رہی تھی، مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور اخلاقی بگاڑ نے حالی کو مسدس لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ اپنی اس نظم میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''

مولانا حالی اپنے دور کے بہت بڑے نباض تھے وہ اس بات سے واقف تھے کہ علم و حکمت کوئی جامد شئے نہیں بلکہ سدا تغیر پذیر رہنے والی حرکی توانائی ہے، چنانچہ مشورہ دیتے ہیں کہ نئے حالات اور تقاضات سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی افادیت کھو چکے ہیں اور دیگر قومیں آگے نکل گئی ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ وقت کے ساتھ چلنا ہی عقلمندی دانشمندی ہے، چنانچہ جدید علمی تحقیقات وترقیات سے دنیا میں جو انقلاب آیا تھا وہ آج بھی قابل ذکر ہے۔ آج کے نوجوانوں کو اس دور کے حالات سے کچھ اس طرح سے واقف کراتے ہیں۔

ہراک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ
ہراک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل دیکھنا ہوئے وہ
سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں علم پر خاصی توجہ دی تھی قدیم یونان، ایران اور ہندوستان تک علوم وفنون کو عربی زبان میں منتقل کر کے نئے نئے تجربات کئے۔ اس کے بعد حالی یہ کہتے ہیں کہ کس طرح تعلیم سے دور ہونے سے مسلمان تباہ و برباد ہوگئے۔ وہ ساری عزت کس طرح برباد ہوگئی۔

نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت
گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم وفن ان سے ایک ایک رخصت
مٹی خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت
رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

مسدس کے ذریعہ اسلام کی خوبیاں بتا کر حالی نے آج کے نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی تا کہ ان میں حوصلہ پیدا کیا جا سکے اور وہ علم اور علمی ترقی کے خاص نسخہ کیمیاء پر توجہ دیں وہ کہتے ہیں۔

کیا علم نے ان کو ہر فن میں یکتا
نہ ہم سر رہا کوئی ان کا نہ ہمتا
دئے علم نے کھول ان پر خزانے
چھپے اور ظاہر نئے اور پرانے
بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

یہاں یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حالی سمجھ گئے کہ اس دنیا میں اگر ترقی وقار حاصل کرنا ہو تو تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ مسدس حالی کا ہر شعر تعلیم کی اہمیت وافادیت کا ترجمان ہے۔ حالی پریشان تھے کہ کس طرح قوم کو آنے والی مصیبتوں سے بچائے اور کس طرح انھیں تعلیم وہنر کی اہمیت سے واقف کرائے اور ان میں تعلیم کے حصول کا جذبہ پیدا کریں اور انھیں آنے والی مصیبتوں سے آگاہ کریں تا کہ آنے والی تباہی سے ان کی حفاظت کر سکے۔ اس لئے تعلیم ان کے نزدیک ضروری ہے چنانچہ اپنی نوجوان قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والا
کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

حالی کافی روشن خیال تھے۔ وہ عصری تعلیم اور اس کی دور رس نتائج سے واقف تھے۔ وہ زمانے کی رفتار کو بخوبی سمجھتے تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ آج کل تمام ترقیات کا دارومدار محض تعلیم پر ہے اس لئے وہ بے چین تھے اور قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں قوم جہالت کے اندھیروں میں گھر کر برباد نہ ہو جائے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو
مبادا کہ وہ تنگ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو
توجلدی سے اٹھو اور اپنی خبرلو
وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہوتا ہے بہتر

حالی کے ان خیالات سے ان کی روشن خیالی اور دور اندیشی کا علم ہوتا ہے۔ حالی نے اپنی اس نظم کے ذریعے اس عہد کے نوجوانوں کی اصلاح کی کوشش کی اور ان میں تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے نہ صرف وناقد بلکہ بحیثیت مصلح قوم کے حالی کا مرتبہ بلند ہے۔

ڈاکٹر محمود حافظ عبدالرب مرزا۔شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی

علم وحکمت-مسلمانوں کی گم شدہ میراث
ایک لمحۂ فکر

بلا شبہ یوروپین کلاسیکی فنون کے بقاوتحفظ میں اسلامی تہذیب وثقافت کا ایک اہم رول رہا ہے۔ کیونکہ اُس وقت جب مسلمان سائنس اور صنعت وتجارت میں درج؟ کمال تک پہنچے ہوئے تھے، یورپین قومیں تاریکی کے اندھیروں میں غرق تھیں نیز مؤرخین اسے اہل یورپ کے لئے تاریک دور قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک مغربی تہذیب پر اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات کا تعلق ہے تو اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت یورپ میں سائنس وفلسفہ بالخصوص طب اور فلکیات میں جو ترقی نظر آرہی ہے اس کا سرا اسلام ہی سے ملتا ہے۔ مغرب کیا اہل تحقیق اور مؤرخین نے عرب اور مسلمانوں کی بہت سی کتابوں کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا، یہاں تک کہ امام رازی (کتاب الحاوی) وابن سینا (کتاب القانون) وغیرہ کی تصانیف صدیوں تک ان کی یونیورسیٹیوں میں شامل نصاب رہیں۔

یوروپ کے مؤرخین کی معتد بہ تعداد اس بات کی گواہ ہے کہ جب یوروپین ممالک میں سڑکیں اور ہموار راستے نہیں تھے اور ان میں روشنی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا، رات میں سفر کرنا انتہائی دشوار تھا، اس وقت اندلس اور دیگر اسلامی ممالک میں راستے بہت کشادہ اور ہموار تھے اور ان میں روشنی کے پورے وسائل اور انتظامات موجود تھے اور لوگ امن وسکون کے ساتھ بے خوف وخطر سفر کرتے تھے۔ یورپین مؤرخین نے اس بات کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ اس وقت غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ میں کثیر تعداد میں ایسی لائبریریاں موجود تھیں جن میں مخطوطات کے علاوہ ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں دستیاب تھیں نیز وہاں کتابت وطباعت کا انتہائی عمدہ انتظام تھا۔ درحقیقت اُس وقت یورپ کی حیثیت طفلِ مکتب کی تھی کوئی

صنعتی یا ثقافتی سینٹر بھی اس وقت تک یورپ میں قائم نہیں ہوا تھا۔

بلادِ اسلامیہ کی تہذیب وثقافت سے آشنا ہونے کے بعد پندرہویں صدی میں یورپ میں تہذیبی وتمدنی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔اس کے متعدد اسباب میں سے سب سے اہم اور بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل اور اپنے نصاب میں شامل کرنے کا منصوبہ ترجیحی بنیادوں پر بنایا۔بعض یورپین اسکالرز کو اس مقصد کے لئے اندلس بھیجا گیا کہ وہاں کی تہذیب وتمدن اور علم وحکمت کےمختلف شعبوں میں غواصی کر کے معرفت کے بیش بہا موتیوں سے اپنا دامن بھر سکیں۔یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ فلسطینیوں اور عیسائیوں کیدرمیان جنگ جو تقریبا دوصدیوں تک جاری رہی ان جنگوں سےبھی اہلِ یورپ کو اسلامی تہذیب وثقافت سے متعارف ہونے کا موقع فراہم ہوا۔

یہ مذہبِ اسلام کی کشش اوراس کی تعلیمات کی سچائی ہی تھی کہ جس کے مطالعہ نے جرمنی کے مشہور عیسائی مارٹن لوتھر(1483 ? 1546ء) اور جنیوا کے جون کالفن (1509-1564ء) کو عیسائیت میں اصلاح کی تحریک چلانے پر مجبور کیا۔مسلمانوں کی علمی وتمدنی ترقی کو دیکھ کر انہوں نے عیسائیوں کو حصولِ علم پر اُبھارا اور پروٹسٹنٹ تحریک کی بنیادرکھی جو عیسائی مذہب میں اصلاح کی دعوت دے رہی تھی،اس تحریک کا بانی ایک قسیس اور راہب تھا جو مروجہ عیسائیت پر نکتہ چینی بھی کرتا اور ان کے مذہبی رہنما؟ وں کے مسیحی اقدار سے دور ہونے اور مغفرت دلانے کے نام پر مال ودولت جمع کرنے کا الزام بھی عائد کرتا تھا۔وہ اسلامی تعلیم وثقافت سے بے حد متاثر تھا اور لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت دیتا تھا کہ ایمان باللہ ہی تمام برائیوں سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔اورصرف بائیبل کو ہی عقائد کا اصل سرچشمہ مانتا تھا، تاہم اس کی تشریح اس انداز سے کرتا تھا کہ اس میں اسلام کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد نے اس پر مسلمان ہونے کا الزام بھی عائد کیا۔

یورپین مؤرخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان تہذیب وتمدن والی قوم رہی ہے۔چوں کہ عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد صلیبی جنگ میں بھی شریک ہوتی تھی، اس لئے انہیں اسلامی تہذیب وثقافت کو بہت ہی قریب سے جاننے کا موقع ملا،اور اپنے پچھڑے پن کا

بھی احساس ہوا۔لہذا انہوں نے مسلمانوں کی اسی طرح سے تقلید شروع کی جس طرح آج کل مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان کی پیروی کرتی ہے۔اس وقت مسلمان جنگی ہتھیار،ساز وسامان اور دیگر دفاعی آلات کو بنانے میں بہت آگے تھے، اوران کی فوجی قوت بہت مستحکم تھی، ان سے مقابلہ کی نہ تو ان میں تاب تھی اور نہ ہی وہ ان سے آنکھ ملانے کی ہمت کر پاتے تھے۔ تاریخ میں صاف طور پر ایسے واقعات لکھے ہیں کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت ان کے مذہبی رہنما گرجا گھروں میں نصرت ومدد کے لئے ذکر وعبادت میں مشغول ہوجاتے تھے۔

مسلمانوں سے پہلے یونانیوں نے علوم وحکمت کے میدان میں بلند مقام حاصل کیا تھا لہذا انہیں کو حکمت وفلسفہ کا علمبردار گردانا جاتا ہے۔یونانیوں کی بیشتر کتابیں مسلمانوں ہی کے توسط سے یورپ تک پہنچیں۔مسلمانوں نے علم ریاضی،علم فلکیات،علم کیمیاء علم طب وغیرہ کی کتابیں جو یونانی زبان میں تھیں عربی میں منتقل کیں۔اہل یورپ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا نیز اٹالین اور دیگر یوروپین زبانوں میں ان کتابوں کو منتقل کر کے یورپ کی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب کیا۔ پندرہویں صدی کے بعد عربی کی جن کتابوں کی طباعت تسلسل کے ساتھ جاری رہی ہے ان میں ابن سینا کی کتاب القانون فی الطب،ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی کتاب الحاوی فی الطب،ابوالقاسم زہراوی کی کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف،ابن رشد کی الکلیات فی الطب،ابن زہر کی التیسیر فی المداواۃ والتدبیر، ابن ہیثم کی المناظر وغیرہ وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں،ان مذکورہ کتابوں میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں جن کے پچاس سے زائد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں مطبع کا اہم کردار رہا ہے،اگر اندلس میں کاغذ بنانے کا کام شروع نہیں ہوا ہوتا تو اس بیداری میں مطبع کا کردار سامنے نہیں آتا۔ یہ مسلمانوں کی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت سے دلچسپی ہی تھی کہ انہوں نے کتابوں کی تدوین اور کاغذ بنانے کی جانب توجہ کی،اور مطبوعات کی جھڑی لگادی، اس قدم سے علمی دنیا ایک بڑے انقلاب سے آشنا ہوئی، چنانچہ عربی مخطوطات اور کتابیں جو یورپ کی لائبریریوں میں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں وہ اسی کاغذ سازی اور مسلمانوں کی کتاب وحکمت سے شغف کے نتیجہ میں رونما ہوئیں۔ علامہ اقبال نے جب مسلمانوں کی اُن

کتابوں کو یورپ کی لائبریریوں میں دیکھا تو ان کا دل تڑپ اٹھا اور درج ذیل اشعار ان کے درِ اندرون کے ترجمان بن کر قرطاس کے پنوں پر ثبت ہو گئے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

بعض ماہرین اقبالیات کا خیال ہے کہ علامہ اقبال نے ان اشعار میں جن کتابوں کی طرف اشارہ کیا تھا وہ دراصل دینی کتابیں تھیں جو انگریز ہندوستان اور مشرقی ممالک سے لوٹ کر لے گئے اور اسے اپنی لائبریریوں میں محفوظ کر لیا، جب کہ معاملہ اس کے بالکل بر عکس ہے جسے بعض محققین کافی عرق ریزی اور ریسرچ کے بعد لکھا ہیکہ وہ بیشتر عربی کتابیں اور مخطوطات، علم طب، علم فلکیات اور دیگر عصری علوم پر مشتمل تھے۔ اور یہ وہی کتابیں ہیں جو یورپ کے مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں جن کے سبب یورپین ممالک میں زبردست بیداری پیدا ہوئی۔

یوروپ کے بعض مایہ ناز مستشرق مثلاً توماس ارنولد (1864-1930ء) وغیرہ نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے جدید علم ہندسہ عربوں سے لیا۔ اس کے بعد قدیم رومانی ہندسہ سے دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ حساب کے بنیادی فارمولے جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم پہلے اندلس میں رائج ہوئے اور پھر وہاں سے یورپ تک پہنچے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اہل یوروپ اسلامی تہذیب وثقافت سے بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں اور ان کی کتابوں سے آب پاشی کی تکنیک،فلکیات، اسطرلاب، دوائیں،اورعلم ریاضی جیسے جدید علوم حاصل کئے۔جس کے نتیجہ میں ان کے اندر فکری اور فنی شعور پروان چڑھا،اورعلم فکلیات میں اس قدر آگے بڑھے کہ ان کے لئے چاندتک رسائی ممکن ہوگئی،اورستاروں پرکمندیں ڈالنے میں بھی کامیاب ہوئے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ جدید سائنسی علوم کو مغربی ممالک سے نہ صرف سیکھیں بلکہ ان میں مہارت حاصل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کریں اور فرمان نبوی:"الحکمة ضالة المؤمن أنى وجدها فهو أحق بها "،(حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے جہاں پائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے) کے سچے مصداق بنیں۔فکری ونظریاتی یامسلکی اختلافات میں اس قدر آگے نہ بڑھ جائیں کہ صحیح بات قبول کرنے کی صلاحیت ہی مفقود ہوجائے۔اورآپسی گروہ بندی میں اس قدر اشتعال نہ پیدا ہونے پائے کہ انصاف،راستی اورخدا ترسی سے دور ہوتے چلے جائیں۔ارشاد ربانی ہے:

يـا أَيُّهَا الّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوّامِينَ لِلّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلا يَجْرِمَنّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلّا تَعْدِلُوا، اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتّقْوٰى وَاتّقُوا اللّهَ إِنّ اللّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ.☆

ترجمہ:(اے ایمان والو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے)۔

ایک عربی شاعر نے کیا خوب حکمت کی بات کی ہے:

لا تحقرن الرأى وهو موافق حكم الصواب إذا أته من ناقص
فالدُّرُّ وهو أعز شيء يُقتن ما حطّ قيمتَه هوانُ الغائص

ترجمہ:(کسی بھی شخص کی صحیح رائے کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ وہ کسی کم تر شخص کی ہی کیوں

نہ ہو۔ بے شک موتی بہت قیمتی ہے مگر اسے جمع کرنے والا غوطہ خور چاہے کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو اس کی قیمت کو کم نہیں کرسکتا)۔

شریعت کے عام نصوص بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اگر کوئی بھی مفید جملہ، یا کوئی ایسا کام جو کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہو، کسی نا اہل کے منہ سے بھی نکل جائے تو مؤمن کیلئے ہرگز مناسب نہیں کہ اسے محض اس لئے رد کردے کہ یہ ایک ناکارہ کی زبان سے نکلی ہے، بلکہ ہونا یہ چاہیئے کہ قیمتی اور مفید بات کو قبول کیا جائے، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا قائل کون ہے۔

درحقیقت مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا واحد طریقہ یہ ہی ہے کہ وہ علم وحکمت کو اپنی گمشدہ میراث سمجھیں اور جس طرح یورپ نے مسلمانوں کی علمی اور سائنسی ترقیات سے آگاہی حاصل کرکے بلندیوں کے زینے طے کیےمسلمانوں کو بھی اپنی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ترقی کے لئے ان کے ایجاد کردہ علوم سے استفادہ کرکے آگے بڑھنا چاہیےاور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

بلاشبہ اسلامی ثقافت نے انسانیت کو شعور عطا کیا اور دنیا میں تہذیب یافتہ معاشرہ کے قیام کی راہ ہموار کی۔ جدید علوم وٹیکنالوجی مسلمانوں کی اس روایت علمی کی مرہون منت ہے جس کی بنیاد آٹھ سو سال قبل اندلس کی سرزمین پر رکھی گئی اور ذہنوں میں شعور وآگہی کے انگنت چراغ مسلمانوں نے وہیں سے روشن کیے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جو قوم علم وآگہی کی نقیب اور عالمگیر تعلیمی بیداری کی محرک تھی، وہی آج جہالت کی پے در پے تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عصری علوم وفنون سے بے بہرہ ہے اور تعلیمی معیار انتہائی پست ہو چکا ہے، جو اسلامی دنیا پانچ صدیوں تک علم وفن اور سائنس وٹکنالوجی کا مرکز بنی رہی، اور علم وفن کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا رہا ہو جس کی ترقی وترویج میں مسلمانوں نے غیر معمولی خدمت انجام نہ دی ہو۔ ایجاد واختراع اور تحقیق ودریافت مسلمانوں سے شروع ہو کر مسلمانوں پر ختم ہو جاتی تھی۔ پوری دنیا کے عالم، سائنس داں اور ماہرین ان سے شرف تلمذ حاصل کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے ان عظیم الشان کارناموں سے واقف ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر نہ تو امت مسلمہ کے زوال کو عروج میں بدلا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے تشخص کو باقی رکھا جاسکتا ہے اور علم وحکمت ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے مسلمانوں کی ترقی وعزت کے دروازے وا ہوں گے۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔

ڈاکٹر ناظر حسین خان علیگ۔گھور کھپور (یوپی)

سر سید کا تعلیمی تصور

راقم نے مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

الف۔سر سید کی حالات زندگی نہایت ہی مختصر جملوں میں

ب۔پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ سے پہلے دونوں قوم (مسلم اور عیسائی) کی آپسی کشمکش وتلخیاں

۱۔مسلم قوم کے اندر انگریزوں کو لے کر کشمکش

۲۔جنگ آزادی کے بعد مسلم قوم پر انگریزوں کا غصہ اور بے اعتباریاں

ج۔سر سید احمد خاں کا تعلیمی تصور

الف۔سر سید کی حالات زندگی نہایت ہی مختصر جملوں میں:

''دنیا میں بڑے سے بڑے آدمیوں کی زندگی بظاہر اسی طرح شروع ہوتی ہے جس طرح عام آدمیوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔اس میں کوئی کرشمہ ایسا صاف اور صریح نظر نہیں آتا جس سے ان کی آئندہ زندگی کی عظمت کا سراغ لگ سکے۔لیکن جب ان کی اعلی قابلیتوں کے جوہر بتدریج اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ جو معمولی باتیں ان کی ابتدائی حالت میں ناچیز اور کم وزن نظر آتی تھیں وہی ان کی آئندہ ترقیات کی بنیاد تھیں۔'' (حیات جاوید۔حالی،ص ۲۹)

یہ اقتباس حیات جاوید کے دیباچہ سے اخذ کیا گیا ہے۔اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہر شخص کے اندر اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی خوبی عطا کی ہے۔جس سے وہ اعلی مقام تک پہنچ سکتا ہے۔سر سید نے اس خوبی کو پہچانا اور اس پر عمل کیا۔یہی وجہ ہے کہ آج وہ دنیا کے سامنے عالمی تاریخ میں اپنا نام سنہرے لفظوں میں درج کرا چکے ہیں۔

سر سید کی ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ میں کو دہلی کے ایک معزز خاندان میں ہوئی۔قسمت سے آپ کے والد اور والدہ دونوں ہی پرہیز گار تھے۔معمول کے مطابق انہوں نے روایتی تعلیم حاصل کی۔تقریباً ۲۲ برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد معاشی پریشانیوں کی وجہ سے سرکاری ملازمت کا خیال آیا۔آپ نے اپنی کوشش اور تعلق کی بنیاد پر کچہری میں سررشتہ دار کی جگہ پائی ۔ بعد میں منصف کے عہدے پر فائض ہوئے اور اس عہدے پر رہتے ہوئے مراد آباد، غازی پور، بنارس اور علی گڑھ وغیرہ جیسے شہروں میں اس خدمت کو انجام دیا۔دوران ملازمت آپ کے ذریعہ آثار الصنادید، تاریخ ضلع بجنور، تاریخ ضلع سرکشی ضلع بجنور اور اسباب بغاوت ہند وغیرہ کتابیں وجود میں آئیں۔۔سرسید نے سائنٹفک سوسائیٹی کی بھی بنیاد ڈالی۔آپ کا یہ ادبی سفر ترقی کرتے ہوئے ملازمت کے بعد بھی جاری رہا۔بلکہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد تو آپ نے اپنی باقی زندگی کو پوری طرح قوم اور ملک کی خدمت میں وقف کر دیا۔اس کے لیے بیرون ملک کا بھی سفر کیا۔واپس آکر ۱۸۷۵ میں علی گڑھ میں MAO کالج کی بنیاد ڈالی جو آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے اپنی خدمات کو انجام دے رہا ہے۔آپ نے رسالہ تہذیب الاخلاق بھی جاری کیا۔ان تمام خدمات کو انجام دیتے ہوئے آپ یہیں علی گڑھ میں ۱۸۹۸ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔آپ کی تدفین کا عمل بھی علی گڑھ میں ہوا۔

ب۔پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ سے پہلے دونوں قوم (مسلم اور عیسائی) کی آپسی کشمکش وتلخیاں۔

چوں کہ مقالے کا عنوان سر سید احمد خاں کا تعلیمی تصور ہے اس لیے ان کے تعلیمی نظریات پر بات کرنے سے پہلے اس وقت کے ماحول پر بات کرنا ضروری ہے۔

ا۔مسلم قوم کے اندر انگریزوں کو لے کر کشمکش۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی منظر نامے پر یہ وہ وقت تھا جب انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان میں اپنا پیر مضبوط کر رہے تھے۔ان کی یہ پائیداری اس قدر ہوگئی تھی کہ کہیں کہیں یہ حکومت کے کاموں میں مداخلت بھی کرنے لگے تھے۔وقت گزرتا گیا اور ان کی یہ مداخلت

بڑھتی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ انگریز کچھ جگہوں پر قابض بھی ہو گئے۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ ہندوستان میں مسلم حکومت نام کی رہ گئی تھی۔ انگریز ہر جگہ حاوی ہونے لگے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریزی مشنریاں اپنے مذہب کے فروغ کے لیے بڑی تیزی سے کام کر رہی تھیں، یعنی یہ مشنریاں اپنے مذہب کا اشتہار کرتیں اور اس کو پھیلانے کے لیے کسی بھی حد تک جاتیں۔ مسلم قوم کے لوگ اپنے مذہب کو لے کر بہت حساس تھے۔ حکومت کا انگریزوں کے ہاتھ میں جانا تو کسی حد تک برداشت کیا جا سکتا تھا مگر انگریزی مشنریوں کے کام نے سیدھے طور پر مسلمانوں کے دماغ کے ساتھ ان کے دل پر بھی وار کیا۔ یہ سب سہن کر پانا ان کے لیے ناممکن تھا۔ ان کے دل میں انگریزوں کو لے کر ایک بے چینی پیدا ہونے لگی۔ ان تمام چیزوں سے بالواسطہ طور پر کہیں نہ کہیں مسلمانوں کو ہی نقصان ہو رہا تھا۔ اس نقصان نے اس وقت ایک ایسا ماحول تیار کیا جو انگریز مخالف تھا۔ رفتہ رفہ حالت یہ ہوگئی کہ انگریزوں کے ذریعہ لائی گئی ہر شے کو نکارہ جانے لگا۔ مخالفت کی اس ضد کا شکار کبھی کبھی کچھ اچھی چیزیں بھی ہو جاتیں، جس سے قوم کو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔ جدید تعلیم کا یہ سلسلہ اسی زمرے میں ہے۔ انتہا تو یہ ہوگئی کہ جدید تعلیم حاصل کرنے والے کو انگریز تصور کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں یہ اقوال ملاحظہ کریں:

''اس کے برعکس انگریزی زبان اور مغربی سائنسی علوم کے تئیں مسلمانوں کی نفرت توہم پرستی اور تنگ نظری سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ انگریزوں سے متنفر تھے انگریزی اور جدید سائنسی علوم کو عیسائیت سے تعبیر کرتے تھے انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ جو قوم ان پر مسلط ہو چکی ہے وہ جدید علوم سے آراستہ ہے اور اسی کی بدولت طاقت ور ہو چکی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ قابض انگریز دین اسلام کو بھی ریشہ دوانیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ عیسائی مشنری کے ذریعہ اسلام کے بارے میں غلط پروپگنڈے کر رہے تھے لوگوں کو عیسائی بنایا جا رہا تھا علماء کرام انگریزی اور جدید مغربی سائنسی علوم سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے ان کے اعتراضات کا جواب دینے سے قاصر تھے۔''

سر سید کی تعلیمی تحریک ۔ڈاکٹر مشتاق احمد زرگر منتظر۔تہذیب الاخلاق ،اکتوبر ۲۰۱۲۔۱۸۸۔ص

مسلمان جدید علوم سائنس،انگریزی وغیرہ پڑھنے کو قومی جذبے کے خلاف مانتے تھے ساتھ ہی عصری تعلیم کی حصولیابی کو مذہب اور عقائد میں صریح مداخلت تصور کیا جاتا تھا۔‘‘

سر سید کا تعلیمی نظریہ اور ہماری ذمہ داریاں ۔انجینئر فرقان سنبھلی

تہذیب الاخلاق ۔اکتوبر ۲۰۱۲،ص ۱۸۱

آیئے اب دوسرے پہلو پر بھی بات کریں:

۲۔جنگ آزادی کے بعد مسلم قوم پر انگریزوں کا غصہ اور بے اعتنائیاں۔

ہندوستانی تاریخ میں سنہ ۱۸۵۷ کی جنگ کو پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جنگ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور انگریزوں کے درمیان ہوئی تھی جس میں شاہی فوج کی بری طرح شکست ہوئی۔انگریزوں کی یہ لڑائی سیدھے طور پر مسلمانوں سے تھی اس لیے ہارنے کے بعد بھی انہیں سکون نہیں ملا۔جیتنے کے بعد انگریزوں نے بدلے کے نظر سے مسلمانوں پر کاروائی کی، بلکہ چن چن کر انہیں اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔دلی شہر جو کہ مسلموں کا مرکز تھا اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ ڈھونڈنے سے بھی وہاں مسلم نہ ملتے،لوگ دلی سے ہجرت کر کے دوسرے شہروں کا رخ کرنے لگے۔اس میں بڑے بڑے شعرا بھی شامل تھے۔جو بھی جاتا پھر دوبارہ واپس نہ آتا۔حالات اس قدر بدتر ہوگئے کہ اگر کوئی مسلم دلی شہر میں آنا چاہتا تو اسے ٹکٹ لینا پڑتا۔اس سلسلے میں خطوط غالب سے یہ قول ملاحظہ فرمائیں جسے غالب نے ۵ دسمبر ۱۸۵۷ کو منشی ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا ہے:

’’واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے۔‘‘

اسی خط میں مذید فرماتے ہیں:

’’مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے ۔ جاگیردار

پینشن دار ، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں.......غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں ۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے ۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے ؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں.......... یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا ۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا ۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں ۔''

یہ بات سب پر واضح ہے کہ انگریزوں کی جنگ کس سے ہوئی تھی یا آئندہ وقت میں انگریزوں کو ہندوستان میں کس سے کس بات کا ڈر تھا ۔ اگر ان باتوں کی روشنی میں خط کا مطالعہ کریں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انگریزوں نے کس پر ٹکٹ لگایا ہوگا ۔ خط کے آخر میں غالب نے اس جملے کے ذریعہ خود ہی مسلمانوں کی بدحالی کی وضاحت کی ہے: ''ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں ۔'' یعنی جب تک انگریزی حکومت حکم نہ کرتی تب تک کوئی بھی مسلم دلی میں رہ نہیں سکتا تھا ممکن ہے اس وقت ایسی ہی حالت کچھ اور بھی بڑے شہروں کے مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوئی ہوگی ۔

سرسید کا تعلیمی تصور:

تعلیم کے حوالے سے سرسید کا یہ قول بہت مشہور ہے..

''میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے میں سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو''

یعنی دینوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی حاصل کرو کیوں کہ اگر دنیا کی ترقی میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ چلنا ہے تو دنیاوی تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا ۔ مگر دنیاوی تعلیم کے حوالے سے مسلم قوم کا نظریہ کیا تھا اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔ جدید تعلیم کے حوالے سے مسلمانوں کا یہ رویہ بہت دنوں تک ایسے ہی قائم رہا ۔ جہاں ایک طرف ہمارے دوسرے ہم وطن جدید تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے وہیں دوسری طرف مسلم قوم کے لوگ اس سے

دوری اختیار کر رہے تھے۔ حالت یہ ہوگئی کہ ہمارے ہم وطنوں کے موازنے میں ہماری دنیاوی تعلیم کا فیصد بہت کم ہو گیا۔اس کی وضاحت حالی یوں کرتے ہیں:

''جس وقت سرسید نے محمڈن کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا اس وقت مسلمانون میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہوگی؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ یعنی اس وقت سے جبکہ کلکتہ مدارس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، ۱۸۵۷ یعنی اس وقت تک علی گڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۲۰ تک پہنچی تھی جن میں ۱۷ بی۔اے اور ۳ ایم۔اے تھے۔ حالانکہ اس وقت تک ہندو گریجوایٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی، جن میں ۷۱۵ بی۔اے ۱۳۱ ایم۔اے تھے۔ نیز جو نفرت یا نا مناسبت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آئی تھی اس سے اس بات کا اندازہ بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض ان کو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی ان میں انگریزی تعلیم کے ساتھ وابستگی اور نامناسبت پیدا کرنے کے لیے کس قدر عرصہ درکار تھا؟ اور کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہم وطن قوموں کے ساتھ جو چالیس برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوڑ میں شریک ہوئے۔''

حیات جاوید۔حالی ص۔۳۶۱۔۳۶۲

دوسری طرف اس پہلے گذشتہ صفحات میں مسلم قوم کے حوالے سے انگریزوں کے رویے کا بھی جائزہ لیا گیا کہ کس حد تک انگریز مسلم قوم سے نفرت کرتے تھے۔ان حالات میں دونوں قوموں کا ایک ہونا، ساتھ ہو کر کام کرنا دریا کے دو کناروں کا ایک ہونے کے جیسا تھا۔ سرسید نے ان دونوں پہلوؤں پر غور و فکر کیا اور دریا کے ان دونوں کناروں کی دوری کو کم کر ان کو قریب لانے کی ٹھانی۔ سرسید نے محسوس کیا کہ قوم کی یہ حالت انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پھیلی ہوئی غلط فہمی اور مسلمانوں کی جدید تعلیم سے دوری ہے، جہاں تک انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمی کا سوال تھا اس کو انہوں نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کے ذریعہ بہت حد تک دور کرنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے

۔دوسرا ایک بڑا مسئلہ ان کے سامنے مسلمانوں کی جدید تعلیم کا تھا جس کے لیے آپ پہلے ہی سے فکرمند تھے۔اس سلسلے میں حالی فرماتے ہیں:

''انہوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔''

حیات جاوید۔حالی ، ص۔۱۲۳

اس کے لیے آپ نے ۱۸۶۳ یعنی دوران ملازمت میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی ۔اس سوسائٹی کے تحت انگریزی کی جدید کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جاتا۔ چوں کہ اس وقت اردو میں اس طرز کی کتابیں موجود نہیں تھیں اس لیے انگریزی سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کروا کرا سے عام کیا جاتا۔نہ صرف دوران ملازمت بلکہ ملازمت کے بعد بھی سرسید نے اپنی پوری زندگی اپنی قوم کی خدمات کے نام وقف کر دیا۔اس سلسلے میں انگلینڈ کا سفر بھی کیا۔وہاں جا کر اسٹیل اور ایڈیسن کے پرچے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کا خوب مطالعہ کیا اور واپس آ کر ہندوستان میں اسی طرز پر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ کو تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا (جو آج بھی اپنی خدمات انجام دے رہا ہے)۔اس رسالے میں سرسید اپنے مضامین کے ذریعہ قوم کے لوگوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ تعلیم کی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ سرسید کا ایک اور بڑا کارنامہ ایم اے او کالج کے قیام کا ہے۔آپ نے اس کی بنیاد ۱۸۷۵ میں ڈالی، جو آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔کالج کے طلبہ کے بہترین مستقبل کے لیے ملک کے کونے کونے سے بڑے دانشوروں اکٹھا کیا گیا۔اس میں دینوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔نہ صرف مسلم بلکہ دوسرے قوم کے طلبہ نے بھی اس کالج سے فائدہ اٹھایا بلکہ اس کالج کے سب سے پہلے گریجویٹ روشن لال ہیں جن کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔اس سے وضاحت ہوتی ہے کہ سرسید کا تعلیمی تصور اور اس سلسلے میں ان کی محنت رہتی دنیا تک ان کے نام کو باقی رکھے گی۔ انشا اللہ، آمین۔

ثمینہ یاسمین ایم اے انگلش۔حیدرآباد
Director,WORKOLOGIC. Hyderabad

Education is power.

Education with Knowledge and Wisdom is the wealth bestowed onlyon the few and the blessed ones.Allah swt says in The Qur'an (Verse 2:269) "Allah grants wisdom to whom He pleases and to whom wisdom is granted indeed he receives an overflowing benefit."

The Quran treats knowledge to reaching Iman (faith) for all Muslims, males and females, to becoming true believers. It is this knowledge of understanding- the real education that differentiates the living from the dead and the wise from the ignorant.

Education is the most powerful factor which brings changes in the world. It is the power of knowledge that brought Modernisation from the Ancient Wheel to the todays Jet, from the Zero to the Binary Systemand from the crude X-Rays to the MRI

technologies.

Education is synonymous to knowledge i.e Light and guidance - the result of which is reflected upon with the skilled and the wise heads through their living style.Education builds confidence, enlightens with knowledge, breaks the barriers to opportunities, and empowers the individuals with the never to be stolen property of wisdom.

The educated live an admirable life.They demonstrate the strength, zeal and dedication in facing challenges and in resolving issues amicably.They always have their hands ready for others.

The power of the learned personalities with great wisdom like of the prophets in Islam, their Companions (khulfa e Rashideen) or the leaders from history like Socrates (Greece) , Confucius (China), Abraham Lincoln (America) and Mahatma Gandhi or Moulana Abul Kalaam Azad from India have enslaved their people by exhibiting their knowledge, experience, understanding and virtues.They were compassionate and could rule

their minds with the help of their acquired education and morals.

As observed, Education prepares a person for life, makes him responsible for self, family, society and his community.The Educated with wisdom will eradicate the tyranny and oppressions of Body and Mind like the wind blowing the dried leaves off from the tree.He looks beyond his own self, leads his men towards progress, peace and brotherhood.

Islam too regards Education as the best of the signs from the Almighty. Hence,Islamic Education encircles TARBIYYAH, meaning promoting manners,sense of responsibility, and increase in wisdom,growth, and right upbringing of individuals.

For the same reason, Islam is regarded as a religion of life and so the formal Islamic Education System focussed more on Tarbiyyah and Aqlaaq and added Literacyas means for livelihood.Reading, writing and little Math were for a comfortableliving while Tarbiyya was for theraised quality lifeembedded with peace, fraternity and integrity for the success in the two worlds.

Humanity filled with wisdom, knowledge, morals, skills, vision and sense of responsibility is par excellent than a mere educated irresponsible professional.

Today the education system has bitterly failed in raising one from self-centric interests.It is producing professional doctors to steal human organs, trained nurses to kill infants, qualified graduates to destroy civilians, skilled architects to bomb down buildings / cities and scientists to poison the youngsters. We still have terrorism in the name of religion,Child labour to add to family's economy, disrespect to elders and hooliganism on young's in the name of modernisation.

We failed to understand the essence of education. It is not merely memorising facts or passing exams to be certified. Education should help one come out of depression and pressure of hectic school schedule, face reality of life, live in harmony, cooperation and co-existence with nature and ultimately promote brotherhood in community.

Educationmust raise one's self esteem,

nurture the native culture, and empower one from being enslaved.It is the Education and wisdom of our great learned leaders that brought us into the era of freedom, Era of development and the Era of recognition.

Islam has hence made education obligatory on every Muslim, male and female to seek knowledgeand declared that seeking knowledge is a sacred duty.Even the first few verses of Holy Qur'an that were revealed to our Holy Prophet Mohammed (?-Sallallaho Alaihi Wa'Sallam)were:

"Read in the name of your Lord who created"

"Created man, out of a (mere) clot of congealed blood"

"Read, and your Lord is the most Generous"

"Who taught by the pen"

"Taught man that which he knew not."

(Holy Qur'an 96:1-5)

It is therefore evident to acknowledge the value and power of seeking knowledge, to be educated and to spread education.

Education is needed for all. Both for men and

women. In fact if a woman of the family is educated,it is proven that the community is educated and well nurtured.

The biographies of Ummul Momineen reflects their living standards.The Learned women in Islam expressed their scholarly approach and analytical attitudes in their activities and have ruled people justly gaining their trusts.

The powerful women like the Queen Eleanor (Aquitaine), Maria Theresa (Austria), Queen Elizabeth (England) , and Indira Gandhi,Razia Sultan, Mother Theresa, Savitri Bai Phule, or Rani Lakshmi Bai from India have proved their value of education leaving behind a legacy to imitate them as role models.

Therefore, the women with education bring socio - economic changes, ensure sustainability and guarantee values in the society.The power of literacy in women will not only empowerthem, but alsobring them forward to contribute towards the development of their country.They raise the family standards with dignity and honour.

The educated women too receive their due recognition and promote improved living conditions withvalues, justice and with a sense of greater responsibility towards their society.

The Power of education in a nation is vividly visibleonly where unemployment is crushed,where poverty is abolished, inequality and corruptions are condemned, beggars are extinct and where democracy and social justice is prevailing.It is the power of education that will civilise the leaders, humble their people, help the society achieve its fundamental rights, and escalate the development in every department of life

It is also a fact that the roots of education are bitter but surely its fruits are sweet. The educated is like the Sun eliminating the darkness of ignorance, like the flower that fragrances the hands and like the golden crown in which is the diamond of honour united with intrinsic worth.

Therefore,it is wise to accept that humanity is well powered and enlightened if the education system of its Nation is truly strengthened to its core

otherwise its civilisation is jeopardised if the education system is broken or corrupted.

Hence the value and power of Education should never be underestimated. It's obviously the most powerful Niyamah (blessings) from Allah swt to the mankind.It is the only element that distinguishes a human from the beast.

It is now our duty as human beings to spread true and beneficial education in every corner of land, to invest in knowledge that pays the best interest, toeducate every individual to stand out boldly in the billions , to express confidence of self-sustenance, to gainthe strength to lead, and to look at the educated with pride.

The learned are the heirs of the Prophets, and the Prophets leave neither dinar nor dirham, leaving only knowledge, and he who takes an abundant portion is wise and worth.

آفرین بانو۔ ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عہد وسطیٰ میں تعلیمی سرگرمیاں- سرسید کی روشنی میں

اصل میں تعلیم کیا ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس کے بارے میں لوگوں کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک فلسفی اس کے معنی اپنے نظریات کے مطابق لیتا ہے تو ایک سائنس داں اپنے نظریہ کے مطابق۔ اس طرح ایک استاد اس کے معنی اپنے صلاحیت کے مطابق دوسرا معنی اخذ کرتا ہے۔ اور ایک تاجر اس کو دوسرا معنی پر محمول کرتا ہے۔ دراصل ان کے خیالات میں خود ان کا نظریہ زندگی میں چھلکتا ہے اس لیے قبل اس کے ہم تعلیم کی مختلف تعریفوں پر بحث کریں۔ یہ ضروری ہے کہ تعلیم کے لغوی معنی پر غور کریں۔ لفظ تعلیم یا ایک لاطینی لفظ (Educere) سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی پرورش کرنا ہے۔ اس مناسبت سے اس کا مطلب پرورش کرنا اور بچّے کو دماغی، جسمانی اور اخلاقی تربیت دینا ہے۔ یہ مفہوم لفظ تعلیم سے ادا نہیں ہوتا کیوں کہ تعلیم لفظ علم سے نکلا ہے جس کے معنی علم حاصل کرنا یا علم کے حصول میں مدد دینا ہے۔ مگر دراصل تعلیم سے مراد صرف علم حاصل کرنا یا علم کے حصول میں مدد دینا ہی نہیں بلکہ تربیت دینا بھی شامل ہے تعلیم کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ تعلیم در اصل انسان کی اس کے ماحول سے ہم آہنگی اور ماحول کی نئی تشکیل کا نام ہے جس کے ذریعے فرد اور معاشرے دونوں کو فائدہ پہنچے۔ ایک اور نظریہ کے مطابق تعلیم وہ عمل ہے جس سے بچوں کی مربوط اور متوازن بڑھوار قائم رکھی جاتی ہے تاکہ بچہ بڑا ہو کر ایک متوازن اور مربوط شخصیت کا مالک بن سکے۔

یہ ہوا تیرے موافق خود بخود ہوجائے گی
لاعلوم نو کا عصری آگہی کا آئینہ لے

افراد، ملت اور قوم کے بنانے سنوارنے کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ تعلیم

ہوتی ہے اس لیے اقوام وملل کے عروج وزوال کا تعلق براہ راست تعلیم سے جڑا ہوتا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ ہی زوال وپس ماندگی سے نجات پائی جاسکتی ہے اور تعلیم کے ذریعے ہی بامِ عروج تک پہنچا جاسکتا ہے۔ کامرانی وفتح مندی اور جس تعلیم میں تغیر وتبدل عمل، نئی جہتوں کی تلاش اور نئی دریافتوں کی کوشش اور روانی وبہاؤ کی کیفیت نہیں ہوتی وہ تعلیم ٹھہرے ہوئے اس پانی کی طرح ہے جو جلد ہی سڑ جاتا ہے اور مختلف بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بننے والا ہے اس لیے نظام، تعلیم، نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم لچک دار اور اصلاح وتغیر پسند ہونا چاہیے تاکہ تبدیلی واصلاح کا عمل بتدریج جاری رہے۔

عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیاں غزنوی دور سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ اس میں عربی علوم وفنون کے علاوہ فارسی زبان وادب کے داخلے کا آغاز بھی اسی دور میں مانا جاتا ہے مگر اس زبان وادب کو ترقی شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والی مسلم حکومتوں کے ذریعے حاصل ہوئی۔ مملوک، البری، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں قائم ہوئیں۔ چھوٹی بڑی سلطنتوں نے فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ہندوستان میں فارسی ادب کے ہر میدان میں مثلاً تاریخ، لغت، تذکرہ، تفسیر، تراجم، نیز یہ کہ ہر علوم وفنون پر کئی کئی تصانیف لکھی گئیں۔ مگر سب سے زیادہ جس میدان میں ترقی ہوئی وہ شاعری کا میدان تھا اور اس شاعری میں جس طرح اور جس خوبی سے استعارف، تشبیہ، حسنِ تعلیل، مراۃ النظیر اور تلمیح کا استعمال ہوا ہے دوسری زبانوں میں اتنی برجستگی اور تسلسل سے کم نظر آتا ہے۔ ہندوستانی سرزمین نے فارسی زبان کے ایسے ایسے شعراء پیدا کیے جن تک شہرتوں کے طوفان نے اصفہان وشیراز کے قصر تک ہلا دیئے جیسا کہ فارسی ادب کے ہر میدان میں ہندوستانی سرزمین پر تصنیف وتالیف کا دور چلا اسی طرح فارسی شاعری کے ہر صنف میں یہاں کے شعراء نے خوب طبع آزمائی کی۔ شاعری کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی گراں قدر خدمات بھی دیکھنے کو ملتی ہے اس میں صرف ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ ایران سے آنے والے مہاجرین کی کاوشیں بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اور ان شعراؤں نے بھی ہر صنف میں

اپنے علوم وفنون کا خوب زور دکھایا۔ فارسی زبان کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنا مغل دور میں فارسی زبان وادب کا رواج رہا اور اس کو ترقی ملی کسی اور دور میں نہیں ملتی۔ مغل دور کے شعراؤں نے تو اپنے ہنر وفن کا کمال دکھایا ہی اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے بادشاہ بھی علم وادب کا ذوق رکھتے تھے۔ اور شاعری بھی کرتے تھے۔ 'ظہرالدین محمد بابر' نہ صرف ایک عظیم الشان سپاہی تھا بلکہ یہ ایک بلند پایہ اہل علم اور قابل قدر شاعر بھی تھا۔ بابر کی ایک معروف تصنیف ترکی زبان میں ''ترک بابری'' ہے اور ایک مثنوی، مبین، جس نام سے تصنیف کی۔ اس دربار کی ''واقعات بابری'' جو کہ فارسی ترجمہ ہی اور فتاوی بابری بھی ایک مشہور ومعروف تصنیف ہے۔

''ہمایوں'' کے دربار میں بھی شعراء ادباء اور حکماء کی بھیڑ رہتی تھی۔ یہ اس کی علم نوازی اور معارف پروری کی دلیل ہے۔ اس کے عہد کی تصنیفیں ''جوالبر نامہ ہمایوں'' گلِ افشاں اور قصیدہ حفظ صحت، وغیرہ بہت قابل قدر مانی جاتی ہے۔ ''اکبر'' کی علم وفن سے دلچسپی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں ایسے ۱۱۲ ارباب کمال جمع ہو گئے تھے جو کسی ایک عہد یا ایک دربار میں مشکل سے ہی ملتے ہیں اس کے عہد میں متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں اور فارسی زبان میں ترجمہ بھی ہوئیں۔ مثلاً سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہوا جس کا نام اکبر نے ''خسرو افزاد'' رکھا اور مہابھارت کا ترجمہ جس کا نام ''رزم نامہ'' رکھا گیا۔ رامائن، کامیلہ ورمنہ انجیل، لیلاوتی، اتھرین اور چوتھے کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ تذکرہ ہمایوں واکبر، حیاۃ الحیوان یہ سب تصنیفیں اکبر کے دربار کی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

''جہانگیر'' فارسی زبان کا ایک بہترین انشاء پرداز تھا۔ یہ شعر وادب کا دلدادہ تھا۔ 'تزکِ جہانگیری' اس کا علمی شاہکار ہے اس کے دربار کی علمی یادگار تالیف اقبال نامہ جہانگیری، مائثہ جہانگیری دولتِ بیدار، انداز نامہ، مجالس المومنین، وغیرہ بہت مشہور ومعروف ہیں۔ ''شاہجہاں'' نے اگرچہ بابر ہمایوں اور جہانگیر کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اس کی زندگی علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں۔ اس کے بھی عہد میں مختلف صنف میں ادباء وشعراء نے خوب طبع آزمائی کی۔ جیسے ظفر نامہ، شاہجہانی بادشاہ نامہ، معدالآثار، ناز ونیاز اور مہر وماہ

وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''اورنگ زیب'' چار زبانوں سے واقف تھا۔عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی۔ یہ اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بھی عہد میں بہت ساری کتابیں تالیف ہوئیں۔ جیسے: فتاوی عالمگیری، ظفرنامہ عالمگیری، ثمرات الحیات، شمع و پروانہ، تذکرہ سرخوش، نغمات العشق، حسن وعشق کلمات الشعراء، قضا وقدر، طور معرفت، جبار عنصر طلسمِ حیرت، محیط اعظم وغیرہ اس کے عہد کی شاہکار تصنیف ہے۔

اورنگ زیب کی وفات دراصل مغلیہ حکومت کی زوال کی ابتدا تھی۔ جس کا خاتمہ بہادر شاہ ظفر پر ہوا۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں مسلمان تعلیمی پسماندگی کا شکار ہوئے چلے گئے اور تعلیمی میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامے انجام نہ دے سکے۔ تعلیمی بیداری کے لیے متعدد مصلحین قوم بیدار ہوئے جن میں خاص طور سے سرسید احمد خاں کی شخصیت نا قابلِ فراموش ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمی کے لیے اس میدان میں اہم کردار وانسانی ترقی کے لیے تعلیم کا حصول نہایت ضروری ہے۔ اسی نقطہ نظر کو سرسید خاں نے نہ صرف اپنی سوچوں تک محدود رکھا۔ بلکہ اس کو عمل میں لاکر رہتی دنیا کے لیے مشعل راہ بنادیا۔ سرسید نے اپنی تباہ شدہ مفلوک الحال قوم کی اصلاح اور اسے ترقی کی جانب گامزن کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے فوری طور پر دو اہم ترین تدبیریں اختیار کیں۔ ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوں جو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئی ہیں تاکہ آپسی مفاہمت کی صورت پیدا ہوسکے اور مسلمانوں کو ان کی موجودہ حالت سے نکالنے میں معاونت مل سکے۔ چنانچہ اپنے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند''، ''سرکشی ضلع بجنور'' اور لائل محمڈنز آف انڈیا'' جیسے رسالوں کی تصنیف واشاعت کی۔ موجودہ تباہی اور زبوں حالی سے نجات دلانے کے لیے عصری اور جدید انگریزی تعلیم حصول کے لیے تعلیمی اداروں اور تنظیموں کا قیام کیا اور مختلف علوم وفنون کے فروغ کے لیے انھوں نے زوردار مہم چلائی جو بعد میں ''علی گڑھ تحریک'' کے نام

سے موسوم ہوئی اور مدرسۃ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم.اے.او.کالج) کا قیام کر کے اور اس کو مثال بنا کر پورے برصغیر میں عصری اور مغربی تعلیم کے فروغ کی کوششیں کیں اور سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ کا قیام کیا جس میں انگریزی زبان کے ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم فارسی زبان میں دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ غازی پور میں بھی انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جو دراصل ان کی مجوزہ وسیع تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے ابتدائی اور تجرباتی کوششیں تھی اور بالآخر ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں 'مدرسۃ العلوم' یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ بقول سرسید احمد خاں:

''تعلیم وتربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چُنے جاتے اور ایک قاعدہ داں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے پھر اگر تم چاہو ایک ہانڈی کو آونے میں رکھ کر پکا لو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ ہنر فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے ایک متعصب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں اپنے تعصب کے بناء پر جاہل اور ناواقف رہتا ہے اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت بیکار ہوجاتی ہے اور تربیت وشائستگی تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا''۔[۲]

مذکورہ بالا اقوال سے سرسید احمد خاں کے جس قسم کے تعلیمی تصورات کی وضاحت ہوتی ہے اس کا مرکزی نقطہ ہے کہ ہندوستانیوں کو بالخصوص مسلمانوں کو تعلیم کے حصول میں سرگرم عمل ہوجانا چاہیے۔ تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے اور ہر صورت اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کرنا چاہیے کیوں کہ تعلیمی بیداری اور تعلیمی ترقی کی صورت میں ہمیں ہر حال میں باعزت اور باوقار شہری کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اور ہمارے حقوق کے حصول کی راہ بخود بخود ہموار ہوجائے گی۔ سرسید یہ قطعی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم کا معاملہ محض سرکاری

اسکولوں کے بھروسہ رہے اور یہ سب چیزیں اس وقت ممکن تھا جب تعلیمی ادارے مسلمانوں کے اپنے ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر بھی انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''ہندوستانیوں کی ترقی اس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندے، اپنے انتظام، اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کی خودسری اور مرض کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں''۔ ۳۲

سر سید احمد خاں کے تعلیمی تصورات میں مفید اور کارآمد تعلیم کے علاوہ ہندو مسلم کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد، قومی جذبے اور فروغ وطنیت، بین المسلمین اتحاد و اتفاق اور معاشی ترقی اردو زبان وادب کی توسیع و اشاعت اور عدمِ لسانی تعصب کی تیز رفتاری ہم ہم آہنگ ہونے کی سرگرمی سبھی کچھ شامل تھے اور ان سب کے لیے انھوں نے تعلیم کو ہی ذریعہ بنایا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح و مثبت رہنمائی کرنے میں اور ان کے تعلیمی تصورات میں اس نصاب تعلیم کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے جو انھوں نے ''مدرسۃ العلوم'' کے قیام کے بعد اس میں تعلیم کے لیے ترتیب دیا تھا۔ جس میں ان کی تعلیمی فکر، تربیتی سوچ اور تعلیم و تربیت سے متعلق ان کی عملی کارکردگی بھی شامل تھی ذیل میں ان کے ترتیب کردہ نصاب تعلیم کو پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) علم وادب: زبان دانی وانشاء پردازی، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور لاطینی زبان وادب کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات، مینٹل سائنس، منطق، فلسفہ اور سیاسیات۔

(۲) علم ریاضیات: علم حساب، جبر ومقابلہ، علم ہندسہ، فروعات اور علم اعلیٰ در یاضی۔

(۳) علم دینیات: فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اور سیرت اور عقائد

(۴) علم طبیعات: علم سکون، علم حرکت، علم آب، علم ہوا، علم ناظر، علم برق، علم ہیئت، علم آواز، علم حرارت اور نیچرل فلاسفی۔

(۵) علوم خاص: انجینئرنگ، علم حیوانات، اٹانوی (تشریح)، علم نباتات، طبقات الارض، علم جمادات، اور کیمیا۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت انتہائی دوراندیش تھی۔ انھوں نے اپنے دور کے حالات کے آئینے میں آنے والے سائنس ترقی کے زمانے کا نہ صرف عکس دیکھ لیا تھا بلکہ اس کے قدموں کی آہٹ اور معیار و مزاج کا ایک انتہائی تجربہ کار حکیم و نباض کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ لگالیا تھا کہ آئندہ کے سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی ترقی کے ماحول میں جدید مغربی تعلیم کے حصول کے بغیر کسی طرح بھی مسلمان ہم آہنگ ہونے والے نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی عصری تعلیم پر زور دیا ان کے ذہن میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کے حصول کا تصور تھا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ اس کے لیے سرسید احمد خاں نے جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا اور ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تشکیل کا منصوبہ بنایا جس میں عقیدہ و ایمان کے تحفظ و بقا اور مذہب وثقافت کی برقراری کے ساتھ ہندوستانی مسلمان آنے والے ترقی یافتہ حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کامیابی حاصل کریں۔

سرسید احمد خاں نہ یکسر مشرق تھے اور مغرب پسند۔ ان کا مقصد صرف اور صرف مسلم نوجوانوں کے لیے ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہنی وفکری بیداری ہو، اپنے حقوق کے حصول جرات ہو، حقائق پسندی ہو اور وقت وحالات کے قدموں کی آہٹ پہچاننے کی صلاحیت ہو اور نسل در نسل علم وفن اور ہنر وحرفت کے چراغ سے چراغ جلانے کی روایت قائم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

سرسید احمد اس طرح رقم طراز ہیں:

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر''۔

''مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ

ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ یہ فصاحت و بلاغت میں سمٹک زبانوں میں لاثانی ہے اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں، لیکن جب ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر کرنے کے ذریعے بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرح بہت توجہ کرنی چاہیے''۔

''مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے مراد صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہیں''۔[۴]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ ابتداء سے ہی اپنی تمام تر جمہ جہت خصوصیات کے ساتھ ہندوستان میں رائج رہی۔ عہد کے زوال کے بعد جب تعلیمی سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں تو دیگر مصلحین قوم بیدار ہوئے جن میں سرسید کی شخصیت ناقابلِ فراموش ہے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی و انسانی ترقی کے لیے تعلیم کا حصول نہایت ضروری قرار دیا۔ پھر ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور پھر اپنے اس نقطہ نظر کو سرسید نے ایک تعلیمی ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے ذریعے رہتی دنیا کے لیے علم و ادب کے ایک عظیم ذخیرے کے دہانے کو انسانیت کے لیے کھول دیئے۔

☆☆☆

کتابیات:

۱۔ تعلیم اور تعلیمی افکار، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، افضال احمد ڈومن پوری، مئوناتھ بھنجن، اصیلہ پریس، ۲۰۱۱ء، ص:۱

۲۔ ایضاً، ص:۱۸

۳۔ ایضاً، ص:۱۸

۴۔ ایضاً، ص:۲۰

ابو ہریرہ یوسفی۔ پورہ معروف مئوناتھ بھنجن اتر پردیش

ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت

نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے وحی اقرأنازل ہوئی، اللہ تبارک وتعالی نے اس وحی کے ذریعہ تعلیم کی اہمیت وضرورت سے آگاہ کیا، اس کے علاوہ خالق کائنات نے قرآن کریم میں متعدد آیات کے ذریعہ ضرورت تعلیم کا واضح پیغام دیا ہے، آپ علیہ السلام نے اس کو لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ خود اپنی حدث سے تعلیم کی فرضیت سے امت کو روشناس کرایا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: **طلب العلم فریضة علی کل مسلم** کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے ان فرمودات سے وضح ہوتا ہے کہ اسلام حصول تعلیم پر کس قدر مضبوطی کے ساتھ زور دیتا ہے، رہی بات دینی اور دنیاوی تعلیم کی تو بلا شبہ قرآن وسنت سے دونوں تعلیم کے حصول کا ثبوت ملتا ہے، بطور خاص دینی تعلیم کی اہمیت وفضیلت زیادہ بیان کی گئی ہے، جس کی وجہ سے دین کی بنیادی تعلیم ہر صاحبِ ایمان کے لئے فرض عین ہے۔

دنیاوی تعلیم سے انکار کسی بھی طور پر درست نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے جب حضرت آدمؑ کی تخلیق فرمائی تو ان کو بعض دنیوی اشیاء کے اسما کا علم سکھایا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اسماء سے مراد اشیاء کے خواص ہیں اور اسی کا نام سائنس ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے اہل مدینہ کو کھجوروں کی تعبیر کرتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا، مگر جب بعد میں معلوم ہوا کہ پھل کم اور خراب آئے ہیں تو آپ ﷺ نے دوبارہ اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ اپنے دنیوی امور کو بہتر جانتے ہو، کیونکہ اس کا دار ومدار تجربات ومشاہدات پر ہے، جس میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے، جس کو یہ تمام چیزیں حاصل ہوں۔ مذکورہ باتوں سے بخوبی

اندازہ ہوتا ہے کہ عصری امور کا ادراک رکھنا کتاب وسنت سے ثابت ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکی دور میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا،ہجرتِ مدینہ اور اسلامی ریاست کے قیام کے بعد نبی کریم سلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں باقائدہ طور پر تعلیم گاہ قائم کیا،حضور اکرم سلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم اور بابرکت درس گاہ سے علوم حاصل کرنے والوں نے دنیا کی امامت کی اور مشرق ومغرب تک اپنے علوم کی روشنیوں کو بکھیرا۔

مسجد نبوی میں تعلیم آغاز کے بعد اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بعد کے ادوار میں مختلف اسلامی مدارس قائم ہوتے رہے، جو پوری مسلم امت کو اسلامی اور دنیاوی تعلیم سے مستفید کرتے رہے،ان مدارس نے ایک ساتھ علماء دین، سائنس داں، ماہرین طبیعات وغیرہ تیار کرتے رہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جس وقت علم کی کوئی تقسیم نہیں تھی، بلکہ مدارس ہی میں اسلامی اور عصری علوم پڑھائے جاتے تھے۔اگر تاریخی تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے مسلمانوں نے ہی دنیا کو علم کی لازوال دولت، اقتصادی ترقی اور تکنیکی مہارتوں سے مالا مال کر دیا۔ایسے مدارس سے وہ عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں،جن کے پاس ایک طرف یونان علوم تھا تو دوسری جانب علوم قرآن میں بھی ماہر تھے۔ان مدارس میں قدیم وجدید کے حسین امتزاج کی وجہ سے جابر بن حیان جیسا سائنس داں نکلا،امام غزالی جیسے فلاسفر،امام جلال الدین سیوطی اور ابن العربی جیسے متصوف اور بوعلی سینا جیسے عظیم ڈاکٹر پیدا ہوئے۔آج کے دور میں حیرت انگیز سائنس اور جدید ٹکنالوجی کی ترقی پر جس یورپ کو فخر ہے اور اس وقت اسی کی بدولت پوری دنیا پر قابض ہے،ان سب کو مسلمانوں کے ورثے سے مدد لی گئی ہے۔

مغلیہ سلطنت کے عربی مدارس تعلیمی نظام اور تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل اس لئے ہیں کہ،اس وقت کے نظام تعلیم نے مسلمانوں کے اندر اسلامی زندگی،اسلامی تاریخ، فلسفے اور تہذیب وثقافت کا شعور پیدا کیا۔اس وقت کا ایک عالم دین ملک کے سیاسی اور دفتری نظام سے واقفیت بھی حاصل کرتا تھا،جس کی وجہ سے وہ حکومت میں مختلف عہدوں

کے لائق رہتا تھا۔

اس سلسلے میں پاکستان کے ایک جید عالم دین حضرت مولانا مفتی شفیع عثمانی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''درسِ نظامی کے ابتدائی عہد میں جو فارسی زبان اور دیگر علوم، منطق، فلسفہ، ریاضی اور حساب وغیرہ کو اعلیٰ پیمانے پر رکھا گیا تھا، یہ تو ظاہر ہے کہ یہ فنون ہمارے دینی علوم نہ تھے، نہ قرآن وسنت اور علوم دینیہ کا سمجھنا فی نفسہ ان پر موقوف تھا۔ سکندر لودھی کے زمانے سے پہلے ان میں سے بعض چیزوں کا رواج ہی نہ تھا اور ریاضی، حساب وغیرہ جو رائج تھے، وہ بھی اس لیے نہیں کہ قرآن وسنت یا دین کا سمجھنا ان پر موقوف تھا، بلکہ صرف اس لیے کہ ایک عالم دین ملکی، سیاسی اور دفتری معلومات میں بھی قابل وماہر تعلیم یافتہ انسان سمجھا جائے۔ فارسی زبان ظاہر ہے کہ قرآن وسنت کی زبان نہ تھی، مگر سلطنت کی دفتری زبان بن گئی تھی، اس لیے تمام علماء عصر اس میں بھی وہ مہارت پیدا کرتے تھے کہ اس میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نظر نہ آئیں اور اسی وجہ سے اس درس کا فاضل حکومت میں بھی ہر عہدہ ومنصب کے قابل سمجھا جاتا تھا''۔

(جواہر الفقہ، ج: ۵۔ رسالہ: اسلام کے قرن اول میں تعلیم کا نصاب)

حضرت مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغلیہ دور میں اسلامی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کے حصول پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی اور علماء کرام اس میں مہارت اسی وجہ سے پیدا کرتے تھے تاکہ وہ خود کو کسی سے کم تر نہ سمجھیں۔ لیکن برصغیر میں ایسا تعلیمی نظام جو کئی صدیوں سے رائج تھا، اس وقت تنزلی کا شکار ہو گیا جب انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھین کر ملک کو اپنے قبضے میں لے لیا اور امت مسلمہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے ملک بھر میں لبرل تعلیمی نظام کو متعارف کرایا۔ ایک مشہور ومعروف

مبصر (civil servent) سر ولیم ہنٹر (sir villiam Hunter) نے اس وقت کے تعلیمی نظام اور مسلمانوں کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔

''ہندوستان میں اقتدار پر ہمارا قبضہ ہونے سے قبل ہندوستانی مسلمان صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ علمی طور پر بھی طاقت ور تھے۔ ان کا نظامِ تعلیم ہمارے قائم نظامِ تعلیم سے بہتر تھا۔ تاہم اس کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ ایک علمی تربیت اور نکھار کے ایسے اصولوں پر مبنی تھا جو مکمل طور پر غیر معتبر نہیں تھے۔ لیکن انہیں فرسودہ طرز پر پیش کیا گیا تھا اور ہندوستان میں موجود دیگر نظام ہائے تعلیم کی نسبت یہ غیر معمولی طور پر اعلیٰ تھا۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جس سے نہ صرف انہیں علمی فوائد میسر آئے تھے بلکہ دنیوی بالادستی کا حصول بھی ممکن ہوا تھا۔

اپنے دورِ حکومت کے 75 سال ہم نے اس نظامِ تعلیم سے فارغ التحصیل افراد کو انتظامی معاملات چلانے کی غرض سے استعمال کیا۔ لیکن اس دوران ہم نے اپنے طور پر ایسی منصوبہ بندی کی کہ جس کے تحت جب ہم ایک نسل کی تربیت کر چکے ہوں گے تو ہم (مسلمانوں کے) پرانے نظامِ تعلیم کو ترک کر دیں گے اور برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسی فضا قائم کر دیں گے جس میں (ان مدارس سے فارغ ہونے والے) مسلمان نوجوان اپنے لیے معاشی و معاشرتی زندگی میں ترقی کا ہر دروازہ بند پائیں گے۔''

اس وقت مسلمانوں کا تعلیمی نظام اسلامی اور عصری علوم پر مشتمل تھا، جہاں طلبہ کو اسلامی سائنس کے طور پر علوم قرآن، تفسیر، علم حدیث اور اصول حدیث، منطق اور فقہ کے ساتھ فزکس، ریاضی کیمسٹری اور دیگر سائنسی مضامین پڑھائے جاتے تھے، گویا کہ دینی اور عصری علوم ایک ہی نصابِ تعلیم کا حصہ تھے، لیکن موجودہ دور کے نظامِ تعلیم کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے دینی اور عصری علوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، آج کے دور میں بطور خاص برصغیر میں

مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ ادارے قائم ہیں۔اسکولوں میں صرف عصری تعلیم ہی دی جاتی ہے اور مدارس میں بھی صرف دینی تعلیم پر اکتفا کی جاتی ہے،اس طریقے سے ہم نے دینی اور عصری تعلیم کے درمیان ایسی دیوار کھڑی کر دی ہے کہ ان دونوں علوم کے طالبان ایک جگہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے،جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کے بہت سے طلبہ دین سے اس قدر متنفر ہو جاتے ہیں کہ وہ صرف نام کے مسلمان نظر آتے ہیں،وہ خود کو روشن خیال اور لبرل مسلمان سمجھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں،ان میں بہت سے نماز جمعہ کی ادئیگی بھی گوارہ نہیں سمجھتے،حتی کہ وہ حلال وحرام میں تمیز نہیں کرتے ہیں۔

اسکول یا یونیورسٹی میں ہر مذہب کے طلبہ ہوتے ہیں،مسلم طلباء کے لیے حلال طعام کے انتظام کے باوجود بھی بعض مسلم طلباء اپنے غیر مسلم رفیق درس کے ساتھ انہیں کے حرام کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مدارس میں پڑھنے والے طلبہ عصری تعلیم سے اس قدر نابلد رہتے ہیں کہ راقم السطور نے بعض دینی طلباء کا مشاہدہ کیا ہے کہ ان کو انگریزی اور ہندی میں اتنی بھی دسترس حاصل نہیں رہتی کہ وہ انگریزی میں اپنا نام و پتہ لکھ سکیں۔

اگر ہم گزشتہ زمانے کی طرف نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ صرف مدارس ہی حصول تعلیم کے ذرائع ہوا کرتے تھے،اس وقت سائنس داں،ماہرین ریاضی،طبعیات وکیمیا،فلسفی،مفکر،ڈاکٹرز اور انجینئر وغیرہ مدارس ہی کے فارغ ہوا کرتے تھے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں دینی اور عصری تعلیم کے الگ الگ ادارے کیسے قائم ہو گئے،اس کے وجوہات اگر رقم کی جائیں تو شاید قابل اعتراض ہو سکتی ہیں،اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی نے اپنے والد محترم حضرت مفتی شفیع عثمانیؒ کے ایک نئے نظام تعلیم کے نظریہ پر مفصل گفتگو کی ہے،ابھی تک راقم کو ان کی بات یا تحریر دستیاب نہیں ہو سکی ہے،اس لیے اس بحث سے قطع نظر کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسکول اور مدرسے کے درمیان کھڑی کی گئی دیوار نے امت مسلمہ کو کچھ نقصان ضرور پہنچایا ہے کہ ہماری نسلوں میں عصری علوم حاصل

کرنے والے بیشتر لوگ دین سے کافی دور ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی رواں دواں ہے، جب تک ایک نئے نظام تعلیم پر توجہ مرکوز نہیں کی جائے گی تو یہ دوری بڑھتی جائے گی۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک صاحب نئے نظام تعلیم کے تحت چل رہے ایک ادارے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پچھلے چند برسوں میں کچھ مسلم مفکرین ودردمند حضرات نے اس جانب توجہ کی اور اپنے عصری تعلیمی اداروں میں بچوں کے لیے دینی تعلیم کا مکمل انتظام بھی کیا۔اس سلسلے کی سب سے بڑی مثال ریاست کیرالا میں قائم ''نالج سٹی'' کی ہے۔ جہاں طلبہ پر اپنی عصری تعلیمی ڈگری کے ساتھ اس دوران دی گئی دینی تعلیم کا امتحان بھی کامیاب کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔اس طرح یہاں کے فارغ طلبہ اپنے عصری تعلیم کے میدان میں مہارت کے ساتھ دینی تعلیم، فقہی وشرعی مسائل وغیرہ سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں''۔

مذکورہ ادارے کے علاوہ بھی ہندوستان میں ایک ایسا بڑا ادارہ جامعہ اشاعت العلوم اکل کواں ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ ہندوستان میں پہلا ایسا بڑا مدرسہ ہے، جہاں مذہبی اور عصری تعلیم کا باضابطہ نظام ہے، درس نظامی کے تمام شعبے یہاں اسی نہج پر قائم ہیں، جو دارالعلوم دیوبند کے ہیں، البتہ وہیں پر بہت سارے کالجز بھی ہیں، جہاں مکمل اسلامی اور دینی ماحول میں ڈاکٹرز اور انجینئر اسلامی وضع قطع کے ساتھ تیار ہوتے ہیں، یہاں پر دینی طلبہ کو بھی عصری تعلیم کے بھرپور مواقع دیئے جاتے ہیں، اس جامعہ میں دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ایسا اسلامی ماحول میسر ہوتا ہے، جیسا دارالعلوم دیوبند میں رہتا ہے، جس کی وجہ سے دو طرح کے طلباء میں ظاہری کوئی امتیاز نہیں رہتا ہے، اس لیے اسے نظام تعلیم پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، تاکہ اسکول اور مدارس کے درمیان جو خلا ہے، وہ پر ہوسکے، یا ان کے درمیان جو دیوار ہے، اس کو منہدم کیا جاسکے۔

احمد نور عینی ۔ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

جدید طریقۂ تعلیم اور نبوی طریقۂ تعلیم

ایک تقابلی مطالعہ

حامدا و مصلیا امابعد

تقریبا ساڑھے چودہ سال پہلے کی بات ہے کہ ہر سمت جہالت کا اندھیرا تھا، جاہلیت کا بسیرا تھا،علم کا چراغ کہیں دور گاہے گاہے ٹمٹماتا تھا، بادصرصر کی تاب نہ لاکر پھڑ پھڑاتا تھا کہ اچانک فاران کی چوٹی سے علم کی کرن پھوٹتی ہے، جہالت وجاہلیت کی تیرہ شبی سپیدہ سحر سے آشنا ہوتی ہے، اقرا باسم ربک کے ذریعہ علم کی پرسوز لو سلگائی جاتی ہے، شمع سے شمع جلائی جاتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی دور ہوتی ہے اور ''انما بعثت معلما'' کی صدائے بازگشت سے پوری دنیائے انسانیت گونج اٹھتی ہے، آیئے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں کہ اتر کر حرا سے سوئے قوم آنے والے اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لانے والے نے جہالت کا خاتمہ کرنے کے لئے تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس کی خصوصیات میں اور جدید طریقہ تعلیم میں وہ خصوصیات کس قدر پائی جاتی ہیں۔

حضرات! یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ تعلیم کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جارہا ہے، وہ طالبان علوم کے مزاج و مذاق اور ان کی نفسیات کے اعتبار سے کتنا موزوں ہے اور مضمون و مفہوم کو آسان سے آسان تر بنانے میں اپنے اندر کس قدر عمدگی و مہارت رکھتا ہے، نیز پڑھائی ہوئی بات کو دماغ کے نہاں خانے میں تادیر محفوظ رکھنے میں کتنا ضامن ہے، یہی وجہ ہے کہ طریقہ تعلیم کے تعلق سے ہر دور میں تجربات ہورہے ہیں، جس کے نتیجہ میں نئے نئے نظریات وجود میں آتے رہے ہیں۔

حضرات! جدید نظریہ تعلیم وطریقہ تعلیم کا اگر جائزہ لیا جائے اور پھر نبوی طریقہ تعلیم سے اس کا تقابل کیا جائے تو یہ بات واضح طور نظر آتی ہے کہ جدید طریقہ تعلیم کی جو خصوصیات ہیں وہ نبوی طریقہ تعلیم میں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں، وقت کی قلت کی وجہ سے بطور مثال یہاں چند خصوصیات ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ تدریسی عمل میں طلبہ کو شریک کرنا: جدید طریقہ تعلیم کی ایک اہم اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ student central affroach ہے یعنی ایسا طریقہ تعلیم جس میں طلبہ برابر کے شریک ہوں، جبکہ قدیم طریقہ تعلیم کو teacher center centrd affroach سمجھا تا ہے، جس میں طلبہ کی حیثیت محض سامع کی ہوتی student کا مطلب نہیں ہے کہ تدریسی عمل کی ساری ذمہ داری طلبہ کے کاندھوں پر ڈال دی جائے اور استاد کی حیثیت محض سامع کی رہ جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ استاد کا اصل محور تو استاد کی شخصیت ہو، لیکن طلبہ بھی تدریسی عمل میں برابر درجہ کے شریک ہوں، چنانچہ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

while teacher are an

کہ شجر کی حیثیت ایک بااختیار شخصیت کی ہوتی ہے اور استاد وطالب علم دونوں برابر درجے کا ایک کردار ادا کرتے ہیں۔ اس باب کو ڈاکٹر عبدالعلیم ابراہیم نے یوں واضح کیا ہے۔

''الدرس الجید ہوالذی یبدا بالتلمیذ وینتھی بالتلمیذ، ولیس معنی ہذا ان یقوم الدرس کلہ علی ماینطق بہ التلامیذ ولکن المرار ان یشترک التلمیذ والدرس بصورۃ مستمرۃ وعادمدی واسع''۔ (الموبہ الفنی لمدرسی اللغۃ العربیہ: ۳۰)

student centrel affrood متصف طریقہ تعلیم جس بنیاد پر استوار ہوتا ہے، اسے inquiry bared learnnny کہتے ہیں، یعنی ایسا منہج، جس میں طلبہ سے سوال وجواب کے ذریعہ مناقشہ کیا جائے اور اس طرح انہیں تدریسی عمل میں شریک

کیا جائے، جدید طریقہ تعلیم کی یہ خصوصیت ہمیں نبوی طریقہ تعلیم نمایاں طور پر نظر آتی ہے، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع سے آپ ؐ نے صحابہ سے پوچھا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ یہ کونسا دن ہے؟ یہ کونسی جگہ ہے؟ ظاہر ہے یہ کوئی مشکل سوالات نہیں تھے، لیکن صحابہ کی دلچسپی اور ان کا تجسس بڑھانے کے لئے آپ نے سوالات کئے، تاکہ وہ آگے کہی جانے والی بات بغور سنیں۔ اس طرح ایک مرتبہ ایک خاتون نبی کریمؐ کے پاس آئیں اور آکر یہ سوال کیا کہ میرے والد کا اس حال میں انتقال ہوا کہ وہ حج نہیں کرسکے، کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کرسکتی ہوں؟ آپ ؐ چاہتے تو خود اس کا جواب دے سکتے تھے، لیکن آپ نے تعلیمی عمل میں اسے شریک کرنے کے لئے خود اس سے سوال کیا کہ تمہارے والدین پر اگر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا نہیں کرتیں، اس نے کہا کہ ضرور ادا کرتیں، اس پر آپ ؐ نے فرمایا: فدین الہ احق ان یقض بہ۔ ذخیرہ احادیث میں ایک بڑی تعداد ان حدیثوں کی ہے جو یہ بتاتی ہیں کہ نبوی طریقہ تعلیم sbl ہے اور hf سے متصف ہے۔

۲۔ وسائل تعلیم کا استعمال: جدید تحقیق کے مطابق علم اخذ کرنے کے اعتبار سے طلبہ کی تین قسمیں ہیں: niaul یعنی آنکھوں کے ذریعہ علم حاصل کرنے والے auditory یعنی کانوں کے ذریعہ علم حاصل کرنے والے kinestletic یعنی حرکات وسکنات کو محسوس کرکے علم حاصل کرنے والا، عربی میں انہیں بالترتیب بصریون، سمعیون اور حسیون کہا جاتا ہے۔

(new ligustic programniy) n.l.p

کے ماہر ڈاکٹر ابراہیم الفقی نے اپنی کتاب البرمجۃ اللغویہ العصبیہ میں اس کا ذکر کیا ہے (دیکھئے ص: ۲۷)

تعلیم کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا، جس میں ان تینوں طرح کے طلبہ کی رعایت کی گئی ہو vak larning style nodel کہلاتا ہے، آج کل p.p.t کے ذریعہ پڑھانے کو اسی لئے بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ اس میں طلبہ کی تینوں قسموں کی رعایت ملحوظ

ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ p.p.t کے استعمال میں اب بھی بعض حضرات کو تدریس کا تقدس پامال ہوتا نظر آتا ہے۔نبوی طریقہ تعلیم کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ اپنے زمانے کا ایک عمدہvak larning style nodelمعلوم ہوتا ہے، چنانچہ بصریون visual کی رعایت میں آپ کبھی لکیر کھینچتے اور کبھی کنکریوں کا استعمال کرتے ،مثلا ایک مرتبہ آپؐ نے ایک سیدھی کیر کھینچ کر فرمایا یہ صراط مستقیم ہے اور اس کے دونوں طرف اس سے نکلنے والی لکیریں کھینچ کر فرمایا یہ جہنم میں لے جانے والے راستے ہیں۔

اسی طرح حسیونkisenthitic کی رعایت میں آپ اشارہ سے کام لیتے اور حرکات وسکنات اور اعضاو جوارح کے استعمال کے ذریعہ اپنی بات واضح فرماتے ،مثلا ایک مرتبہ آپؐ صحابہ کے درمیان تشریف لائے ،دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں رجسٹر ہیں،ان ہی میں سے ایک میں جنتیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں اور دوسرے میں جہنمیوں کے، پھر آخر میں آپؐ نے دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔

اسی طرح سمعیون کی رعایت میں چبا کر بات کرنے کے بجائے صاف اور واضح انداز میں اپنی بات رکھتے اور اہم بات کو تین مرتبہ دہراتے۔مثلا ایک مرتبہ آپؐ نے چند گناہوں کا ذکر کیا اور جب آخری گناہ کا ذکر کیا تو تین مرتبہ فرمایا: الاوشہادۃ الزور۔۔۔۔۔

۳۔طلبہ کی نفسیات کا خیال: تدریسی عمل میں طلبہ کی نفسیات کا خیال بہت ضروری ہوتا ہے، جدید طریقہ تعلیم میں اس کی طرف کافی توجہ دی جارہی ہے۔ educationl prcycl یعنی تعلیمی نفسیات کے موضوع پر مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں، بازار میں آچکی ہیں، نبوی طریقہ تعلیم میں بھی اس پہلو سے کافی اعتنا برتا گیا ہے، مثلا بخاری شریف میں دو الگ الگ وقعات ملتے ہیں، ایک کہ آپؐ نے ایک مرتبہ مسجد کی دیوار پر تھوک دیکھا تو سخت ناراض ہوئے اور غصہ کا اظہار فرمایا۔دوسرے یہ کہ ایک دیہاتی نے مسجد نبوی میں پیشاب کیا تو آپ نے بجائے غصہ ہونے کے اسے پیشاب کرنے دیا اور بعد میں اسے نرمی سے سمجھا دیا۔ان دونوں واقعات میں طرز عمل کا جو اختلاف ہے وہ دراصل سامنے والے کی

نفسیات کی رعایت کی وجہ سے ہے کہ آپؐ نے تربیت یافتہ اصحاب کا تھوک بھی گوارا نہیں کیا اور دیہات سے آئے ہوئے نو وارد شخص کے پیشاب کو بھی برداشت کرلیا کہ اس پر غصہ ہونا اس دیہاتی شخص کی نفسیات کے خلاف تھا۔

۴۔عمل تعلیم: جدید طریقہ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ صرف نظریاتی نہیں بلکہ عمل تعلیم (praclicl educationl) پر پوری توجہ دیتا ہے۔نبوی طریقہ تعلیم میں یہ خصوصیت وافر مقدار میں موجود ہے، بطور مثال ایک حدیث ذکر کی جاتی ہے کہ ایک صحابہ نے اوقات نماز کے سلسلے میں آپؐ سے سوال کیا کہ تو آپؐ نے انہیں اپنے پاس روک لیا اور حضرت بلال کو حکم دیا کہ آج تمام اذانیں اول وقت میں دو اور آپؐ نے تمام نمازیں اول وقت پڑھائی۔دوسرے دن حضرت بلال کو حکم دیا کہ تمام اذانیں انتہائے وقت میں دیں اور اس دن آپؐ نے تمام نمازیں انتہائے وقت میں پڑھائی، پھر آپؐ نے ان صحابہ سے فرمایا، جنہوں نے سوال کیا تھا کہ ''الوقت ما بین ہدین الوقتین'' کہ نمازوں کے اوقات ان دو وقتوں کے درمیان ہیں۔

۵۔محسوس مثال کے ذریعہ وضاحت: مشکل اور پیچیدہ بات کو سمجھانے میں مثال کو بہت اہمیت حاصل ہے، مثالوں کے ذریعہ بات آسان بھی ہو جاتی ہے اور تادیر ذہن میں محفوظ بھی رہتی ہے، خاص کر غیر محسوس اور معنوں امور محسولس مثالوں کے ذریعہ بہت جلد سمجھ میں آجاتے ہیں آپؐ کے طریقہ تعلیم میں مثالوں کے ذریعہ بات سمجھانے کا کافی اہتمام ملتا ہے، مثلاً آپؐ نے قرآن پر ایمان رکھنے اور قرآنی آیات تلاوت کرنے کو مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہوئے فرمایا: قرآن پڑھنے والے مومن کی مثال اترجہ کی جیسی ہے جس کی خوشبو اور مزہ دونوں ہی شاندار ہے، جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کے جیسی ہے، جس کا مزہ تو اچھا ہے مگر خوشبو نہیں ہے، فاجر شخص جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ریمانہ پھل جیسی ہے جس کی خوشبو تو اچھی ہے، مگر مزہ کڑوا ہے اور جو فاجر قرآن نہیں پڑھتا ہے اس کی مثال حنظلہ پھل جیسی، جس کا مزہ کڑوا ہے اور خوشبو بھی نہیں ہے۔(مسلم: حدیث ۱۸۱)

انصار احمد ۔ ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

امام الہند مولانا ابوالکلام کے تعلیمی نظریات

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اس وقت سے تعلیم کسی نہ کسی صورت میں اپنا سفر طے کرتی رہی ہے۔ جب لوح وقلم کا وجود نہیں تھا تو زبانی تعلیم وتربیت انسانوں کو سکھائے جاتے تھے اور جب سے دنیا نے قلم کاغذ کا ایجاد کیا تو تعلیمی سلسلہ دھیرے دھیرے منظّم شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ اسلام سے پہلے بھی تعلیمی دستور رائج تھے لیکن جب سے اسلام دنیائے گیتی پر آیا، اول روز سے ہی اس نے تعلیم حاصل کرنے کی بات کی ہے۔ قرآن کی پہلی آیت پڑھنے کی ترغیب دیتی ہے تو دوسری جانب پہلی بار اسی سورت میں قلم کی بات رب قدیر نے کی ہے۔ اس سے پہلے دنیا قلم نام سے بھی آشنا نہیں تھی۔ ہمارے آقا ﷺ نے اپنی حدیثوں میں بھی متعدد مرتبہ علم حاصل کرنے کی بات کی ہے اور ان کا سب سے مشہور قول ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین جیسے دور دراز مقامات کا سفر کرنا پڑے، تو کرو۔ یہ نبی آخرالزماں ﷺ کے قول ہی کا ثمرہ ہے کہ عہد نبوی سے لے کر آج تک ہر دور میں بڑے بڑے محدث، مفسر، معلم اور فقہاء برسرروزگار رہے جن سے خلق خدا فیض یاب ہوتی رہی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جنھوں نے اپنی علمی صلاحیت سے نہ صرف اسلام کی خدمت کی ہے بلکہ ہندوستان کو غلامی کی زنجیر سے نجات دلانے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

تقسیم ہند کا صدمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور دو قوموں کے جس نظریے سے وہ عمر بھر لڑتے رہے اسے تسلیم کر لیا گیا لیکن اپنی تمام افسردگی کے باوجود مولانا نے آزادی کے بعد بھی اہم کارنامے انجام دیے اور ان کارناموں کا ایک اہم باب تھا آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی۔ وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے ذمہ دار تھے۔

آزادی کے بعد کے دور میں آزادی کے تعلیمی نظریوں کو سمجھنے کے لیے دو باتیں پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔ایک مسلمانوں کے دینی مدارس، مکاتب اور دارالعلوم کے سربراہوں کی وہ کانفرنس تھی جو انھوں نے لکھنؤ میں طلب کی تھی یہاں ان کا زور تھا۔ان درس گاہوں میں پڑھائے جانے والے دینی نصاب کو جدید بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آج سائنس اور ٹکنالاجی، فلسفہ اور سماجی علوم میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ اس نصاب میں شامل ہوں تاکہ دینی اور دنیاوی فکر کا سنگم ہو جائے۔وہ دینی علوم سے روگرداں نہیں تھے مگر یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ ایسے علوم بھی شامل کر لیے جائیں جو آج کے دور کی پیداوار ہیں۔صرف یونانی دور کے علوم تک نہ تو خود کو محدود رکھا جائے نہ ان علوم میں جو جدید تحقیقات اور ترقیاں ہوئی ہیں ان سے آنکھیں بند کی جائیں۔مثلاً آج ان دینی مدرسوں میں یونانیوں کی تقلید میں زمین کی گردش اور آسمان کے ساکن رہنے کا نظریہ پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کانفرنس سے مولانا آزاد کے اس رویے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی، مشرقی اور دینی علوم اور مغربی اور جدید سیکولر علوم کو ملا کر ایک علمی تسلسل کو تعلیم کے لیے ضروری سمجھتے تھے گویا مشرق و مغرب کے سنگم ہی سے بہتر آگہی ممکن ہے۔

دوسرا اہم واقعہ رادھا کرشنن کی مرتبہ کتاب 'مشرق و مغرب میں فلسفے کی تاریخ' جس کا خاصہ طویل دیباچہ مولانا آزاد نے لکھا تھا۔یہاں صرف نقطۂ نظر کارفرما نہیں ہے کہ مشرق اور مغرب کی مشترک آگہی سے صحیح علم ہوتا ہے اس کے ساتھ فرد اور معاشرے کی ہمہ جہت ارتقاء کا تصور بھی کارفرما ہے۔ان کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ تعلیم محض کاروباری یا معاشی مسئلہ نہیں ہے کہ دو حرف پڑھ کر آدمی روزی روٹی کمانے لگے یہ تو محض اس کا ایک رخ ہے۔تعلیم سے مراد ہے انسان کی تعمیر نو، اس کی آزاد شخصیت کی تعمیر۔

مولانا نے جب وزارت تعلیم کی باگ ڈور سنبھالی تو صورت حال کیا تھی۔ملک تقسیم ہو چکا تھا، گاندھی جی زندہ تھے اور جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم تھے۔گاندھی جی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے اور ان کا واضح نظریہ تعلیم تھا۔وہ ملک کو مشینوں کی حکومت کی طرف لے جانا نہیں چاہتے تھے بلکہ بڑے بڑے کارخانوں کے بجائے دیہی ترقی اور گھریلو

صنعت کے فروغ کے ذریعے نئے طرز کی معشیت کے حامی تھے۔اس کے مقابلے میں جواہر لال نہرو بڑی صنعتوں کے قیام کے حق میں تھے۔سوال یہ تھا کہ ملک میں تعلیم کی نوعیت کیا ہوگی؟ایسی تعلیم جو بڑی صنعتوں میں کام آئے اور ہمارے فارغ التحصیل طلباء بڑے بڑے کارخانے چلاسکیں اور سائنس وٹکنالاجی کی تازہ ترین ایجادات پر قابو پاسکیں یا ایسی تعلیم جس کا رخ دیہات کی طرف ہو اور گھریلو صنعتوں کے فروغ میں مدد دے سکے۔ملک نے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی توازن کو اپنایا یعنی گھریلو صنعتیں بھی اور بڑے بڑے کارخانے بھی مگر رخ بڑے کارخانوں ہی کی طرف رہا اور مولانا کی تعلیمی پالیسی نے اس رخ کا ساتھ دیا۔

مولانا نے جو ملک کو تعلیمی پالیسی دی بلاشبہ ابھی تک ملک میں عام ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے میں کامیاب تو نہ ہوسکی مگر اتنا ضرور ہوا کہ آج ہمارا ملک اس پورے علاقے میں جاپان، چین اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے۔یہ وقت کی اہم ضرورت تھی اور اس ضرورت کے تحت تعلیم کے مختلف شعبوں کی تیز رفتار ترقی کا جو کام مولانا آزاد نے شروع کیا وہ واقعی بڑا اہم تھا۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مولانا آزاد کے بعد وزارت تعلیم ان جیسی شخصیت حاصل نہ کرسکی بلکہ یہ وزارت ہی اہمیت کھو بیٹھی اور اکثر وزرائے تعلیم کابینہ کی سطح کے وزیر بھی نہیں ہوتے۔اس کے علاوہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا آزاد کے متعین کردہ راستے اور ان کے اقدامات ہی اس وقت سے اس وقت تک قائم اور جاری ہیں بعد کے آنے والے وزیروں نے ان میں بہت کم تبدیلیاں کی ہیں جن کی حیثیت بنیادی نہیں ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ مولانا آزاد کا ہی بنایا ہوا ہے۔اب مولانا کے اس ڈھانچے کے چند حصوں پر غور کرتے ہیں۔

سائنسی تعلیم وترقی کے لیے شانتی سروپ بھٹناگر جیسے سائنس داں کی سربراہی میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ بنایا گیا۔ایٹمی ترقی کا ادارہ الگ وجود میں آیا اور صنعت وٹکنالاجی میں کام کرنے والے سائنسی اداروں کے لیے تو ایک طرف ’انڈین کونسل فار ایگری کلچرل اینڈ سائنٹفک رسرچ‘ قائم ہوئی تو دوسری طرف زراعت اور دیہی ترقی کے لیے ’انڈین کونسل فار

ایگری کلچرل رسرچ' کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح 'انڈین کونسل فار میڈیکل رسرچ' بنائی گئی ۔ گویا ملک میں اعلیٰ ترین سائنسی رسرچ کی داغ بیل پڑ گئی ۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ادارے وجود میں آ گئے جو اس تحقیقاتی کام کو زراعت اور صنعت کے شعبوں تک لے جا سکیں۔

اس کا دوسرا پہلو سماجی علوم اور فنون لطیفہ سے متعلق تھا۔ سماجی علوم کے لیے 'انڈین کونسل فار ہسٹوریکل رسرچ' اور 'انڈین کونسل فار سوشل سائنسیز رسرچ' قائم ہوئیں جن کا دائرہ تاریخ سے لے کر اقتصادیات، معاشیات اور سماجیات تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی سلسلے کو مکمل کر رہے دو اور ادارے ایک 'انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز' جو ہندوستان کے تہذیبی روابط کا امین تھا اور دوسرے 'انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز' جو مولانا آزاد کی سرپرستی میں سپر ہاؤس میں قائم ہوا اور بعد کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا ہیولیٰ بن گیا۔ فنون لطیفہ اور ادبیات کے فروغ کے لیے مولانا نے اکادمیوں کی بنیاد ڈالی اور تین اکادمیاں وزارت تعلیم ہی کے اشارے سے قائم کی گئیں ۔ ادب کے ساہتیہ اکادمی، رقص اور موسیقی کے لیے سنگیت ناٹک اکادمی اور مصوری وغیرہ کے لیے للت کلا اکادمی ۔ ان تینوں اکادمیوں کے سربراہ مولانا آزاد ہی تھے اور ان اکادمیوں صرف یہی کام نہیں تھا کہ وہ ملک کے مقتدر فنکاروں کو انعام واکرام تقسیم کریں بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر انھیں قومی سطح پر ایک فنی وحدت اور فروغ عطا کریں۔

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی کا ایک رخ تھا اعلیٰ تعلیم کا فروغ۔ چنانچہ اسی مقصد سے 'یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' قائم کیا گیا اور اس کے تشکیلی دور میں چنتامنی دیش مکھ کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ملک میں یونیورسٹیوں کا جال سا بچھا دیا اور اعلیٰ تعلیم کو نہ صرف مالی امداد کے ذریعے بڑھاوا دیا بلکہ نظریاتی طور پر سمت و رفتار کا تصور بخشا اور ان سبھی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں ایک ضابطہ بندی پیدا کی۔

مولانا محض وزیر تعلیم ہی نہیں تھے بلکہ ملک کی کابینہ کے ایک نہایت اہم رکن بھی تھے۔ اس لحاظ سے وہ پورے ملک کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ کانگریس کے لیے

ہندوستان اور مغربی ایشیاء کے مسلم ممالک سے قریبی رابطے کا تصور نیا نہ تھا گو اسے کانگریس کے سیاسی شعور کا حصہ بنانے میں بھی مولانا آزاد کی کانگریسی رہنما کی حیثیت سے بڑی اہم خدمات رہی ہیں لیکن جب ملک آزاد ہوا تب بھی مغربی ایشیاء کے مسلم ممالک سے تہذیبی اور سیاسی رابطوں کو اہمیت دی جاتی رہی اور مولانا آزاد نے اسی مقصد سے عربی مجلّہ 'ثقافتہ الہند' اپنے رفیق کار عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا اور تعلیمی نظام میں اس علاقے سے ہندوستان کے تعلقات کو بڑی اہمیت دی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علوم شرقیہ اور حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ادارہ علوم اسلامی کا فروغ بھی مولانا آزاد کا مرہون منت ہے۔

مولانا کو تاریخ سے خاص شغف تھا۔ دراصل وہ انسائکلو پیڈی شخصیتوں میں تھے جو علم کو اکائی سمجھتے ہیں اور اسے ادوار اور اقسام میں تقسیم نہیں کرتے۔ شق وار مہارتوں کے دور میں ایسے قد آور اور ہمہ جہت قاموسی نایاب ہوتے جاتے ہیں لیکن مولانا انسانی فکر وعمل کی پوری داستان کو ایک ہی سلسلے میں پروکر دیکھتے تھے اور اس میں ماضی اور حال کی تفریق نامناسب تھی اسی لیے مولانا کی سرکردگی میں خصوصی توجہ ہوئی۔ نیشنل آرکائیوز اور نیشنل میوزیم پر اور ان میں گذرے ہوئے زمانے کی بیش قیمت دستاویزوں اور نشانیوں کو محفوظ رکھنے میں خاص طور پر اہمیت دی گئی۔

سنسکرت اور ہندوستان کے قدیم اثاثے کی بازیافت اور اس کی تعلیم وتدریس پر بھی مولانا نے زور دیا کیوں کہ یہ علوم بھی ہمارے عظیم الشان وراثت کا اہم حصہ ہیں۔ کئی ادارے قائم ہوئے، یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز خاص اسی مقصد سے بنائے گئے اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہو رہا تھا جب ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور پورا برصغیر ان کی زد میں تھا، کدورتیں اور رنجشیں ہمارے مشترکہ ورثے کو تنکے کی طرح طوفان میں بہائے لیے جارہی تھیں لیکن آزاد کی بصیرت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ ان کی نگاہ مستقبل پر جمی ہوئی تھی اور وہ صاف طور پر دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا اگر کوئی مستقبل ہے تو وسیع تر یکجہتی کے تصور ہی سے وابستہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مولانا آزاد کو اپنی کاوشوں میں مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہو۔ مختلف حلقوں سے آزادی کے بعد بھی ان کی مخالفت ہوتی رہی ان کو غلط سمجھا گیا، کسی نے ان کو اکثریتی فرقے کا ڈھنڈورچی کہا، کسی نے ان کو اقلیتی فرقے کا تنگ نظر حامی بتایا۔ اس کے ثبوت آزادی کے بعد کے دور میں علی گڑھ مسلم یونین کے جلسے میں ان کے خلاف تقریر سے اور ان کی عمر کے آخری زمانے میں پارلیامنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کی الزامی تقریر اور مولانا آزاد کی جوابی تقریر سے فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ وہ قیمت ہے جو ہر اس شخص کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اپنے دور کی دھند سے آگے بڑھ کر مستقبل پر نظر جمانے کی جرأت اور جسارت کرتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے اس تنقید کو کس رنگ میں برداشت کیا۔ غصے اور جھنجھلاہٹ کو راستے کا پتھر نہ بننے دیا اور ملک کے تعلیمی نظام کی وہ ایسی بنیادیں استوار کر گئے جن پر چل کر آج ملک اس منزل تک پہنچا ہے۔

آزادی سے پہلے مولانا آزاد کے کارنامے زریں حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے ان کا نقش قدم آج بھی جگمگا رہا ہے۔ ادب اور انشاء میں ان کے نام سے جو اسلوب پہچانا گیا وہ آج بھی سدا بہار ہے۔ مذہبی ادب اور خاص طور پر تفسیر قرآن کے سلسلے میں ان کے کارنامے آج بھی نا قابل فراموش ہیں۔ آزادی کی لڑائی میں ان کی عظیم الشان جد و جہد آج بھی ملک اور قوم کو یاد ہے لیکن آزادی کے بعد کے دور میں ان کو ایک ہارا ہوا سپاہی یا ایک اداس دل گرفتہ المیے کا ہیرو جاننے والوں کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کے کارنامے یاد رکھنے چاہئیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی قائم کردہ بنیادوں پر چل کر آج ملک اس مقام تک پہنچا ہے جب ڈیڑھ سو سے زیادہ یونیورسٹیاں، متعدد آئی۔ ٹی۔ آئی، میڈیکل اور سائنسی ادارے اور تحقیقاتی مرکز، فنون لطیفہ کی اکادمیاں، تہذیبی عالمی روابط کے ادارے قائم ہیں اور اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمارے ملک کا شمار دنیا کے چند ایسے ممالک میں ہوتا ہے جو سائنسی آگہی، تکنکی مہارت و واقفیت اور علوم و فنون میں دسترس کے اعتبار سے ترقی پذیر ممالک میں ترقی یافتہ کہا جاسکتا ہے۔

بشیر النساء۔ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر یونی ورسٹی آف حیدرآباد،

قوت تعلیم اور نسوانی تعلیم کی اہمیت

تعلیم ہر انسان چاہے وہ امیر ہو یا غریب مرد ہو یا عورت سب کی بنیادی ضرورت میں سے ہے انسان اور حیوان میں امتیاز تعلیم ہی کی بدولت ہے یہ کسی بھی معاشرے یا قوم کے لیے ترقی کی ممانت ہے اور یہ ہر انسان کا اپنا حق جو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔قوموں کی تاریخ وزوال کی ذمہ دار تعلیم ہی ہے اسی لیے تعلیم کو دنیا میں اور دین اسلام میں خاص کر کے بہت اہمیت دی گئی ہیں۔قرآن کریم میں کئی آیتیں تعلیم کے سلسلے سے نازل ہوئی اور آپ حضورؐ پر پہلی وحی جب نازل ہوئی وہ بھی پڑھنے کے لیے ہی نازل ہوئی۔سورہ العلق آیتیں۔جس میں اللہ رب العزت نے جبریلؑ کے ذریعہ محمدؐ کو پڑھنے کی دعوت دی پڑھو آپ نے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔اور پھر قرآن میں علم کے لیے کئی آیتیں نازل ہوئیں۔اس کے علاوہ حدیث میں علم حاصل کرنے کے لیے کہا گیا حصورؐ کا ارشاد مبارک ہے:

”طلب العلم فریض نے علی کل مسلم“

علم حاسل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے

اس حدیث سے واضع ہو جاتا ہے کہ ہر مسلمان مرد عورت کا علم حاصل کرنا فرض ہے اک اور حدیث علم کے تعلق سے مروی ہے:

”ورن الملائک تنفع اجنھا رضاء لطالب العلم“

(ترمذی وابن صاحبہ)

بے شک فرشتے طالب علم کی رضا کے لیے اس کے پاؤں تلے اپنے پر بچھاتے ہیں امیرالمومنین حضرت امام علیؑ کا بھی قول بہت خوب ہیں علم کے متعلق ”علم تمہیں راہ دکھاتا ہے

اور عمل تمہیں مقصد تک پہنچا دیتا ہے''

دنیا کے تمام مذاہب میں تعلیم کو خاص اہمیت دی گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بھی اسی لیے بنائی تا کہ انسان تعلیم کے ذریعہ ایک پوشیدہ راز کو جان سکیں اور اس کی معرفت حاصل کر کے اپنے رب کو پہچان سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا کی تمام چیزوں پر فوقیت دی اور سب چیزوں کو اس کے ماتحت کیا کیونکہ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی وجہ سے وہ اعلیٰ ہے نبی کریمؐ تعلیم کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ

''تعلیم حاصل کرو بے شک اس کے لیے تمہیں چین میں جانا پڑے''

لہذا نبیؐ اپنے صحابہ اکرام کو ہمیشہ پڑھنے کی تلقین کرتے تھے کیونکہ اسلام میں تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا تا کہ انسان خود اپنی ذات کو پہچانے اور خدائے واحد کو بھی پہچان سکیں۔ اس لیے ہر مرد و زن کا علم کی دولت سے بہرہ مند رہنا بہت ضروری ہے علم کے بغیر دنیا اندھیر ہے وہی قوم ترقی کرتی ہے جس کے افراد زیور علم سے آراستہ ہوتے ہیں ترقی یافتہ مما لک کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

جس ملک میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق و ذوق زیادہ ہوتا ہے وہی ملک ترقی یافتہ بھی ہوتا ہے جو ملک پسماندہ ہیں ان میں علم کا فقدان ہوتا ہے اور دین کو جان سکتے ہیں علم کے ذریعہ اور زندگی کے ہر کام کو صحیح طور پر ڈھنگ سے پورا کر سکتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

علم وہ ہے جس سے چونک اٹھے احساس ضمیر
علم خوابوں میں خیالوں میں سرابوں میں نہیں
بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

(حالؔی)

مغرب کی ترقی کا راز بھی یہی ہے کہ ان لوگوں نے تعلیم کو اہمیت دی اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش بھی کرتے ہیں اور دنیا کو تعلیم کے بل پر فتح یاب کرن اچاہتے

ہہیں ۔مگرب کی کامیابی اورمشرق کے زوال کی اصل وجہہ تعلیم کی کمی ہی ہے جس کی کمی نے زوال کاشکار کیا۔

اسی لیے ہمارے شاعر علامہ اقبال نے کیا خوب نصیحت کی ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے عذر کر
فطرت کا تقاضہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(اقبال)

انسان چاہے کچھ بھی کرلے اس کی اپنی محنت ہی اسے کامیابی کی طرف گامزن کرتی ہے لہذا مشرق سے بیزاری یا مغرب سے عذر کی بات نہیں بلکہ رات بھر محنت کر کے اپنا لوہا منوانا ہے انسان کو۔ شعر ملاحظہ ہو

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

(اقبآل)

حکومت اور حکمرانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے لوگوں کے لیے ایسے مواقع میسر کرے جس سے غریب لوگوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا ایک سنہرا موقع مل سکیں کیونکہ جب تک ایک ملک میں تعلیم کا معیار اچھا نہ ہوگا تب تک معاشرہ ترقی کی منزل طے نہیں کرسکتا۔ لہذا دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا حاصل کرنا بھی نہایت ہی اہم ہے۔ کیونکہ دینی تعلیم کے ذریعہ ہی اللہ کی ذات کے عرفان کو حاصل کرسکتے ہیں لہذا تعلیم کی اہمیت نہایت ضروری ہے جس ملک میں تعلیم کی اہمیت نہیں وہ پستی کا شکار ہوگا۔اور جو انسان تعلیم کی اہمیت جانتا ہے لیکن حاصل نہیں کرتا اس پر ہمیشہ خدا کی لعنت ہوگی۔

خواتین کے لیے تعلیم نہایت ہی ضروری ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ایک عورت کی تعلیم کنبے کی تعلیم ہے اور
مرد کی تعلیم صر اس کی تعلیم ہے

ضیائے مدینہ:ص:23

تعلیم کسی بھی قوم کے ہر فرد کا بنیادی حق ہے پھر وہ چاہے مرد ہو یا عورت آج پوری دنیا میں عورتوں کے حقوق پر باتیں کی جارہی ہیں اوران کے حقوق کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش بھی جاری وساری ہیں۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادی نسواں کو زمرد کا گلو بند!

عورتوں کے تعلق سے ہمارے سماج میں کچھ غلط فہمیاں پنپ رہی ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ تو گھر ہی میں رہتی ہے ان کا کام باورچی خانے میں ہی ہوتا ہے لہذا باہر نہ نکالا جائے اور تعلیم نہ دی جائے یہ سب غلط سونچ ہیں کیونکہ لڑکیاں بھی انسان ہے ان کا بھی حق ہے کہ وہ علم کو حاصل کرے اور دوسروں تک اس کو پہچائے کیونکہ علم کی روشنی ہی اصل میں جینا سکھاتی ہے علم وہ سمندر ہے جس کا ساحل نظر نہیں آتا اور انسان کو اس کی ہر دم ہر لحظہ تلاش رہتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ مرد اور عورت دونوں ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں اگر ایک پہیہ تعلیم یافتہ ہوگا اور دوسرا نہیں تو گاڑی برابر کیسے چلے گی اس لیے عورت کو بھی تعلیم یافتہ بنانا نہایت ہی ضروری ہے۔

اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ عورت کی وجہ سے نسواں کا مقصد سنورتا ہے اور قوم کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کام کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے۔اسے اپنی اولاد کو بھی اپنی معلومات کی بناء پر تربیت کرنا چاہئے۔عورت کی فطرت مرد کی فطرت نے بلند ہوتی اگر ایک عورت جاہل ہوگی تو پوری ایک نسل غیر تعلیم یافتہ ہوگی اور معاشرے میں اس کی کوئی عزت نہ ہوگی لہذا اکبرالہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے کہ

تعلیم لڑکیوں کو تو دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہے وہ بے شعور ہے

عورتوں کی تعلیم میں منصوبہ بندی ہونا چاہئے جس کی وجہ جو سماج میں برائیاں پل

رہی ہے اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے عورتوں کی تعلیم میں مذہبی تعلیم کو اولیت دینی چاہئے تاکہ مذہبی اور اخلاقی اصولوں سے عورتیں واقف ہوں خود ان پر عمل کریں نیز اپنے شوہر کو رغبت دلائیں اور اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں۔ اور زبان کی تعلیم بھی دینی چاہئے۔ کیونکہ زبان سے گھر کا ماحول بدل جاتا ہے اور گھر جنت میں بدل جاتا ہے۔ میٹھی گفتگو ہو تو دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے میٹھی زبان سے دل خوش ہو جاتا ہے۔

عورتوں کو تعلیم دینا نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ عورت ایک بہترین سرمایہ ہے جس کی تعلیم خلوص، سچائی اور محبت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کو بہترین تربیت یافتہ صالح پاک دین دار انسان کا ایک قیمتی تحفہ دے سکتی ہے۔ ان ہی چیزوں کو خیال میں رکھ کر شاعر مشرق نے کہا ہے کہ۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

عورت کے وجود سے دنیا میں رنگینی برقرار رہتی ہیں۔

عورتوں کو علم زبان کے ساتھ علم الحساب کی تعلیم بھی دینا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ گھر کے اخراجات کے بارے میں جانکاری رکھتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے شوہر سے اس بارے میں بات کر کے صحیح طریقہ سے گھر چلاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ آمدنی میں بچت بھی ممکن ہے۔

طالب علم طب اور حفظان صحت کی تعلیم بھی عورتوں کو دینی چاہئے۔

''تمہاری اکثر برائیاں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں''

اسی لیے تعلیم حاصل کرنا چاہئے لہذا ایک عورت اگر تعلیم یافتہ ہو تو وہ اپنے پورے خاندان کی تعلیم کے بارے میں فکر مند ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بہترین اور تعلیم یافتہ ماں ہی ایک بہترین اور تعلیم یافتہ بچہ جنم دیتی ہے جو بعد میں ملک وملت کے لیے ایک طاقتور ہتھیار بنتی ہیں اور ایک عورت تعلیم یافتہ پیدا تو اپنے بچے کی تربیت میں خوب محنت کرتی

ہے کیونکہ ہر بچہ کا پہلا مکتب ماں کی گود ہی ہوتا ہے۔

''تمہاری اکثر برائیاں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں''

اسی لیے تعلیم حاصل کرنا چاہئے لہذا ایک عورت اگر تعلیم یافتہ ہوتو

وہ اپنے پورے خاندان کی تعلیم کے بارے میں فکر مند ہو جاتی ہے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بہترین اور تعلیم یافتہ ماں ہی ایک بہترین اور تعلیم یافتہ بچہ جنم دیتی ہے جو بعد میں ملک وملت کے لیے ایک طاقتور ہتھیار بنتی ہیں۔اور ایک عورت تعلیم یافتہ ہوتو اپنے بچے کی تربیت میں خوب محنت کرتی ہے کیونکہ ہر بچہ کا پہلا مکتب ماں کی گود ہی ہوتا ہے۔

اور ایک تعلیم یافتہ ماں کے بچے اعلیٰ دماغ اور سلیقہ مند ہوتے ہیں لیکن اس کے بر عکس جہاں ماں تعلیم یافتہ نہ ہو اس کے بچے زمانے میں پیچھے بھی ہوتے ہیں اور کند دماغ کیونکہ ان کو ماں سے جو شعور ہونا چاہئے گھر پر ملیقہ وہ نہیں مل پاتا۔اسی لیے جدید دور میں تعلیم نسواں کی اہمیت بے حد ضروری ہے۔تعلیم نسواں ہی زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہے علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے اس لیے علم کو اپنے گھروں میں بڑھائیں لہذا آپ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

علم کا حاصل کرنا اور عمل پیرا ہونا نہایت ہی اہم چیز ہے۔

اشفاق احمد عمل اور علم کے بارے میں فرماتے ہیں:

''عمل،علم کے لیے ایندھن کا کام دیتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ علم کا الاؤ روشن رہے تو اس میں عمل کا تیل ڈالتے رہیں۔ایسا نہ ہوا تو اس کی روشنی ماند پڑ جائے گی

اشعار احمد زاویہ''3روح کی سرگوشی صفحہ 308اس کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی ہوں کہ علم کو حاصل کر کے اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے یہ ہی مقصد زندگی ہونا چاہئے۔

پنکج کمار۔ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

دلتِ طبقات میں تعلیم کی صورتِ حال

جہاں تک بات دلت طبقات کی صورتِ حال کا کیا جائے تو ان کی صورتِ حال میں شروع سے لے کر آج تک کوئی خاص تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ چاہے وہ تعلیمی، معاشی، اقتصادی، اور سیاسی ہی کیوں نہ ہو۔ گہرائی سے اگر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر علاقے میں دلتوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ مثلاً چند فیصد دلت طبقات کے بچے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کوشش کر بھی رہے ہیں تو ان کے راستے مسدود کیے جا رہے ہیں۔ اور جو بچے داخلہ لے بھی لے رہے ہیں تو ان کے ساتھ زیبا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ان کو اعلیٰ تعلیم سے رسٹیکیٹ یا پھر ان کا انسٹیٹوشنل مرڈر کیا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال ہے ۲۱ رویں صدی میں برہمنی ذہنیت کے لوگوں کی۔ وہ خوف زدہ ہیں دلتوں کے اعلیٰ تعلیم سے ان کو اس بات کا ڈر ہے کی یہ کہیں ہم سے آگے نہ نکل جائیں۔

جب جب دلت و پسماندہ طبقے کے لوگ تعلیم یا دیگر میدان میں بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تب تب برہمنی ذہنیت کے لوگوں نے ان کی نبض دبانے کی کوشش کی ہے۔ یا پھر ان کا قتل ہی کر دیا گیا ہے۔ میں زیادہ تو نہیں دلتوں پر ہوئے ظلم وستم کے حوالے سے تھوڑے تاریخی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالنے کی کوشیش کروں گا کہ کس طرح سے برہمنی نظام نے اپنی مقدش کتابوں میں دلت و پسماندہ طبقے کے تعلیمی، اقتصادی، معاشی، اور سیاسی چیزوں کے حوالے سے لکھا ہے۔ منسمرت کے شلوک کوڈ:

دھرمو پدیسم، درپین، وپر مانامسہ، کُروتہ۔
تپتماسیچ یتّیلم، وقتے، شروتے، چہ، پارتھوا۔

(منُسمرِت، باب، ۸۔ شلوک ۲۷۲)

مطلب:۔اگر شُودر فخر سے کہے 'تم کو یہ دھرم کرنا چاہئے' ایسی دھرم کی نصیحت اگر برہمن کو کرے تو راجہ اس شُودر کے منہ اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈلوادے۔

انہیں کالے قوانین کے ذریعے ہندوستان کا ۵۸ ٪فیصد معاشرہ پنگو بنا رہ گیا۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تھوڑے سے انگریزوں کے ذریعے کئے گئے ظلم وستم کو تو ہندو قلم کار بڑھا چڑھا کر لکھتے ہیں۔اور انگریزوں کو تو ظالم واتیاچاری لکھتے ہیں۔لیکن اپنے بزرگوں کے ذریعے کئے گئے ظلموں کی طرف کبھی توجہ نہیں دیتے۔میرے خیال میں کسی انگریز نے کسی بھی ہندوستانی کے کان میں کھولتا تیل نہیں ڈالا ہوگا۔اگر انگریز ظالم تھے تو انھیں ایسے ظلم وستم کرنے کے خیالات کہاں سے آئے۔؟ یقینی طور سے یہ خیالات انھیں انہیں گھٹیا گرنتھوں سے ملے ہوں گے۔یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر نے اس مُنسمرت ۱۹۷۲ء میں ہی جلا ڈالا تھا۔مُنسمرت سے ایک دوسرا اشلوک؛

اُچھِسٹ منّم داتبیم جرنانِ وسنانِ چہ۔

پّلکا سچیو دھانیا نام جیرڑا سچیو پرِ چھدہ۔

(مُنسمرت، باب ۱۰۔شلوک ۱۲۵)

اُس دور میں تعلیم کے حوالے سے ہورہے ظلم و بربریت تو دور کی بات تھی شودر اچھے کھانے، کپڑے، اور مکان کے لئے ترستا تھا۔وہی سب چیزیں بالا شلوک کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں۔

مطلب:۔'شودر کو کھانے کے لئے جھوٹا کھانا' اور پہننے کے لئے پُرانے کپڑے بچھانے کے لئے دھان کا پوآل اور پُرانے توشک وغیرہ دینا چاہئے۔'

یہ صورتِ حال تھی اس دور میں دلت اور پسماندہ طبقے کے لوگوں کی اور تعلیم حاصل کرنا تو بہت دور کی بات تھی اور آج بھی نچلے پائدان کے کچھ شُودر مُنسمرت کا پالن کررہے ہیں۔یہ ذاتی اپنے سر پر میلہ ڈھوکر اور اپنے بڑوں کی جوٹھن کھا کر اپنی اولاد کو جہنم کی طرف ڈھکیل رہی

ہے۔جبکہ ان کو چاہئے کہ یہ سب کام چھوڑ کر اپنے بچے کو تعلیم کے سپرد کرے بقول نیلشن منڈیلا؛

"Education is the most powerfull weapons which you can use to change the world" (Nelson Mandela)

"تعلیم سب سے طاقتور ہتھیار ہے۔جسے آپ دنیا کو بدلنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔"

بقول جوسف اِسٹالن (Joseph Stalin)

"تعلیم تیز دھار والے ہتھیار' کے مانند ہے۔اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔یہ اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ کس نے اسے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہے۔اور نشانہ کس پر ہے۔"

خاص طور سے دلتوں کو تعلیم کی بہت سخت ضرورت ہے۔جس کے ذریعے وہ اپنی لڑائی خود لڑ سکتے ہیں۔آج کے دور میں ہم کو جزباتی نہیں پریکٹکل ہونے کی ضرورت ہے۔جبکہ جزباتی ہونے کی وجہ سے ہمارے رشی مُنو ؤں کو اس برہمنی ذہنیت کے لوگوں نے اپنا شکار بنا چکے ہیں۔جن میں سے بہت مشہور معروف نام ہے۔مہاراج سمبھوک رشی اور ایکلبہ کا۔جبکہ آج ہمیں ایکلبہ بننے کی ضرورت نہیں کی ہمیں جزبات میں دھورت برہمن کو اپنا انگوٹھا دینے کی ضرورت نہیں۔اور ان سب چیزوں سے نجات پانے کے لئے ہمیں تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔اور تعلیم نسواں تو بہت ضروری ہے۔

بقول ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر

"Educate,Agitate,Organige."(Dr.B.R.Ambedker)

"تعلیم یافتہ بنو' جد جہد کرو' ایکجاں رہو۔" (ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر)

بقول کارل ماکس؛

"Anyone who knows anything of history knows that great social

changes are impossible without feminine upheaval.Social progress can be measured exactly by the social position of the fair sex,the ugly ones included."(Karl Marx)

مطلب:۔ 'کوئی بھی شخص جو تاریخ کی کچھ جانکاری رکھتا ہے۔وہ یہ جانتا ہے کہ معاشرتی تبدیلی بغیر عورتوں کے سماجی صورتِ حال' جس میں بری دِکھنے والی عورتیں بھی شامل ہیں۔دیکھ کرناپی جاسکتی ہے۔'

جہاں ماہرین ومبصرین اور تعلیم یافتہ لوگ دلِت طبقات اور تعلیم نسواں کے حوالے سے اتنی عمدہ باتیں کہتے نظر آتے ہیں۔وہی کچھ پاکھنڈی برہمنی خیالات کے لوگ اپنی مقدس کتابوں میں کیا لکھتے ہیں۔درج ذیل ہے۔بقول تلسیداس؛

'ڈھول گوار'شُو در'پشُو' ناری
یہ سب تاڑن کے ادھکاری'

اور منومہاراج لکھتے ہیں کہ شُودر اپنا سب
کچھ برہمن کو دے دے۔اور ایک جگہ انھوں
نے فرمایا ہے کہ۔

'پرانا نرتھا ستتھا' داراڑ' برہماڑ ارتھے'نو یدیت۔
س شودر' جاتر بھوجیہ' سواد بھوجیہ' شیش' اُچیت۔

(وشنو' باب'۵شلوک ۱۱)

مطلب:۔ جو شودر اپنی جان و دولت اور عورت کو برہمن کی خدمت میں پیش کر دے' اس شودر کا کھانا' کھانے کے لائق ہے۔اور جو شودر یہ سب کام نہیں کرتا اس کا کھانا کھا نے کے لائق نہیں ہے۔

اس شلوک میں کتنی بہترین تعلیم ہے کہ شودر اگر اپنی بیوی کو برہمن جیسے بھولے بھنڈاری کے حوالے کردے تو اس کا کھانا کھانے کے لائق ہے۔ یہ دیکھئے گھٹیا پن اور ظلم وستم کی انتہا، شودر کے بیوی پر ہاتھ صاف کرنے کا اچھا نسخہ ہاریت جی لکھتے ہیں۔

دھارنم، جیرنوستر سیۂ وِپر سیو چھِسٹ بھوجنم۔
سوادار یشو' رتش چیو' پردار' وِورجنم۔
(وِشنو، باب، ۲ شلوک ۳۱)
یتھم 'کریا تسدا' شودرہ' منوواکّیائے' کرمبھیہ۔
ستھانمیندر' بھواپنوتِ' نشٹ ' پاپم' سُپُنّیکرت۔
(وِشنو، باب، ۲ شلوک ۴۱)

مطلب:۔ ہاریت کہتے ہیں کہ شودر پُرانے کپڑے پہنے اور برہمن کا جوٹھن کھائے؛ اپنی بیوی سے محبت کرے، اور پرائی عورت سے پرہیز کرے شودر ہمیشہ دل۔ زبان۔ اور کرم سے اس طرح کرے تو اس کے سبھی پاپ نشٹ ہوجاتے ہیں۔ اور جبکہ وہ ثواب کے اثر سے اِندر کے تخت کو حاصل کرتا ہے۔

ہاریت کے اس غور وفکر پر تبصر کرتے ہوئے' آچاریہ رجنی کانت شاستری، اپنی مشہور ومعروف کتاب 'ہندو ذاتی کا اُتھان اور پتن' کے صفحہ نمبر ۹۰۳ سے ۱۱۳ تک کہتے ہیں۔

'شاباش! بھیا شاباش! اس کو کہتے ہیں۔ مُرکھوں کو سبز باغ دکھا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا۔ جس اِندر تخت کو چکرورتی کشتریہ نریشگڑ بغیر ایک سو، اشومیدھ یگیہ پورا کر کے نہیں پا سکتے تھے۔ اور جس تخت کو محفوظ رکھنے کے لئے بچارہ اندر بار بار آشومیدھ گھوڑوں کو چُرایا کرتا تھا۔ اس تخت کو تم نے شودروں کو یوں ہی حاصل کر لینے کا اچھا طریقہ بتادیا۔ بھلا کون ایسا مُرکھ شودر ہوگا جو ایسے تخت کو پانے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ قاری طبقہ! شودر کی مُرکھتا اور ہندو مذہبی تخلیق کاروں کی دھورتتا پر خاموش ہوس کر خیال کیجئے۔ شودروں کو کھانے کے لئے صرف جوٹھا کھانا اور پہننے کے لئے صرف پھٹے پرانے کپڑے دیکر یعنی بِنا کسی خاص خرچ کے، ان سے زندگی بھر غلامی، یہ بے کار

کے لالچ دیکر کراتے رہئے' کیونکہ ایسا کرنے سے تمھیں اِندر تخت ملے گا۔ بھلا اس سے بڑھ کر چالاکی اور کیا ہوگی۔؟ اس طرح کی ٹھگی تعلیم دنیا کے کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پراچین روم' گریس' کارتھیج' مصر' اسیریا' بیبلون' عرب' فارس وغیرہ سبھی دیشوں میں غلامی کی روایت تھی؛ پر وہاں داس اور داسیوں سے انھیں یہ بھُلا وا دیکر کبھی بھی غلامی نہیں کرائی جاتی تھی کہ اپنے مالکوں کی دل۔ زبان اور کرم سے خدمت کرنے پر انھیں جنّت فراہم ہوگی۔ یا وہ وہاں کا کوئی بھاری فرشتہ یا فرشتوں کا سردار ہوگا۔'

رگوید سے لے کر جدید سبھی ویدک ادب اس ذاتی نظام کے کچرے سے بھرا پڑا ہے۔ اگر یہ برہمن لکھنے والے شاعر حبِ الوطنی ہوتے تو یقیناً ان میں جزبۂ وطن ضرور موجود ہوتا۔ اور ملک کے تئیں واضح محبت ہوتی۔ اور ان کے اندر شہید ہونے کی خواہش ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مُکمل سنسکرت ادب میں 'شہید' الفاظ کے برابر کوئی محاورہ کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اس ذاتی نظام روپی سڑاند کو پھیلانے میں ہندوؤں کی مُقدس کتاب 'گیتا' کی بھومِکا بھی کم نہیں ہے۔ درمیانی دور (پانچویں صدی) میں لکھی یہ کتاب ذاتی نظام کے کچرے میں زیادہ تر سڑاند پیدا کرنے میں بازی مار گئی ہے۔ اور آج جو ذاتی نظام خاص ہے۔ وہ صرف بھگوتی گیتا کی وجہ سے ہے۔

۱۲ صدی میں کچھ پڑھے لکھے دلِت بھی کوئی ملازمت حاصل کر لینے کے بعد مندروں میں متھّا ضرور ٹیکتے ہیں۔ انھیں یہ لگتا ہے کہ ان کو یہ ملازمت اس مندر کی وجہ سے ملی ہے۔ اور انھیں پھر بھی اپنے میہنت پر بھروسہ نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ ان سب چیزوں کو ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر بہت پہلے ترک کرنے کی بات کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ دلِتوں کو صرف اور صرف تعلیم کی ضرورت ہے نہ کہ کسی مندر مسجد یا پھر گرودواروں میں جانے کی وہ جس دن یہ باتیں سمجھ جائیں گے تو اس دن وہ کچھ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بقول اوشو:۔

'ایک شودر کو کسی مندر میں نہیں جانا چاہئے' اگر سارے برہمن پیر پڑے تو بھی نہیں جانا چاہئے۔ کیونکہ اس مندر میں کیوں جانا جس مندر نے تمہارا استحصال کیا۔ اور ہندوستان میں

ایک بغاوت کی ضرورت ہے۔شودر کہہ دے کہ ہم ہندو نہیں ہیں۔'

آغاز میں میں نے ایک بات کہا تھا کہ برہمنی ذہنیت کے لوگوں کا ظلم وستم دلتوں کے اوپر کم نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ان کے ظلم کرنے کا طریقہ تبدیل ہو گیا ہے۔اب دلت طبقات کے کچھ طلبہ و طالبات اعلیٰ تعلیم میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔تو ان کے پاؤں تلے زمین کھسک جا رہی ہے کہ یہ کارنامہ تو صرف ہم کر رہے تھے۔ یہ دلت شودر کہاں سے ہماری برابری کرنے لگے۔ کچھ دنوں پہلے UPSC ٹاپر ٹینا ڈابی کے دلت ہونے کی وجہ سے شوسل میڈیا خوب ایکٹو تھا۔انھیں خوشی اس بات کی نہیں تھی کہ ایک دلت لڑکی UPSC ٹاپ کی ہے۔ بلکہ غم اس بات کا تھا کہ دلت وہ بھی لڑکی UPSC کیسے ٹاپ کر سکتی ہے۔اتنی گھٹیا ذہنیت ہے' ان لوگوں کی۔دلت IIT ٹاپر کلپت وِروال یہ سب دیکھ ان لوگوں کو گھبراہٹ ہو رہی ہے۔اب وہ اپنی نپنسکتا کو چھُپانے کے لئے یہ بولتے پھر رہے ہیں' کہ یہ سب آرکشن کی وجہ سے ممکن ہے۔ ورنہ ان کی کیا اوقات کہ وہ یہ سب کر سکے۔آخر میں میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ میری دلت طبقات کے نوجوانوں سے بس یہی التجا ہے کہ وہ تعلیم ضرور حاصل کریں۔اور خاص طور سے ان کے والدین سے یہ گذارش ہے کہ آپ ایک وقت کا کھانا نہ کھائیں مگر اپنے بچے کو ضرور پڑھائیں۔ دلت طبقات کے لوگوں کے لئے تعلیم ہی ایک ایسا ہتھیار ہے۔جو زندگی کے ہر جنگ کو فتح کر سکتی ہے۔میں آخر میں ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر کے قول کو دوبارہ دوہرانا چاہوں گا۔

"Educate,Agitate,Organige"

'تعلیم یافتہ بنو' جدوجہد کرو' ایکجاں رہو' (ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر)

ترنم شاہی۔ ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد

تعلیم نسواں

یوں تو تعلیم وتربیت کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ دورِ جدید کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی ضرورت واہمیت اور افادیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ آج دنیا جس برق رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کررہی ہے، اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ نئے نئے علوم کے ساتھ ہی ساتھ تحقیق وتدوین کا کام بھی اس قدر تیز رفتاری سے جاری ہے کہ دنیا انگشت بدنداں ہے۔

مفہوم واہمیت:

تعلیم نسواں کے معنی ہیں عورتوں کی تعلیم۔ جس طرح مرد کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی اس کا حصول لازمی اور ضروری ہے۔ مرد اور عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ظاہر ہے جب تک گاڑی کے دونوں پہیے صحیح طور پر کام نہیں کریں گے گاڑی کبھی بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ کوئی معاشرہ اور قوم اس وقت ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتی جب تک مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ کیا جائے۔

مسلمانوں کو علم حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام کے بعد مسلمانوں نے مختلف میدانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ تاریخ کے صفحات پر رقم ہیں۔ اسلام نے دیگر شعبوں کی طرح علم کے معاملے میں مردوزن کے مابین کوئی تفریق نہیں کی۔ نبی کریم حضرت ﷺ کا ارشادگرامی ہے:

طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

رسول اکرمؐ جہاں مردوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا کرتے تھے وہیں ایک دن عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی مخصوص فرما رکھا ہے۔

اس معاملے میں دینی و دنیاوی علوم کی تحقیق رکھی گئی۔ مسلمان برائیوں سے محفوظ رہیں اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ برائیوں سے بھی آگاہ رہیں۔

ماں کی گود پہلی درسگاہ:

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں وارد ہوتے ہی اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ ماں کی آغوش سے شروع ہو جاتا ہے اور تادم آخر جاری رہتا ہے۔ بچے کی صحیح تعلیم و تربیت کا فریضہ ماں ہی بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ یہاں ہمیں ایک نقطہ یہ بھی ملتا ہے کہ استاد کے اندر بھی اگر ماں کی سی شفقت، محبت اور طالب علم کی خیر خواہی کا جذبہ موجود ہو تو تعلیم کے تمام مراحل آسان اور پر اثر ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

''ہر کامیاب شخص کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے''

اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ کس وجہ سے نسلوں کا مقدر سنورتا ہے اور قوم کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ عورت کی فطرت مرد سے بلند ہوتی ہے۔ اگر ایک عورت جاہل ہوگی تو پوری نسل غیر تعلیم یافتہ ہوگی اور معاشرے میں بھی اس کی کوئی عزت نہ ہوگی جس کے مدمقابل یعنی مدنظر اکبر الہ آبادی نے کہا ہے کہ:

تعلیم لڑکیوں کو تو دینی ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہے وہ بے شعور ہے

تعلیم بے حد ضروری ہے کیونکہ عورت ایک بہترین سرمایا ہے۔ جس کی تعلیم، خلوص، سچائی اور محبت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے وہ معاشرے کو بہترین تربیت یافتہ، صالح

، پاک باز، بہادر اور دین دار انسان کا تحفہ دے سکتی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے سوزِ زندگی کا سوزِ دروں

عورت کے لیے مذہبی تعلیم اور زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم الحساب کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس سے ان کے اندر کفایت شعاری پیدا ہوگی۔ امورِ خانہ داری کی تعلیم بھی دی جائے جس سے سلائی، کڑھائی، کشیدہ کاری، پکوان اور بچوں کی نگہداشت کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اس سے بہت سارے وہ کام جو آپ کو باہر کرانے پڑتے ہیں وہ گھر ہی پر انجام دیئے جاسکیں گے۔ اس طرح آمدنی میں بجٹ بھی ممکن ہے۔

علم طب اور حفظانِ صحت کی تعلیم بھی لڑکیوں کو دینا ضروری ہے۔ تاکہ اس سے اپنی صحت کو برقرار رکھنے، بیماریوں سے بچنے اور تیمارداری کا سلیقہ پیدا ہو۔ لڑکیوں کے لیے لیڈی ڈاکٹر یا معلّمہ کا پیشہ بھی مناسب ہوگا۔ مگر تمام لڑکیوں کو اس میدان میں کامیابی نہیں حاصل ہو پاتی ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر مذکورہ تعلیمات سے فائدہ اٹھائیں اور سماج و معاشرے کا وقار بحال کرنے میں اہم رول ادا کریں۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ:

''تمہاری اکثر برائیاں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے''

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

اگر مرد تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ تنہا تعلیم یافتہ کہلاتا ہے جب کہ عورت اگر تعلیم حاصل کرتی ہے تو وہ پورے خاندان کی تعلیم کے بارے میں فکرمند ہو جاتی ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ تعلیم یافتہ مائیں ہی بچے کو بہترین پرورش اور تعلیم یافتہ بناتی ہیں۔ جو بعد میں ملک و ملت کے لیے مایہ ناز ہستیاں بنتی ہیں۔ ایک عورت تعلیم یافتہ ہوتی ہے تو اپنے بچوں کی تربیت کی خوب محنت کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی سیرت ماں کی

آغوش ہی میں بنتی سنورتی اور نکھرتی ہے۔

نسوانی تعلیم کے لیے مثال کے طور پر ہم نذیر احمد کے ناولوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ان کے اصلاحی ناول خاص طور سے ''مرۃ العروس'' میں انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم پر خاصی توجہ مرکوز کی ہے کہ تعلیم انسان کے اخلاق وعادات کو بلند وبالا بناتی ہے اور زندگی کے نشیب وفراز اور درپیش مراحل سے بخوبی گزرنے کے سلیقے بھی سکھاتی ہے۔

''مرۃ العروس'' میں دو لڑکیوں کا ذکر ہے۔ اکبری اور اصغری۔ جن میں اکبری بڑی ہے اور اصغری چھوٹی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ ہے تو دوسری انپڑھ اور جاہل۔ اصغری پڑھی لکھی لڑکی ہے جو امور خانہ داری اور ہر کام میں اول نظر آتی ہے۔ وہیں اکبری انپڑھ ہونے کی وجہ سے گھر کے کام کاج اخلاق وعادات کے طور طریقوں سے بھی واقف نہیں اور نہ ہی دوسرے کام کو صحیح ڈھنگ سے کر پاتی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسوانی تعلیم بے حد ضروری ہے اور آج تعلیم نسواں کی اہمیت اس لیے بڑھی ہے کہ تعلیم یافتہ ماؤں کے بچے اعلیٰ دماغ اور سلیقہ مند ہوتے ہیں لیکن ان کے برخلاف جاہل ماؤں کے بچے کند ذہن اور الہڑ ہوتے ہیں۔ اس لیے دورِ حاضر میں نسوانی تعلیم بہت ضروری ہے۔ علم ہی انسانی زندگی کو کامیاب بناتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رہے کہ اب تک کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کی ترقی خاص طور سے لڑکیاں بغیر تعلیم کے ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتیں اور نہ ہی بغیر علم کے وہ زندگی میں رونما ہونے والی مشکلات اور دشوار گزار مرحلوں کو طے کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ اگرچہ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس پر انسانی ترقی منحصر ہے اور اس کی ذہنی نشوونما کا دارومدار بھی ہے۔

جاوید اختر عمری۔ ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

تعلیم و تعلم کے رہنما اصول سفرنامہ موسیٰ علیہ السلام کے تناظر میں

The Basic Principles of Education in Contaxt of MUSA*sTravelogus

زمین پر انسانی زندگی کا آغاز جہالت اور تاریکی میں نہیں بلکہ علم کی روشنی میں ہوا تھا علم آدم الاسما کلھا ربانی ہدایات کی روشنی میں انسانی زندگی کا یہ سفر جاری رہا سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم 'اقرأ باسم ربک' کا پیغام لاے آپ کی لائی ہوئی کتاب قرآن جملہ علوم وفنون کے لئے ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب میں علم اور اس سے مشتق سیکڑوں الفاظ تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں۔

اس کتاب میں اللہ تعالی نے بیت سے بری اور بحری سفرناموں کا تذکرہ کیا ہے جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لۓ عبرت وموعظت کا سامان ہے۔ ان میں بہت سے ایسے سفرنامےبھی ہیں جو خصوصی طور پر تعلیم و تعلم اور اس کے اصول ومبادی پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں،

تعلیم قوم وملت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے کسی بھی ملک یا قوم کی ترقی کے لئے یہ ایک ایسی شاہ کلید ہے جس پر سرخ روئی اور سربلندی کے سارے ہی راستوں کا دار ومدار وانحصار ہے لہذا اس ناحیے سے قرآن کے سفرناموں کا مطالعہ بہت ہی اہمیت رکھتا ہے، قرآن کے پندرہویں پارے سورہ کہف کے وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے

خلیفہ یوشع بن نونؑ کے ایک تعلیمی سفر نامے کا تفصیلی ذکر ہے جس میں تعلیم و تعلم سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لئے بڑی رہنمائیاں پوشیدہ ہیں۔ان آیات سے تعلیم و تعلم کے بہت سے آداب پر روشنی پڑتی ہے۔جن میں سے چند رہنما اصولوں کا اجمالی ذکر درج ذیل ہے.

(1)علم لامتناہی ہے: سب سے اہم بات یہ ہے کہ علم لامتناہی In finite ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں ہے۔کوئی کتنا ہی جانکار ہو، پھر بھی علم کا اتھاہ سمندر غواصی کے لئے باقی رہتا ہے جس سے طالب علم علم کے موتی چن چن کر اکٹھا کر سکتا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علم نبوت حاصل تھا جس سے اعلیٰ وارفع کوئی علم نہیں لیکن پھر بھی وہ ضرورت محسوس کرتے تھے کہ مزید علم حاصل کریں چنانچہ تفسیر ابن جریر میں عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جو اب ملا وہ جو عالم ہونے کے باوجود علم کی جستجو میں رہے، ہر ایک سے سیکھتا رہے کہ ممکن ہے کوئی ہدایت کا کلمہ مل جائے یا کوئی بات گمراہی سے نکلنے کی ہاتھ لگ جائے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر دریافت کیا زمین پر تیرا کوئی بندہ مجھ سے بھی زیادہ علم رکھتا ہے۔جواب ملا: ہاں! پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت فرمایا وہ کون ہے؟ جواب ملا، خضر، پھر دریافت فرمایا: میں انہیں کہاں تلاش کروں؟ جواب ملا: دریا کے کنارے پتھر کے پاس جہاں سے مچھلی بھاگ کھڑی ہو پس حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی جستجو میں چل دیئے۔(1)

(2)حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس طرز عمل سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ تحصیل علم کے لئے کوئی عمر مخصوص نہیں ہے بلکہ ہمیشہ علم کی تڑپ رہنی چاہئے صرف بچپن میں علم حاصل کرنا اور بقیہ عمر میں تحصیل علم سے غافل رہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ پوری زندگی تحصیل علم کیلئے کوشاں رہنا چاہئے۔ پیارے نبیؐ نے اسی چیز کی طرف نشاندھی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔"اُطْلُبِ الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ" گود سے گور تک علم حاصل کرو۔(2)

(3) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طرز عمل سے یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ علم جس سے بھی ملے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔اللہ تعالیٰ نے جس کی طرف رہنمائی کی تھی

اس کے لئے ''عَبۡدًا'' (بندہ) کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مراد خضر علیہ السلام ہیں جیسا کہ بخاری کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ غور طلب پہلو یہ ہے کہ اگر وہ نبی تھے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے تو گویا وہ ہم رتبہ تھے اور انہوں نے ان سے علم حاصل کرنے کی کوشش کی حالانکہ ہمارے یہاں عام طور سے ہم رتبہ سے علم حاصل کرنے کو کسر شان سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ مان لیں کہ وہ ولی تھے جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے تب تو وہ نبی سے کم تر تھے پھر بھی انہوں نے ان سے علم حاصل کرنے کیلئے سفر کیا تو گویا کم تر کے پاس بھی اگر کوئی خاص علم ہے تو اس سے استفادہ کرنیمیں کوئی حرج نہیں حالانکہ فی زمانہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ذھناً و عملاً اس بات کیلئے تیار نظر نہیں آتے۔ بہت سا نقصان اٹھانا گوارا کر لیتے ہیں لیکن کم تر سے رجوع نہیں کرتے۔ اس طرز عمل پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ احادیث میں تو ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے:

"الحِكمَةُ ضالةُ المؤمنِ فحيثُ وجدها فهو أَحَقُّ بها"

''حکمت گمشدہ پونجی ہے جہاں ملے وہاں سے لے لو کیونکہ تم اس کے زیادہ حق دار ہو'' (3)

(4) تحصیل علم کیلئے سفر قدیم روایت ہے۔ جس نے سفر کیا اس نے زیادہ فیض اٹھایا اور زیادہ اونچا مقام حاصل کیا۔ تاریخ میں سیکڑوں مثالیں بھری پڑی ہیں بلکہ بہتوں کا تعلیمی سفر نامہ تو کلاسیکی سمجھا جاتا ہے مثلاً امام شافعیؒ کا علمی سفر نامہ ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی وہ طلبہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو کسب فیض کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور شہد کی مکھی کی طرح ہر صاحب علم سے رس چوس چوس کر اپنے آپ کو سیراب کرتے ہیں۔

(5) طلب علم کیلئے عجز و فروتنی اور انکساری و خاکساری زیادہ موزوں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تو ان سے علم سکھانے کے لئے بالکل طالب علمانہ انداز میں درخواست کی۔ نہ کوئی مطالبہ رکھا اور نہ کوئی استحقاق جتایا۔

آج جو تعلیمی سسٹم ہے اس میں نام نہاد فیس کی بنیاد پر استحقاق کا رجحان اور ذہنیت پنپ رہی ہے۔ جو مخلصانہ تعلیم و تعلم کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ معلم اور استاد کا ذہن بھی ''فیس کے بقدر'' تعلیم کا بنتا جا رہا ہے جو معیار تعلیم کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے۔

(6) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کے الفاظ تھے ''هَلْ اَتَّبِعُکَ عَلٰیٓ اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْداً'' (4)

''کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، یا آپ کے پیچھے پیچھے چل سکتا ہوں تا کہ آپ مجھے اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے''۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ رہے تھے کہ علم کے حصول کے لئے صحبت اور تابعداری ضروری ہے چنانچہ انہوں نے صحبت اختیار کرنے کی اجازت چاہی۔ صرف سوال کرنے اور جواب حاصل کرنے سے پختہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ اگر پختہ علم مطلوب ہے تو اس کے لئے استاد کی صحبت اور تابعداری ضروری ہے چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جنہوں نے استاد کی صحبت اٹھائی ہے اور تابعداری کی ہے وہ زیادہ کامیاب اور سلامت رہے ہیں اور جنہوں نے صحبت سے اعراض کیا ہے وہ محروم رہے ہیں اور محرومی کا شکار ہوئے ہیں۔

(7) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست میں صرف تعلیم دینے کی درخواست نہیں ملتی بلکہ انہوں نے لفظ ''رُشدًا'' بھی استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب ہے ''راہ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی تعلیم'' گویا محض تعلیم درکار نہیں بلکہ تعلیم کا جو اصل مقصد ہے یعنی صحیح و غلط کی تمیز کا ملکہ پیدا ہونا اور راہ راست کی رہنمائی حاصل کرنا وہ مقصود ہے اور یہ مقصد پورا کرنے والی تعلیم کا میں طلب گار ہوں۔ کیا تحصیل علم کے وقت ہمارے اور آپ کے سامنے بھی یہ مقصد مستحضر رہتا ہے؟

(8) خضر علیہ السلام کا یہ قول ''اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْراً'' آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ علم کا حصول ایک مشکل کام ہے۔ اس

کے لئے طالب علم کے اندر صبر کی صفت پایا جانا ضروری ہے۔ وہ محنت کر سکتا ہو، مشکلات کے مقابلے میں جم سکتا ہو، فوری نتیجہ نہ چاہتا ہو تب تو وہ علمی معرکے سر کر سکتا ہے ورنہ پھر وہ اس محاذ پر زیادہ دیر تک نہیں سکتا۔ اس راہ کے ان تقاضوں سے طلبہ کو آگاہ کرتے رہنا چاہئے تاکہ وہ ذھنی طور پر تیار ہو کر اس میدان میں قدم رکھیں جب کہ خضر علیہا السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شروع ہی میں ذھناً وعملاً تیار کرنے کے لئے آگاہ کر دیا تھا۔

(9) ''وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا'' اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اس پر صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں؟ خضر علیہ السلام کا یہ بیان دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ ایک استاد کو یہ بات یقینی طور پر تسلیم کرنی چاہئے کہ طالب علم اپنی کم علمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے بے صبری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مظاہرے غیر فطری نہیں ہیں۔ اس لئے استاد کو ایسی صورت حال پر جز بز نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا خوبصورتی سے مداویٰ کرنا چاہئے۔ طلبہ کو اس راہ کے پیچ وخم سے آگاہ کرنا چاہئے، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا چاہئے اور عہد و معاہدہ کے ذریعہ انہیں پابند بنانا چاہئے جیسا کہ خضر علیہ السلام نے کیا تھا۔ طلبہ کو اس راہ میں ثابت قدم رکھنے کے لئے ناقابل فہم امور کو حسب ضرورت وضاحت کے ساتھ بیان بھی کرنا چاہئے البتہ موزوں وقت کا خیال رکھنا ضروری ہے جیسا کہ خضر علیہ السلام نے پہلے ہی مرحلے میں ساری حکمتیں کھول کر نہیں بتائیں لیکن جب موزوں وقت آ گیا تو سب کچھ وضاحت کے ساتھ بتا دیا تاکہ طالب علم کا اشکال دور ہو جائے اور اسے شرح صدر حاصل ہو جائے۔

(10) ''فَلَا تَسۡـَٔلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ حَتّٰۤی اُحۡدِثَ لَکَ مِنۡہُ ذِکۡرًا'' تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔

خضر علیہ السلام کے اس حکم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ استاد کیلئے طالب علم کے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ استاد کی صوابدید پر ہے کہ اگر مناسب سمجھتا ہے تو جواب دے اور اگر نامناسب سمجھتا ہے تو منع کر دے۔ طالب علم کی سطح اور حدود کے لحاظ سے یہ فیصلہ

استاد کو کرنا ہے۔استاد پر ہرگز لازم نہیں کہ وہ ہر سوال کا جواب دے یا اسے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند بنایا جائے۔''اَنْزِلِ النَّاسَ عَلٰی مَنَازِلِھِم''لوگوں کو ان کے مقام پر رکھو۔(نسائی، احمد) کی ہدایت اسی لئے ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق سلوک کیا جائے۔خود اللہ کے رسولؐ ہر سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ بلکہ بعض سوالات سے تو آپؐ نے منع کر دیا تھا۔مثلاً اللہ کی ذات کے بارے میں سوال،تقدیر کے بارے میں سوال۔ کیونکہ یہ عام انسانی سطح سے اوپر ہے۔اسی طرح طالب علم کی سطح سے اوپر جو بھی سوال ہو یا جو بھی بحث ہو اس سے روکا جاسکتا ہے۔اسے نہ معلم کی کم علمی کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تعلیم سے فرار قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ اپنی کم مایہ حیثیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا معاملہ ہے۔جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اور ہر سوال کا جواب ڈھونڈنے اور دینے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں وہ گمراہی سے کم ہی بچ پاتے ہیں۔

(11) حصول علم کے لیے سفر بہت ہی اہمیت کا حامل ہے . حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزید حصول معرفت کے لئے سفر پر آمادہ ہوئے اور اپنے ایک معاون کے ہمراہ سفر پر روانہ ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ حصول تعلیم کے لئے سفر کا اہتمام زمانہ قدیم سے ہی چلا آرہا ہے۔

1- بخاري:122،4449،مسلم:6315،ترمذي:3149

2-الفوائد العلمي من الدروس البازي-6/113

3-بروايت ابوهريره،ترمذي-حديث نمبر 2687

4 سورہ کہف

جرار احمد وافروز ظہیر۔ ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

مدارس کے اساتذہ کی تربیت میں ہی ہماری ترقی اور بقا کا راز پنہا

جب بھی ارباب حل وعقد اور علوم عصریہ کے ماہرین کے پیش نظر مدارس کے اساتذہ اوراس کے نصاب، تعلیمی نظام یا پھر کچھ دیگر امور کی بات زیر بحث آتی ہے تو ارباب حل وعقد اکثر پریشان ہوجاتے ہیں اور مدارس کے اساتذہ اور نظام سے عدم اطمینان ظاہر کرتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر دور میں یہ بات رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے بھی تقریبا سو سال پہلے اپنی بات کو شعری قالب میں ڈھال کر کہی تھی کہ۔۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک

نہ زندگی ،نہ محبت، نہ معرفت نگاہ

آج بھی تھوڑے سے تغیر وتبدل کے ساتھ مدارس کی وہی صورت حال ہے، اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ آج مدارس کو صرف اور صرف کھانے، پکانے اور کمائی کا ذریعہ بنالیا گیا ہے، گرچہ کچھ مدارس اس سے مستثنی ہیں، مگر پھر بھی مدارس کی اکثریت اس کے ذیل میں آتی ہے، ایسے مدارس کے اساتذہ کو اوران مدارس کے ارباب مجاز کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے کہ ان کے مدرسے میں کیا، کس طرح سے پڑھایا جارہا ہے اس سے طلبا کتنا اور کس حد تک استفادہ کررہے ہیں، وہ طلبا کے لیے کتنا سودمند ہے بلکہ ان کی نظر صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ اس سے مدرسہ اور والیٔ مدرسہ کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے اور اس طرح سے مدرسوں کو ایک کمرشیل ادارہ بلکہ ایک کارخانہ بنادیا گیا ہے، شاید اسی چیز کو راحت، اندوری نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

یہاں اک مدرسہ ہوتا تھا پہلے
مگر اب کارخانہ چل رہا ہے

مگراب تو کارخانوں سے بھی ابتر صورت حال مدارس کی ہے کیوں کہ کارخانوں میں تو کھپت کا خیال رکھا جاتا ہے اور پروڈکشن کی کوالیٹی کے ساتھ اسے لوگوں کے لیے اچھا بنایا جاتا ہے، پروڈکٹ جب تک اچھا نہیں ہوگا بے سود ہوگا اور مارکیٹ میں کھپے گا نہیں اور نتیجتاً پیداوار کو بند کرنا پڑے گا یا پھر اس کی کھپت کا کوئی دوسرا حربہ استعمال کرنا پڑے گا، مگر مدارس میں ان چیزوں کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا ہے کہ جن کو آج پڑھا رہے ہیں ان سے ملک وقوم اور دین کو مستقبل میں کچھ فائدہ پہنچے گا کہ نہیں شاید اس کا خیال اس لیے نہیں رکھا جا رہا ہے کہ مدرسوں کے منتظمین کو یہ پتہ ہے کہ ہم چاہے جو بھی کریں گارجین علوم دینیہ کے حصول کے لیے دین کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنے بچوں کو ضرور مدارس میں بھیجیں گے۔

مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی اگر بات کی جائے تو بہت دنوں سے یہ بات زیر بحث ہے مگر اس کی کوئی منظّم صورت نہیں بن پا رہی ہے لیکن آج کے دور میں بہت ہی ضروری ہو گیا ہے کہ مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی جائے کیوں کہ تربیت یافتہ معلم ہی ایک اچھے طلبا کی جماعت تیار کر سکتے ہیں، آج کے دور میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ سے علم حاصل کرنے کے بعد فارغین مدارس معاشرے کے لیے کما حقہ سودمند ثابت نہیں ہو سکتے ہیں، اس لیے اب ضروری ہو جاتا ہے کہ مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی جائے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ہے کہ ایک معلم کی سطح تک پہنچ جانے والے کسی شخص کو تربیت دے کر اس کی فکر کو درست کیا جائے، نفسیاتی طور پر یہ ایک نازک مسئلہ ہے مگر پھر بھی وقت کا تقاضا یہی ہے۔ اس ذیل میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) حیدر آباد کے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعۂ تعلیم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے ایک دس روزہ اورنٹیشن پروگرام برائے اساتذہ دینی مدارس (7 تا 16 فروری) کا انعقاد کیا جو کہ ایک بہت ہی لائق تحسین قدم ہے، اس پروگرام میں فن تدریس

کے اور اپنے مضامین میں مہارت تامہ رکھنے والے ماہر اساتذہ کی کہکشاں کو مدعو کیا گیا، جنہوں نے اپنے تبحر علمی اور تجربات کی روشنی میں مدارس کے اساتذہ کو جدید طریقہ تدریس سے واقفیت کرائی اور انہیں یہ بتایا کہ کس طرح سے نئے زمانے کی نئی تکنیک سے رشتہ استوار کر کے ہم اپنی تدریس کو بہتر اور دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ان باتوں کو بھی ان کے گوش گذار کیا کہ کیوں ہمیں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر تدریس کی ضرورت ہے۔

اساتذہ کی تربیت کے لیے سب سے پہلے ہمیں ان کو آمادہ کرنا ہوگا کیوں کہ مدارس کے اساتذہ کالج یا یونیورسٹیز میں جا کر یا پھر کسی سے کچھ سیکھنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پاتے ہیں، شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جتنا یا جو کچھ جانتے ہیں یا جس طرح سے پڑھاتے ہیں وہی سب سے اچھا اور بہتر طریقہ ہے، یہی وجہ ہے کہ، جب مانو میں یہ پروگرام منعقد کرنے کی تیاری چل رہی تھی تو بہت ہی محنت اور کاوشوں کے بعد مدارس کے اساتذہ کی ایک چھوٹی سی جماعت اس تربیتی پروگرام میں شریک ہونے کے لیے راضی ہوئی یا تو خود اساتذہ آنا نہیں چاہتے یا پھر ان کے منتظمین ان کو آنے کی اجازت نہیں دیتے، دونوں باتوں کا امکان ہے، مگر جس دن وہ پروگرام اختتام کو پہنچا تو تمام اساتذۂ مدارس نے اس پروگرام کی جم کر تعریف کی اور کہا کہ ایسے پروگرام تو ہمیشہ اور مسلسل ہونے چاہیے۔ خیر بات یہ چل رہی تھی کہ مدارس کے اساتذہ کو اور وہاں کے ارباب مجاز کو پہلے اس کے لیے راضی کرنا ہوگا اور یہ ضروری بھی ہے، اس سلسلے میں اس طرح کے پروگرام کے اغراض و مقاصد اور اس کی موجودہ وقت میں ضرورت کی ایک تفصیل ان کو دینی ہوگی، جس سے مدارس کے اساتذہ اس تربیتی پروگرم کے بارے میں پوری طرح سے واقفیت حاصل کر سکیں اور اس کی اہمیت سے واقف ہو جائیں، ورنہ کبھی بھی وہ آنے کے لیے راضی نہیں ہوں گے اور راحت اندوری کا یہ شعر ہمیشہ ان پر صادق آتا رہے گا۔

نئے کردار آتے جا رہے ہیں
مگر ناٹک پرانا چل رہا ہے

علوم کے انفجار کی وجہ سے آج دنیا بہت زیادہ ترقی پر ہے اور نتیجتاً مختلف شعبہ ہائے حیات میں تحقیق ہوئی اور نتائج سامنے آئے کہ کس طرح سے تدریس ہونی چاہیے اور اس اعتبار سے کالج اور یونیورسٹیز کے نصابوں اور طریقۂ تدریس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، مگر جب ہم مدارس کے نصاب اور طریقہ ہائے تدریس پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ ایک جمود اور تعطل کی سی کیفیت طاری ہے، اگر تبدیلیاں ہوئیں بھی ہیں تو اتنی نہیں جتنی کہ ضرورت تھی۔

آج بھی اکثر مدارس کے اساتذہ قدیم طریقۂ تدریس اختیار کیے ہوئے ہیں اور تمام طلبا کو ایک ہی طرح سے ایک ہی انداز سے پڑھاتے ہیں، جب کہ وہ خود اکثر دوران تدریس مثالوں میں یہ بات کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتی ہیں، تو جب ان کو پتہ ہے کہ یکساں نہیں ہوتیں تو کیوں ان انگلیوں کو مختلف طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، کیوں ان کو مختلف طریقے سے پڑھانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، آج کا تدریسی نظام طلبا مرکوز نظام ہے، مگر مدارس میں اب بھی اساتذہ مرکوز نظام جاری و ساری ہے، پروفیسر میاں انعام الرحمان مدارس اور کالج کے اساتذہ اور طلبا کے فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میں نہ مدارس میں پڑھا ہوں ، نہ مجھے زیادہ تجربہ ہے، لیکن میرا مشاہدہ اس کے بارے میں یہ ہے کہ کالج سائڈ میں جو ٹیچر ہے اور مدرسہ میں جو ٹیچر ہے، دونوں میں بنیادی فرق طالب علم کے ساتھ ڈیلنگ کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ جو مدرسے کا استاد ہے، وہ اپنے آپ کو زیادہ ترجیح دیتا ہے، زیادہ تقدس کا درجہ دیتا ہے جبکہ کالج سائیڈ میں یہ بات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب طالب علم کو ڈیل کیسے کرنا ہے، اس کی ٹریننگ وہاں بھی نہیں ہوتی اور یہاں بھی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ٹریننگ پہلے لے کر آئے ہیں، یہ اسی کا اثر ہے۔ تو مجھے بنیادی فرق نظر آتا ہے، وہ یہی ہے کہ دینی مدارس کے جو طلبہ ہیں، وہ استاد کی اتنی زیادہ تعظیم کرتے ہیں، اتنا زیادہ تقدس کا درجہ دیتے ہیں کہ شاید اس کے بعد اس کو وہ ٹوک نہیں

سکتے اور نہ اس کی ہمت کر سکتے ہیں کہ سوال کریں اور استاد سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ علم تو ہوتا ہی سوال و جواب ہے، تو جب آپ اس کو زیادہ تقدس کا درجہ دیتے ہیں تو پھر آپ اس سے سیکھ نہیں سکتے۔ پھر تو ہاں ناں ہوگا جیسے کنٹری میں ہوتا ہے۔"

("دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے" شرکا کے مابین مجلس مذاکرہ کی روداد صفحہ نمبر 2

muzakarah-madaris/ nov/ 2007/ mujalla/ www.alsharia.org//:http

سے حاصل شدہ)

درج بالا باتوں کے پیش نظر اگر مدارس کے اساتذہ کی تربیت نہیں کی گئی تو نتائج بہت ہی سنگین ہوں گے، اساتذہ کی تربیت کے پیش نظر ہمیں ان کی عمر کا خیال بھی رکھنا ہوگا، جیسا کہ یونیورسٹیز میں اسسٹینٹ پروفیسر کے لیے اورنٹیشن پروگرامس ہوتے ہیں، اسی طرح مدارس کے نئے اور نوجوان اساتذہ کے لیے پہلے پروگرام ہوں اور ان کو یہ بتایا جائے کہ کس طرح سے طلبا کی صلاحیت، لیاقت، نفسیات، پس منظر، خاندان وغیرہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس طرح سے تدریس کی جائے، جو تمام طلبا کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کے لیے بھی سودمند ہو۔

اساتذہ جب یہ تربیت حاصل کر کے واپس مدرسے جائیں گے اور طلبا کو منفرد انداز اور ان کی خواہش کے مطابق پڑھائیں گے تو طلبا خود ان کی تدریس میں دلچسپی لیں گے، جس سے اساتذہ کو بھی طلبہ و طالبات کے ساتھ تدریس میں لطف آئے گا اور طلبا ایسے معلمین و معلمات کی خود تعریف کریں گی اور اس کے نتیجے میں دوسرے اساتذہ کرام طلبا میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے خود بخود ایسے تربیتی پروگرام کی طرف راغب ہوں گے۔

مدارس میں آج کس طرح سے تدریس ہو رہی ہے اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں بس علامہ اقبالؔ اور راحت اندوریؔ کے وہ اشعار ہی اس کی ترجمانی کے لیے کافی ہیں۔ اس لحاظ سے اب یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مدارس کے اساتذہ کی تربیت جتنی

سرعت کے ساتھ ہو سکے کی جائے، جس دن مدارس کے اساتذہ کی تربیت ہو جائے گی اور وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور جدید ٹکنالوجی سے لیس ہو جائیں گے اس دن وہ خود بخود اس بات پر غور وخوض کرنے لگیں گے کہ مدارس کا نصاب کیسا ہو، اس کو روزگار سے کس طرح منسلک کریں اور سرکاری پالیسیوں کا نفاذ مدارس میں کس طرح ہو اور اس طرح سے ہماری بقا کا راستہ ہمارے مدارس کے ذریعہ ہونے لگے گا۔ پس اب یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے مدرسوں کے اساتذہ کی تربیت کی جائے، تاکہ ہماری بقا کا راستہ ہموار ہو سکے۔

کتابیات

ویبلیوگرافی

Webliography

1.
http//:magazine.mohaddis.com/shumara/97-feb2002/1516-pakistan-deeni- nazam-taleem-tajaweez
2.
http//:www.alsharia.org/maqalaat-mazameen/index.php?ar=%D8%AA%D8%B 9%D9%84%DB%8C%D9%85%20%D9%88%20%D8%AA%D8%B9%D9%84% D9%85%20/%20%D8%AF%DB%8C%D9%86%DB%8C%20%D9%85%D8%A F%D 8%A7%D8%B1%D8%B3
3. http//:www.alsharia.org/mujalla/2002/sep/kalmahaq
4.
http//:www.alsharia.org/mujalla/2003/nov/madaris-jadeed-taleem
5.
http//:www.alsharia.org/mujalla/2004/jan-feb/madaris-nizam-tarbiyat-dr-amin
6. http//:www.alsharia.org/mujalla/2005/oct/kalmahaq
7. http//:www.alsharia.org/mujalla/2006/apr/kalmahaq
8. http//:www.alsharia.org/mujalla/2006/dec/akhbar-asar

9. http//:www.alsharia.org/mujalla/2007/jan/madaris-jadeed-taleem-doctor-a min
10. http//:www.alsharia.org/mujalla/2007/nov/madaris-muzakarah
11. http//:www.alsharia.org/mujalla/2007/oct/deeni-madaris-mahmudulhasan-arif
12. http//:www.alsharia.org/mujalla/2008/mar/urdu-zuban-mufti-asghar
13. http//:www.alsharia.org/mujalla/2009/may-jun/talaba-sawalaat-qazi-ruwais
14. http//:www.alsharia.org/mujalla/2009/nov-dec/deeni-taleem-seminar
15. http//:www.alsharia.org/mujalla/2012/jul/kalmahaq#top
16. http//:www.alsharia.org/mujalla/2016/apr/taleemi-nizam-maulana-zahidur rashdi
17. http//:www.career.org.pk/%D9%85%D8%AA%D9%81%D8%B1%D9%82/teacher-in-clas.html
18. http//:www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine/new/tmp/06-Dini%20Madaris%20Me%20Talim%20o%20tarbiyat_MDU_02_February_12.htm
19. http//:www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=36169
20. http//:zahidrashdi.org/34

☆☆☆

رشدہ شاہین۔ ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

مسعود حسین خاں کی علمی خدمات

مسعود حسین خاں کی ذات گرامی ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہے۔ وہ ادیب، شاعر، نقاد، محقق، ماہر لسانیات، مفکر، لغت نویس، سوانح نگار، مرقع نگار بھی ہیں، اقبالیات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ دکنی ادب کی بازیافت میں مسعود حسین خاں کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے وقت کی دبیز پرت کے نیچے دبے ہوئے دکنی ادب پاروں کو منظرِ عام پر لا کر ماضی اور حال کے درمیانی خلیج پر آہنی پل تعمیر کرنے کا کام انجام دیا ہے جس کے ذریعہ ہم ماضی میں دور تک جھانک سکتے ہیں۔ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں ان کے کارنامے اہمیت کے حامل ہیں۔

علمی دنیا میں مسعود حسین خاں کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ ایک کامیاب معلم اور ایک آئیڈیل استاد تھے۔ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا سلسلہ دور دراز تک پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے جن اداروں میں علمی خدمات انجام دیں ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، جامعہ اردو علی گڑھ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ کے بھی اپنے فرائض انجام دیے ہیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد یہ نوکری چھوڑ کر علی گڑھ واپس آ گئے اور پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ اسی سال یعنی 1943 میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں جونیر لکچرر کے طور پر عارضی تقرری ہوئی اور ساتھ ہی رشید صاحب کی سفارش پر امین ہاسٹل کے ریزیڈنٹ وارڈن بنا دیے گئے۔ جہاں پر انہوں نے اپنا مقالہ مکمل کیا اور 1945 میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1950ء میں تحقیق کے سلسلے میں یورپ گئے اور ڈھائی سال لندن اور پیرس میں گزارنے کے بعد وہ فروری 1953ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر کے علی گڑھ آ گئے۔ 1954 میں شعبۂ اردو علی گڑھ میں ریڈر مقرر ہوئے۔ جہاں وہ جدید شاعری اور اقبال

کے ساتھ ساتھ تاریخ زبان اردو اور دکنی اردو پڑھاتے رہے۔ وہ شعبۂ اردو سے 1962 تک جڑے رہے۔ اس عرصے میں انہیں علمی کام کرنے کے بہترین مواقع ملے۔

1955 میں ہندوستان میں پہلی مرتبہ توضیحی لسانیات کو عام کرنے کے لیے دکن کالج پونا نے مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں کا منصوبہ بنایا۔ وہ ابتدا ہی سے اساتذہ کی فہرست میں رہے اور پانچ سال ہندوستان کے مختلف مقامات پر لسانیات کے یہ اسکول ہوتے رہے اور مسعود حسین خاں اس میں شریک ہوتے رہے۔ 1959 میں وہ امریکہ چلے گئے اور وہاں لسانیاتی اسلوبیات کے ماہر پروفیسر اے۔ ہل سے بہت فیض حاصل کیا۔ اس طرح ان کی دلچسپی اگرچہ ادب سے رہی لیکن آہستہ آہستہ وہ ادب سے زیادہ لسانیات کی طرف مائل ہوتے گئے اور جب علی گڑھ میں شعبۂ لسانیات قائم ہوا تو مسعود حسین خاں اس کے پہلے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ لیکن ان کو علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا لسانیات کا شعبہ صرف کاغذ پر قائم ہوا تھا۔ ''ورود مسعود'' میں لکھتے ہیں کہ:

''علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ لسانیات کا شعبہ صرف کاغذ پر قائم ہوا تھا۔ میرا اس کی پروفیسری پر تقرر ضرور ہو گیا تھا لیکن نہ تو طلبہ تھے، نہ اسٹاف اور نہ کمرے۔ وقتی طور پر آل احمد سرور صاحب، صدر شعبہ اردو کی عنایت سے ان کے شعبے میں مجھے ایک کمرہ مل گیا اور پڑھانے کے لیے تاریخ زبان اردو کے چند گھنٹے۔۔۔''

علی گڑھ میں شعبہ لسانیات کو آگے بڑھانے میں مسعود حسین خاں نے جی توڑ محنت کی تھی اور اس محنت و مشقت میں وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔ جب اس شعبہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ کا سلسلہ شروع ہوا تو ایسے موضوعات پر کام کرایا گیا جن کا تعلق براہ راست اردو زبان سے تھا مثلاً سولہویں تا اٹھارہویں صدی کی شمال ہند کی اردو کا لسانیاتی تجزیہ، اردو ہندی کا تقابلی مطالعہ، دہلی کی کرخنداری اردو کا تجزیہ، دکنی اردو کا تجزیہ وغیرہ وغیرہ۔ اس شعبہ میں انہوں نے ایک سمینار ہال لائبریری اور صوتیات کی لیباریٹری قائم کی۔ لائبریری کے لیے وہ خود دہلی جا کر منشی رام منوہر لال کی دکان پر گھنٹوں وقت بتاتے اور کتابیں منتخب کرتے تھے اور صوتیات کی لیباریٹری کے لیے ایک سینئر ٹیکنیشن مبین احمد خاں کا تقرر کیا اور ٹیپ ریکارڈ و ٹیپ

خریدے۔اس عہدے پر وہ 1968 تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔یہاں بھی ان کی علمی سرگرمیاں جاری رہیں۔اسلوبیات کی طرف انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ایم۔اے لسانیات کے نصاب میں اسلوبیات کو شامل کیا اور اس موضوع پر خود بھی مضامین شائع کرائے اور اپنے شاگردوں میں بھی تحریک پیدا کی کہ وہ اس موضوع پر لکھیں۔

مسعود حسین خاں کا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے دلی لگاؤ تھا۔ایک تو اس لیے کہ ان کی ابتدائی تعلیم اسی یونیورسٹی سے ہوئی تھی اور دوسرے ان کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔1973ء میں جسٹس ہدایت اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امیر جامعہ تھے۔اسی سال پروفیسر محمد مجیب کے مستعفی ہونے سے وائس چانسلر کا عہدہ خالی ہو گیا۔یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کے لیے اکیڈمک نے جو پینل تجویز کیا تھا، ان میں دو نام تھے۔پروفیسر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر سلامت اللہ۔جسٹس ہدایت اللہ نے ان میں سے پروفیسر مسعود حسین خاں کا نام منتخب کر دیا اور مسعود صاحب 3 نومبر 1973ء کو وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ان کو عہدوں کی ہوس نہیں تھی۔انہیں کئی عہدوں کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے انکار کر دیا لیکن جامعہ کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔یہاں ایک تو ان کا یونیورسٹی سے ذہنی اور قلبی رشتہ اور دوسرے ان کا یہ خیال تھا کہ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن کر وہ ملک و قوم کی اور خاص طور سے اردو کی خدمت کر سکیں گے۔مسعود حسین خاں اپنی خودنوشت سوانح ''ورود مسعود'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جامعہ کے پونے پانچ سال کے قیام پر جب غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا کھویا اور کیا پایا، تو ذاتی طور پر کھونے کا پلڑا کچھ بھاری نظر آتا ہے۔بنیادی طور پر میرے ذہن کی افتاد انتظامی کے بجائے تعلیمی ہے۔تعلیمی مصروفیات میں مجھے خوشی زیادہ ملتی ہے۔اس لیے علی گڑھ کے طویل قیام میں ابتداء میں وارڈن رہنے کے بعد میں نے کبھی دوسرا عہدہ قبول نہیں کیا۔ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے مجھے سرسید ہال کے پرووسٹ کے عہدے کی پیش کش کی تھی۔میں نے اس سے بھی معذرت کر لی تھی۔لیکن جب عابد صاحب اور دیگر بزرگوں نے مجھے جامعہ چلے آنے کو کہا تو اسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔اس کی وجہ کرسی کی ہوس نہیں بلکہ

اس ادارے سے وہ محبت تھی جو اسکول کے دنوں سے میرے دل میں جاگزیں تھی۔ چنانچہ میں نے اس جذبے کا اظہار جامعہ پہنچ کر اپنی تقریر میں اس طرح کیا:

''لوگ اوکھلی میں سر دیتے ہیں، میں نے اوکھلے میں سر دیا ہے۔' اسی اسپرٹ کے ساتھ میں جامعہ پہنچا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وائس چانسلری کی ذمہ داریوں سے مجھے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ حالانکہ پروفیسر محمد مجیب کا مشورہ بھی یہی تھا کہ میں اپنا علمی کام جاری رکھوں، انتظامی معاملات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جامعہ پہنچ کر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تصنیف کا قلم رکھ کر دستخطوں کے قلم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جامعہ کے میرے پونے پانچ سال اس لیے علمی لحاظ سے بنجر رہے کہ سوائے چند خطبات اور مضامین کے اور کچھ نہ لکھ سکا۔''

مسعود حسین خاں کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے جامعہ ملیہ میں کوئی پروفیسر نہ تھا۔ اسے ڈیمڈ ٹو بی یونیورسٹی کہا جاتا تھا یعنی صرف یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنے عہد میں سب سے بڑا اور اہم کام یہ کیا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے منظوری حاصل کر کے اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا اور مختلف شعبوں میں با قاعدہ پروفیسر مقرر کیے۔ سب سے پہلا تقرر شعبۂ اردو میں اور دوسرا شعبۂ تاریخ میں کیا۔ شعبۂ اردو کو فعال بنایا اور دوسری یونیورسٹیوں کے لیے اسے مثالی بنایا۔

اس وقت تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صرف تاریخ میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز ہوتی تھیں۔ مسعود حسین خاں کو یہ احساس تھا کہ اگر جامعہ میں اردو کی با قاعدہ اعلیٰ تعلیم نہیں ہوگی تو پھر کس یونیورسٹی میں ہوگی؟ کیوں کہ اس وقت تک جامعہ ہندوستان کی واحد یونیورسٹی تھی جس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا، اس لیے مسعود حسین خاں نے اردو تعلیم کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے ایک نئے اسکالر کی تلاش کی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تقرر کر دیا۔ حالاں کہ ان کے اس انتخاب سے جامعہ کے کچھ لوگوں کو بہت اعتراض تھا لیکن مسعود حسین خاں نے ان باتوں کی پرواہ نہیں کی۔

مسعود حسین خاں بڑی تمناؤں، آرزؤں اور بلند و مستحکم ارادوں اور حوصلوں کے ساتھ اس یونیورسٹی میں تشریف لائے اور اس کو ایک آئیڈیل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے لیکن

جامعہ کے کچھ حضرات کی گروپ بندی اور آپسی اختلافات سے اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکے اور نتیجتاً پانچ سال بعد وائس چانسلر شپ کی مدت ختم ہونے سے کچھ دن پہلے ہی 15 اگست 1978ء کو استعفیٰ دے کر وہ علی گڑھ واپس چلے گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ انتہائی مخلص اور باحوصلہ وائس چانسلر سے محروم ہو گیا۔

اگست 1978ء میں مسعود حسین خاں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک بار پھر لسانیات کے استاد مقرر ہو گئے۔ دو سال تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ 1980ء مسعود حسین خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1981 میں وہ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے اور 1982 تک اس ادارے میں رہے۔ یہاں انہیں اقبالیات کے غائر مطالعہ کا بہترین موقع ملا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اقبال کی شعریات پر کتاب لکھی۔

1962ء میں مسعود حسین خاں پروفیسر کی حیثیت سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ دکنی اور دیگر متون کی بازیافت اور ان کی ترتیب و تدوین ان کے قیام حیدرآباد کا ایسا کارنامہ ہے جسے علمی دنیا میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ دکنی اردو کی لغت بھی مسعود حسین خاں کی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ مسعود حسین خاں کو عثمانیہ میں نہ صرف اپنا تحقیقی کام کرنے کے مواقع ملے بلکہ ان کی نگرانی میں بعض طلبہ نے نہایت اعلیٰ تحقیقی مقالے بھی لکھے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کیں۔ ان میں ڈاکٹر مغنی تبسم کا مقالہ ''فانی: حیات اور شاعری'' اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا ''رشید احمد صدیقی: حیات اور شاعری''، تحقیقی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں حالاں کہ مسعود حسین خاں کو اس بات کا افسوس رہا کہ رشید احمد صدیقی پر کام علی گڑھ میں ہونا چاہیے تھا۔

'بزم اقبال' آگرہ کے زیر اہتمام 1939ء میں جامعہ اردو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس وقت جامعہ اردو کے رجسٹرار طاہر فاروقی صاحب تھے۔ تقسیم ہند کے بعد 1948 میں ظہیر الدین علوی اسے آگرہ سے علی گڑھ لے آئے اور سب سے پہلے اس کا دفتر جانسن

کے کارخانے کے ایک کمرے میں منتقل ہوا۔ بعد میں سرسید ہال کے ایک کمرے میں جو شعبۂ اردو سے ملا ہوا تھا، منتقل ہوا۔ علوی صاحب سارا کام خود کرتے تھے۔ مسعود حسین خاں کا تعلق براہ راست رشید صاحب کی تحریک پر شیخ الجامعہ کی حیثیت سے قائم ہوا۔ جامعہ کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ایسی ہی فعال شخصیت کی ضرورت تھی جو جامعہ کے وقار کو بلندی عطا کرے اور اسے آگے بڑھانے میں معاون ہو۔ انہوں نے اس ادارے کی خدمت بڑی دیانت داری اور لگن سے انجام دیا۔ اس کی ترقی اور اس کو آگے بڑھانے کے امکانات پر ہمیشہ ان کی نظر رہتی تھی۔ انہوں نے جامعہ کی زمین پر چودہ دکانیں تعمیر کرا کے اس کی آمدنی میں اضافہ کیا اور اس مارکیٹ کا نام ''اردو بازار'' رکھا۔ یہ اردو سے ان کی محبت کی مثال ہے۔ مسعود حسین خاں جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کے ساتھ شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاحیات پروفیسر ایمریٹس رہے ہیں۔ اتنا بڑا اعزاز بہت کم پروفیسروں کو ملا ہے۔

مسعود حسین خاں نے ہارورڈ، آسٹن اور ٹیکساز تینوں یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور وہاں کے علمی و ادبی ماحول کا تذکرہ اپنی خودنوشت ورود مسعود میں تفصیل سے کیا ہے ساتھ ہی ساتھ لسانیات کے تئیں وہاں کے لوگوں کے نظریے کے بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کی ہے اور ادب و لسانیات کے درمیان رشتے پر بھی نظر ڈالی ہے کہ کیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ انہوں نے امریکہ میں رہتے ہوئے وہاں کے مختلف شہروں کا بھی سفر کیا تھا اور وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ حاصل کیا تھا۔ وہ ایک جگہ امریکی لائبریری اور اس کے نظام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''امریکن یونیورسٹیوں میں کتب خانوں میں جو سہولتیں ہیں وہ قابل رشک ہیں۔ کون سی کتاب ہے جو وہاں موجود نہیں اور جو موجود نہیں وہ منگا دی جاتی ہیں۔ کتب خانوں کا عملہ عبادت کے طور پر آپ کی خدمت کرنے کو تیار رہتا ہے۔ غرض کہ ایسا ماحول ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ کتب کی فراہمی کے علاوہ جدید فوٹو گرافی کی تیکنک سے جس قدر سہولتیں پیدا کی جاسکتی ہیں وہ بھی سب موجود تھیں۔ میں نے برکلے کی لائبریری میں فوٹو فلموں کی شکل میں مسلم لیگ پر ایسا مواد بھی دیکھا جو ہندوستان تک میں دستیاب نہیں۔''

مذکورہ اقتباس میں انہوں نے ہندوستانی لائبریریوں اور تعلیمی انتظام پر طنز کیا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا تھا وہاں کے تعلیمی معیار کو دیکھ کر ان کو رشک ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اُسی طرح کے تعلیمی نظام کو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ حالانکہ انہوں نے ایسی کوئی باقاعدہ تحریک نہیں چلائی تھی جس طرح سرسید نے علی گڑھ تحریک کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا تھا۔ لیکن پھر بھی مسعود حسین خاں تمام عمر علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ ایک جامع حیثیات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ان گنے چنے اہل قلم حضرات میں سے ہیں جنہیں اردو ادب کی تقریباً ہر صنف پر دسترس حاصل ہے۔ مسعود حسین خاں کے علمی و ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں جو گرانقدر اضافے کیے ہیں اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کے وہی نظریات تھے جو ذاکر صاحب اور سیدین صاحب کے تھے۔ یعنی تعلیم کے ذریعہ ذہن کے جالوں کو صاف کرنا اور ایک وسیع عالمی انسان دوستی کا تصور قائم کرنا۔

ورود مسعود پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود حسین خاں کا محبوب مشغلہ علم بانٹنا اور علم بٹورنا تھا۔ انہوں نے اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے اردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ وہ اردو ادب میں ان گنے چنے اہل قلم میں سے ایک ہیں جن کو بیشتر اصناف پر دسترس حاصل ہے۔ مسعود حسین خاں نے علم و ادب کی دنیا میں جو خدمات انجام دی ہیں اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور ان کا نام علمی و ادبی دنیا میں ہمیشہ سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام سونیا چرنیکووا کے اس اقتباس پر کرتی ہوں جو ان کے مضمون ''مسعود صاحب کی شخصیت'' سے لیا گیا ہے:

''مسعود صاحب کی شخصیت میرے دل میں ان کی عظمت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی اہل علم ایسا نہ ہوگا جو مسعود صاحب کی علمی و ادبی حیثیت تسلیم نہ کرتا ہو۔ مسعود صاحب کی لسانیات پر لکھی کتابوں کی اصل قدر میں نے اپنے ملک میں جا کر جانی۔ شعر و زبان، اردو زبان اور ادب، مقدمہ تاریخ زبان اردو وغیرہ۔ ان کو غور سے پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ لسانیات و ادب میں ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔''

شائستہ پروین وجرار احمد۔ پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد

رابندر ناتھ ٹیگور کا نظریۂ تعلیم بطور عالمی اخوت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ادراک حاصل کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ جس کی بنا پر اسے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ چونکہ انسان میں غور و فکر تدبر کرنے جیسی صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ صلاحیتیں کسی انسان میں ادنیٰ ہوتی ہے کسی میں اوسط اور کسی میں اس قدر اعلیٰ سطح کی ہوتی ہیں کہ اسے شاہکار بنا دیتی ہیں۔ موت بھی انہیں نہیں مار سکتی۔ اپنی فکری صلاحیت کی بنا پر ایسی شخصیتیں صدیوں زندہ رہتی ہیں۔ انہیں شخصیتوں کی فہرست میں رابندر ناتھ ٹیگور کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، مصنف، مدبر اور مفکر تھے۔ جس میدان میں قدم اٹھایا پوری طرح اٹھایا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا فلسفۂ تعلیم، تعلیم کے میدان میں ایک روشن مشعل ہے۔

ان کی پیدائش ۶ رمئی ۱۸۶۱ء میں ہوئی۔ ان کے والد مشہور مذہب کے رہنماء اور مصلح قوم دیوندر ناتھ ٹیگور تھے۔ ربندر ناتھ ٹیگور کی ابتدائی تعلیم سمیزی اسکول ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۸۷۷ء میں ولایت گئے۔ وہاں سے آنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں بول پور کے قریب شانتی نیکیتن قائم کیا۔ جو فی الوقت وشو بھارتی اسکول کے نام سے معروف ہے۔

ربندر ناتھ ٹیگور پہلے ہندوستانی مفکر ہیں جنہوں نے تعلیمی میدان میں تخلیقی تبدیلی کی وکالت کی انہوں نے نہ صرف رائج الوقت تعلیمی نظام میں بہتری لائی بلکہ تعلیم کو نئے پہلوؤں سے آراستہ کیا۔ تعلیم کے میدان میں ان کا نمایاں وہ بنیادی کام دنیا کی مختلف

تہذیبوں کوتعلیم سے جوڑنا تھا۔ان کا خواب تھا کہ وہ ایک انسان کے اندر تعلیم کے ذریعہ مختلف تہذیبوں کی آمیزش کرسکیں۔انہوں نے ایسی دنیا کی وکالت کی جس میں مختلف آوازیں ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں۔ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے بھائی چارگی، الفت و ہمدردی کا جذبہ ہو۔باہمی اتفاق سے امن وامان قائم کریں اور برقرار رکھیں۔وہ ان تمام رکاوٹوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے جو فرد واحد کے اندر مختلف تہذیبوں کی آمیزش کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ان کہنا تھا تعلیم کا مقصد انسان کو صرف مختلف تہذیبوں کی آشنائی کے لیے اکسانا نہیں ہے بلکہ ان کی عزت اور انہیں اپنی شخصیت میں سرایت کرنا تھا۔

ٹیگور کے فلسفہ بنیادی اصول اور انفرادی آزادی اور بنی نوع انسان کا اتحاد تھا۔وہ اتحاد صرف اپنے ملک کے لوگوں کے بیچ نہیں بلکہ وہ پوری کائنات کو ایک خاندانی شکل میں دیکھنے کے متمنی تھے۔اپنے اسی خواب کی تکمیل کے لیے انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں اور بیرونِ ملک کے دانشوروں اور فن کاروں کو شانتی نیکیتن میں مدعو کیا۔جس سے وہ سب یکجا رہ کر اپنی تہذیب وثقافت سے وشو بھارتی کو رنگ برنگے گلوں سے سجے گلدستے کی طرح آراستہ کریں۔

شاعر کے کردار میں انہوں نے اپنی مشہور انگریزی میں لکھی نظم in adedium other then words میں اپنی مقصدِ حیات کا ذکر کیا ہے۔جس میں تعلیم کے ایک نئے منصوبہ کو پیش کیا۔اس منصوبے کے تحت طلباء قدرتی اکتساب کے خوشگوار ماحول میں مختلف عالمی تہذیبوں کا ردوبدل سیر وتفریح کے انداز میں کریں۔

تعلیم ایسی ہو جو پوری کائنات میں ایک ہونے کا احساس پیدا کر سکے۔جیسا کہ اس سلسلے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

The meeting ground of cultures, as Rabindranath

envisioned it at Vishva Bharti, should be a learning center where conflictig interest are minimized, where individuals work together in a common persuit of truth and realise ' that artist in all parts of the worldhave created forms of beauty, scincetists discoverd secrets of universe, philosophers solved the problems of existence, saints made the truth of the spritual world organic in their own lives, not merely for some particular race to which they belonged, but for all mankind.; (Tagore 1922:171-2)

درج بالا باتوں سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ تعلیم ایک طاقتور ہتھیار ہے ۔جس کے ذریعہ عالمی اخوت و بھائی چارگی کو پورے عالم میں پھیلایا جا سکتا ہے۔

الغرض ربندر ناتھ ٹیگور نے اپنی اعلیٰ فکری صلاحیت سے عالمی اخوت کو پھیلانے کے لیے تعلیمی نصاب کے ساتھ دیگر تجاویز بھی پیش کیا ہے۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کا ترجمان
ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد

شبنم شمشاد۔ ایم۔فل (ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد

رہبرانِ قوم مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور تعلیم کے جہات

ابوالکلام آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک سیاست داں، مدبر، معلم، مصنف، ماہر تعلیم، مترجم، صحافی، صاحب طرز ادیب، شاعر اور مذہبی رہنما بھی تھے۔ انھوں نے اپنی علمیت، اہلیت اور فعال طبیعت سے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ انھیں ایک فرد کے بجائے اگر ایک ادارہ کہا جائے تو بجا نہ ہوگا۔ ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔ مذہب، فلسفہ، منطق، فنون لطیفہ اور سماجی علوم کے علاوہ وہ کئی زبانوں کے ماہر بھی تھے۔ فرانسیسی، انگریزی، فارسی، ترکی، اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے عالم بھی تھے جو ان کی مادری زبان بھی تھی۔ انھیں موسیقی سے بھی شغف تھا۔ مولانا آزاد نے ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی، سنگیت کلا اکادمی یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن، کونسل فار ہسٹوریکل ریسرچ، کونسل فار سوشل سائنس اینڈ ریسرچ، این سی ای آر ٹی اور سائنس وٹیکنولوجی سے جڑے متعدد ادارے انھوں نے قوم کو دیئے ہیں۔ وہ ہندستان کی جدوجہد آزادی میں سرگرم عمل رہے اور کئی بار جیل بھی گئے۔ فرنگیوں اور ان کے نظام حکومت کے خلاف عدالت میں ان کا بیان ''قولِ فیصل'' کافی جرأت مندانہ تھا۔ انھوں نے اپنی انگریزی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں ہندستان کی سیاسی اور، سماجی تاریخ کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''غبار خاطر'' جو بظاہر خطوط کا مجموعہ ہے جو حبیب الرحمان شیروانی کو جیل میں لکھے گئے اور کبھی پوسٹ نہیں ہوئے،

اردو ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ابوالکلام آزاد تقسیم ہند کے خلاف تھے اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی بات کرتے تھے۔ ان کا شمار ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے محافظوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے اخباروں میں سے''الہلال اور البلاغ'' میں اپنے نظریوں اورخیالوں کی خوب تشہیر کی اور ہندستان کے مسلمانوں کے لئے صحیح راستوں کا تعین کیا۔ان کا ایک بڑا کارنامہ''ترجمہ القران'' ہے جس کی تفسیر کے حوالے علمی و مذہبی مباحث میں آج بھی دیئے جاتے ہیں۔

مولانا آزاد بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھے۔ان کی فکر وعمل کا سرچشمہ وہ انسانی اور اخلاقی اقدار تھیں جو مذہب کی بنیاد ہیں۔انھوں نے''ترجمہ القرآن''میں''سورۃ فاتحہ'' کی تفسیر کرتے ہوئے تعلیم کے مقصد کا خلاصہ کیا ہے جس میں تمام انسانوں کی طرف مساوات کا رویہ پیدا کرنے کو تعلیم کا نام دیا ہے۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو افضل سمجھتا ہے جو فساد اور باہمی کشمکش کی جڑ ہے۔اگر تعلیم انسانی مساوات کو اپنا لائحہ عمل بنالے تو یہ عالمی امن و آشتی کی راہ میں ایک بڑا قدم ہوگا۔ پھر انسان ایک دوسرے سے علحیدگی کے بجائے یگانگت محسوس کرے گا اور تعلیم مختلف فرقوں میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل پیدا کرے گی،توڑنے کے بجائے جوڑے گی کہ نوع انسانی کا ایک ہی پروردگار ہے جو نسل و مذہب، ملک وقوم کی بنا پر اپنے بندوں کے درمیان تفرق نہیں کرتا، ایسا لگتا ہے کہ مولانا آزاد ہندستان کے عام تعلیمی نظام میں دینی تعلیم کے حق میں تھے۔اس خیال کا اظہار انھوں نے وزیر تعلیم ،حکومت ہند کی حیثیت سے بھی اپنے ایک صدارتی خطبہ میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اس کا کیا نتیجہ ہوگا اگر حکومت محض خالص سیکولر تعلیم کی ذمہ داری نبھائے۔اس صورت میں قدرتی طور پر لوگ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم کا انتظام نجی طور پر کریں گے لیکن جو لوگ پہلے سے مذہبی تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں،ان کے نزدیک مذہب کے معنی تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ـــــــــــــــــــ اگر ہم اپنے ملک کی دانشورانہ زندگی کو اس خطرے سے

بچانا چاہتے ہیں، تو ہمارے لئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ابتدائی مذہبی تعلیم کو نجی اداروں پر نہ چھوڑیں۔''

(سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کا اجلاس، ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء)

اس خطبے سے اشارہ ملتا ہے کہ مولانا مذہب کو نظامِ تعلیم کا جزو بنانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک بڑے فرق کے ساتھ۔ ان کا مذہب اس سے بالکل مختلف تھا جس کی تعلیم عام طور پر دینی مدارس اور دھارمک پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی جہاں مذہب کے نام سے تنگ نظری اور تعصب پھیلایا جاتا تھا۔ مولانا آزاد سیاسی میدان میں ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے تو تہذیبی معاملات میں مشترکہ تہذیب کے وکیل۔ مولانا کے نزدیک متحدہ قومیت کی معنی یہ ہرگز نہیں تھے کہ تعلیم میں مسلم تہذیب کی امتیازی خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سمپورنانند جی کی اس تقریر پر سخت نقطہ چینی کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ وہ تعلیم و تہذیب کے معاملہ میں ہندو مسلم امتیاز دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اسی بنیاد پر اردو کو نصابِ تعلیم سے خارج کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک زبان و ادب، تاریخ، مذہب اور فنونِ لطیفہ کا تعلیم میں خاص مقام ہے اس لئے ان مضامین کو تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہئے۔ وہ متحد قومیت کے قائل تھے اور بیک وقت ایک اچھے مسلمان اور سچے ہندستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے تھے۔

مولانا حقیقی معنی میں ایک مفکر اور عالم تھے۔ ان کا دائرۂ عمل نہایت وسیع تھا۔ ان کی نظریں زمانے کے پیچ وخم سے خوب آگاہ تھیں۔ وہ مصالحِ ملکی اور تعلیم کے منصب کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی نگارشات میں اپنے تعلیمی خیالات کا خوب اظہار کیا ہے۔ ان کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر اتحادِ فکر کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ''تذکرہ'' میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

''انسان کے لئے معیارِ شرف، جوہرِ ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کو روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل''۔

ان کا یہ عقیدہ تمام عمران کے ساتھ رہا۔مولانا آزاد نے اپنے زمانے کے عام دینی رہنماؤں کی طرح مذہب کو ایک جامد اور مافوق البشر تصور تک ہی محدود و پابند نہیں رکھا تھا اور نہ ہی دور حاضر کی مغربی تہذیب سے مرغوب ہو کر سطحی عقلیت کے سیلاب میں بہہ نکلے۔وہ دین ، فلسفہ اور سائنس کے مقام کا بیک وقت درک رکھتے تھے۔مولانا نے ایک پریس کانفریس میں تعلیم اور قومی تشکیل کے سلسلے میں چند اہم اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی تھی۔ان میں ایک مذہبی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا جہاں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیئے۔

مولانا آزاد تعلیم کو زندگی کی تیاری سے تعبیر کرتے تھے۔ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد سماجی ضرورتوں کے پیش نظر افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا جانا چاہیے کہ طلبا کی قابلیت کی سطح بلند ہو۔انھوں نے تعلیم میں آزادی کے تصور کو سراہا۔وہ ثانوی تعلیم میں کچھ اس طور تبدیلی چاہتے تھے کہ وہ خود تکمیل علم کی ایک منزل قرار پائے تاکہ بیشتر طلبا اس منزل کو طے کرنے کے بعد زندگی میں داخل ہو سکیں۔اس غرض سے انھوں نے کثیر المقاصد ثانوی مدارس کی تجویز پیش کی۔آج مولانا آزاد کی یہ بات پر زور طریقے سے دہرائی جا رہی ہے اور حکومت کی کوشش ہے کہ کسی طور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نااہلوں کے داخلے کی روک تھام کی جائے۔ان کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے جو ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔اگر بغور دیکھا جائے تو مولانا کے فلسفہ تعلیم سے ہندستان کا تعلیمی نظام پوری طرح متاثر نظر آتا ہے جہاں سچی دینداری، عقائد کی پختگی، انسان دوستی، عدل وضبط جیسی اقدار کی پاسداری موجود ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً بارہ برس ہندستان کے وزیر تعلیم رہے۔اس عرصے میں انھوں نے جو خطبات دیئے، ان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی تعلیمی فکر میں بڑی جامعیت تھی۔وہ تعلیم کا ایک ایسا تصور رکھتے تھے جس میں ماضی کا ادراک، حال کی

بصیرت اور مستقبل کی آ گہی تھی۔ مولانا کے تعلیمی تصور پر غور کرتے وقت ہمیں سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جس میں ان کے ایک قومی نظریے کو زبردست دھکا لگا اور ملک تقسیم ہو گیا جس کی وجہ سے مشترکہ قومی نظریہ کی پسپائی ہوئی لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی اور اپنی سربراہی میں ایسی تعلیمی پالیسیاں وضع کیں جس کی وجہ سے آج دنیا میں ہندستان کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مولانا آزاد کو ہندستان میں جدید تعلیم کا معمار کہا جا سکتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے مولانا آزاد کی تعلمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''ہندستان میں تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ مولانا آزاد ہی کا بنایا ہوا ہے۔

(ابوالکلام کے تعلیمی نظریے، ایوان اردو، آزاد نمبر ۱۹۸۸ء)

مولانا آزاد کے خیالات اور افکار تعلیم پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی تعلیمی فکر کے حامل تھے جس میں مشرق ومغرب کے جدید فکری رجحانات پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ان افکار میں مولانا آزاد کا تصور تعلیم نمایاں طور پر منعکس نظر آتا ہے۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نے دینی مدارس کو جدید بنانے کے لئے مشورہ دیتے ہوئے نصابات میں فلسفہ اور سماجی وسائنسی علوم کی شمولیت پر بھی زور دیا ہے۔

(خطبہ صدارت، عربی نصاب کمیٹی، ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء، لکھنو)

یہاں انہوں نے مادری زبان کی اہمیت پر بھی زور دیا اور مشورہ دیا کہ ابتدائی تعلیم ہمیشہ مادری زبان میں ہونا چاہئے۔ مولانا نے تعلیم، زمانہ اور وقت کے باہمی رشتے پر بھی اظہار خیال کیا۔ کہتے ہیں:

''وقت اور زندگی کی چال کے متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ----------------اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ رکھیں گے تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ آپ کی تعلیم کو زمانے کی مانگوں سے کوئی رشتہ نہیں اور زمانے نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ دے دیا ہے''۔

(خطبات آزاد، مرتب: مالک رام)

مولانا آزاد کی فلسفہ تعلیم پر گہری نظر تھی۔ رادھا کرشن (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی مشرق اور مغرب میں فلسفہ کی تاریخ پر لکھی گئی کتاب کے دیباچہ میں مولانا نے مشرق و مغرب کی مشترکہ آگہی پر زور دیا اور فرد اور سماج کے باہمی رشتے کی اہمیت بیان کی اور اس کو صحیح تعلیم سے تعبیر کیا۔ مولانا کے خیال میں محض روٹی روزی انسان کی تعلیم کا مقصد نہیں بلکہ انسان کی تعمیر نو اور آزاد شخصیت کی نشو ونما تعلیم کا عین مقصد ہے۔ خواجہ غلام السیدین نے مولانا کے تعلیمی فلسفے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

مولانا کے سامنے تعلیم کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا بہتر افراد کی تربیت یعنی ایسے افراد جن کی ذات میں بلند نظری، جرأت، رواداری اور دیانت داری ہوتا کہ ان کے ذریعہ ایک بہتر سماج کی تشکیل ہو سکے۔

مولانا آزاد نے سر سید احمد خاں کے مذہبی اور تعلیمی کارناموں کو سراہا ہے لیکن ان کے بعض تعلیمی نظریوں کی تنقید بھی کی ہے۔ وہ مغرب پرستی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی ثقافتی میراث سے بے تعلق ہو چکا ہے۔ مولانا کے ذہن میں تعلیم کا جو مقام تھا، نظری حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ قومی سطح پر تنظیم تعلیم کے نقشے میں مناسب مقام حاصل نہ کر سکا۔ اس کا انھیں افسوس بھی تھا۔ مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ قوم کی اصلاح ایک موزوں نظام تعلیم کے ممکن نہیں ہے جس کی خصوصیات انھوں نے یہ بتائی ہیں:

''چھے سے چودہ سال کے بچوں کے لئے لازمی تعلیم اور جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ناخواندہ بالغوں کے لئے سماجی تعلیم کا انتظام اور بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کرنا، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ ان کے معیار کو بلند کرنا، ملکی ضرورتوں کے شایان شان ٹیکنیکل اور سائنٹیفک تعلیم کا انتظام اور قومی تہذیب کو مالا مال کرنے کے لئے آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترویج''۔

(مولانا آزاد کا فلسفہ تعلیم، از: خواجہ غلام السیدین، صفحہ ۶۳)

محمد اعجاز احمد ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسیٹی، حیدرآباد

تعلیم کا اصل مقصد: قرآن کی روشنی میں

تعلیم سے صرف یہ مراد نہیں کہ ہم کسی ادارے، اسکول یا یونیورسیٹی سے جس تعلیم کو حاصل کر رہے ہیں وہی تعلیم کے معیار کو پورا کرتا ہے۔ بلکہ ہر وقت انسان جو کچھ بھی سیکھتا ہے وہ اس کے لیے تعلیم ہے۔

بچے کی تعلیم کا پہلا مرکز اس کی ماں کا گہوارہ ہوتا ہے۔اس کے بعد اس کے والد، گھر والے، اساتذہ اور گردونواح کا ماحول ہوتا ہے۔ان مراکز سے بچہ جو کچھ بھی سیکھتا ہے اس کے لیے وہ تعلیم ہے۔ بچے کو جو بھی عادات وافعال سیکھایا جاتا ہے اسے ایک اچھا انسان بننے کے لیے ہی سیکھایا جاتا ہے۔ بچہ کوزہ گر کے ہاتھ کی وہ مٹی ہے جسے وہ چاک پر کوئی بھی شکل دے سکتا ہے۔ تعلیم انسان کو جانور یا وحشی درندے سے الگ کرتا ہے ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ عقل وفہم کے باعث ہی انسان کو تمام مخلوقات میں اشرف المخلوق کا درجہ دیا گیا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا ہونا چاہیے؟ کیا ہم تعلیم کے اصل مقصد تک رسائی پانے میں کامیاب ہیں۔ تعلیم سے مراد تربیت پانا یا علم سیکھنا ہے اور علم ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ علم کے لغوی معنٰی ''دانائی'' ہنر اور فن کے ہیں۔ اگر تعلیم کے اصل مقصد کی بات کی جائے تو تعلیم کا اصل مقصد آدمی کو مہذب انسان بنانا ہے؛ مہذب انسان یعنی تہذیب والا ،جس کے اندر وہ روحانی جذبات پیدا ہوں جس سے اس میں ایمانداری، سچائی، نیکی، احساس محبت، دوسروں کے درد کو محسوس کرنا اور خدا کی ہر تخلیق سے محبت کرنا نمودار ہو۔

اگر ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن ہماری ذہنی فکر میں کوئی بہتر تبدیلی رونما نہیں ہو رہی ہے جو ہمارے اندر کی خود پرستی کو دور کر سکے تو ہم تعلیم کے اصل مقاصد سے بہت دور ہیں۔ قرآن علم کے تعلق سے کیا کہتا ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

''جب اللہ فرشتوں سے کہتا ہے کہ؛ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو

فرشتے کہتے ہیں ؛ کیا ایسے کو نائب بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں۔'' تو خدا کہتا ہے۔

''قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ''

ترجمہ: فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

''وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا''

ترجمہ: ''اور اللہ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے''

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تمام اشیاء و جملہ مسمیات پیش فرما کر آپ کو ان کے اسماء، صفات، افعال، خواص، اصول اور علوم وصناعات سب کا علم بطریق الہام عطا فرمایا اور پھر سب اشیاء کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا کہ سچے ہو تو ان کے نام تو بتلاؤ؛ یعنی اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ میں کوئی مخلوق تم سے زیادہ علم والا نہ پیدا کروں گا اور خلافت کے تم ہی مستحق ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ کیونکہ خلیفہ کا کام تصرف وتدبیر اور عدل وانصاف ہے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ خلیفہ کو ان تمام چیزوں کا علم ہو جن پر اس کو متصرف فرمایا گیا اور جن کا اس کو فیصلہ کرنا ہے۔ جب فرشتے نہ بتا سکے تو انہوں نے کہا کہ پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک تو ہی علم وحکمت والا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا اے آدم بتادے انہیں سب اشیاء کے نام، جب آدم نے انہیں سب اشیاء کے نام بتادیئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے ملائکہ پر افضل ہونے کا سبب علم ظاہر فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ علم اسماء خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت سے افضل ہے؛ اس آیت کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء علیہ السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔ علم کے لیے ہمارے سرکار محمد ﷺ بھی تاکید کرتے ہیں۔

حدیث: وُطْلُبُوْا الْعِلْمَ وَ لَوْ کَانَ بِا السِّیْنِ

ترجمہ: علم حاصل کرو اگر چہ تمہیں چین بھی جانا پڑے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

حدیث: طَلَبُ الْعِلْمَ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةِ

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

تو کیا ہم اس علم کو حاصل کر رہے ہیں جس علم کے لیے تاکید کی گئی ہے۔ جو علم مطلق ہے۔ جو دینی اور دنیاوی دونوں میں شامل ہے اور اگر ہم علم حاصل کر رہے ہیں تو کیا اس کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔

یہاں دور حاضر کی تعلیم کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے گا جو ہمارے لیے بے حد ضروری قرار دی گئی ہے۔ تعلیم زندگی میں ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے، مگر کیا آج کی تعلیم سے ہمارے معاشرے میں کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے جس مقصد کے تحت تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے کیا وہی رنگ ہمارے معاشرے میں دیکھنے کو مل رہا ہے جو کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد رونما ہونا چاہیے یا کچھ اور ہی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں؟

اگر غور کیا جائے تو آج زیادہ تر لوگ تعلیم اس لیے حاصل کر رہے ہیں کہ ان کو روزگار مل جائے اور اس سے وہ مال و دولت حاصل کر کے سماج میں اپنی بڑائی ثابت کر سکیں۔ ان کی سوچ محدود ہے؛ وہ تعلیم کو دولت کمانے کا ذریعہ تسلیم کرتے ہیں، جبکہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے مگر صرف ہم اپنے نظریے کو تبدیل کر لیں تو خود بخود روزگار بھی ملے گی اور علم کے اصل مقاصد بھی پورے ہوں گے، کیونکہ اگر آپ اس نظریے سے علم حاصل کرتے ہیں کہ میرا علم ایسا ہو جو کہ دوسروں کے لیے مفید ہو؛ تو آپ علم کی وجہ سے نوکری بھی پا سکتے ہیں اور اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ بھی پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن آج ایسے کم ہی لوگ ملیں گے جو علم کو معاشرے کے فائدے کے لیے حاصل کرتے ہوں گے۔ غالبؔ کا ایک شعر پیشِ نظر ہے۔

بس کہ دُشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا　　　آدمی کو بھی میسّر نہیں، انساں ہونا

آج تعلیم یافتہ لوگ بھی اس ترقی کرتی دنیا میں اس قدر عیش و عشرت میں محو ہو گئے ہیں کہ ان کو دوسروں کی حالت اور ان کے درد و غم وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ آج کے تعلیم یافتہ لوگوں میں خود پرستی کا جذبہ اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ اس سے باہر نکلنا ناممکن سا لگتا ہے اور ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان اور جانور میں زیادہ فرق نہیں کیونکہ جانور بھی اپنے پیٹ بھرنے سے مطلب رکھتا ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تعلیم انسان کے لیے بیش قیمتی سرمایہ میں سے ایک ہے۔ اگر تعلیم حاصل کرنے والوں کے نظریے جانوروں کی طرح یا وحشیانہ ہیں تو اس میں وہ کون سی چیز

کلیدی رول ادا کر رہی ہے جو تعلیم کو صرف پیسہ کمانے کا ذریعہ بناتی جارہی ہے۔ ہمیں اس پر بہت گہری غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا ہمارے اساتذہ تعلیم کے اصل مقاصد تک ہماری رسائی نہیں کرا پار ہے ہیں یا طالب علم اس تعلیمی مقاصد تک رسائی حاصل کرنا نہیں چاہ رہے ہیں۔

اساتذہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے شاگردوں میں علم و ہنر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ شاگرد اس ہنر کو اپنے ذہن وفکر کے ذریعے داخلی طور پر حاصل کرتے ہیں، لیکن ایسے اساتذہ اور طالب علموں کی کمی بہت زیادہ ہے؛ ورنہ آج کا زمانہ اتنا وحشی اور خود پرست نہ ہوتا۔ اگر ہمیں اپنے معاشرے کو خوش گوار بنانا ہے تو اس بات پر غور و فکر کی ضرورت ہے کہ اساتذہ طالب علموں کو کس طرح تعلیم دیں کہ وہ ایک اچھا انسان بن سکے اور طالب علم کو بھی یہ ضرورت ہے کہ وہ علم کیوں حاصل کر رہے ہیں اس پر غور کریں، ورنہ ایک جاہل آدمی بھی دولت مند ہوتا ہے، لیکن اس میں اور علم والوں کے عادات و افعال اور بات کرنے کے طریقے وغیرہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ زمانے کا المیہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے حقوق کی فکر تو ہوتی ہے مگر وہ اپنے فرائض کی انجام دیہی میں کوتاہی برتتے ہیں۔

تعلیم یافتہ لوگ اپنے حقوق کے ساتھ اگر دوسرے لوگوں کے بھی حقوق کا احترام کرنے لگے تو پوری دنیا میں حقوقِ انسانی کے پامالی میں کافی حد تک کمی آجائے گی اور انسانی حقوق کا تحفظ اور معاشرے کی اچھی صورت اس حال میں ممکن ہے کہ جب لوگ علم کے اصل مقاصد سے آراستہ و پیراستہ ہوں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم علم کے مقاصد اور اس کی خوبصورتی کو سمجھیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے علم سے ایک نئے معاشرے کی آرائش و زیبائش ہوگی۔ جس میں سب ایک دوسرے سے محبت کریں گے، ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار رہیں گے اور ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوں گے۔ ایسے سماج میں ملت واتحاد ،ملنساری اور بھائی چارگی پیدا ہوگی۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؔ کا ایک شعر پیش نظر ہے۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

محمد طارق۔ ریسرچ اسکالر شعبۂ مطالعات ترجمہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

سائنسی علوم کی ترقی میں ترجمے کا کردار

ترجمے کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی تاریخ کیونکہ خالق کائنات نے انسانوں کو اپنے تجربات و مشاہدات، اپنے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے صرف قوت گویائی ہی نہیں دی بلکہ اس میں تنوع بھی پیدا کیا یہی تنوع ترجمے کا ولین تلازمہ ہے۔ ترجمے کے ذریعے مختلف زبانوں کے جاننے والے لوگ علوم وفنون سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی لیے جب ہم دنیا کے مختلف ملکوں وخطوں میں زبان وادب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمام اہم زبانوں میں ترجمے کی روایت نہایت قدیم ہے۔ یہ ترجمے کی روایت ہی جس کی بدولت قدیم دور میں عرب وہندوستان کی سائنس، طب، ریاضی، ادب اور فلسفے کی کتابوں کے تراجم یونانی اور لاطینی زبانوں میں ہوئے اور یورپی اقوام نے ان تراجم کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارا اوران علوم کو مزید آگے بڑھایا۔ پھر یہ علوم یورپی قوموں کی مسلسل تحقیق وجستجو کے نتیجے میں پوری دنیا کے سامنے آئے۔ عرب وعجم کے علمانے یونانی اور ہندوستانی فلسفے، طب، ہیئت، نجوم اور داستانوں کے عربی زبان میں ترجمے کیے۔ انہوں نے لاطینی زبانوں سے ترجمے کی مدد سے مشرق کو یورپ کے علوم سے واقف کروایا اور سنسکرت کے ترجموں کے ذریعے مشرق کو مغرب کی علمی فتوحات سے باخبر کیا۔ سقراط اور افلاطون جیسے مفکرین کے خیلات ہم تک صرف اس وجہ سے پہونچ سکے کہ سیکڑوں برس پہلے عربی زبان کے اسکالروں نے انہیں اپنی زبان میں ترجمہ کر کے تمام دنیا کو ان سے متعارف کروایا، اسی طرح بوعلی سینا، ابن رشد، اور ابونظر فارابی کے کارناموں عرب ممالک کے حصاروں سے نکالنے کا

کام لاطینی زبانوں نے کیا اور پھر ان کے فلسفے اور افکار سے یورپی اقوام نے استفادہ کیا۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانی علوم کی ارتقا اور ان کے فروغ میں تراجم کے اہمیت مستقل اور مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی زبانے سے ہی ترجمے کا رواج رہا ہے، گوکہ ان ترجموں کی ہیئت اور ان کے مقاصد مختلف تھے جو انسانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے گئے۔

ترجمے کے مقاصد کو بنیادی طور پر پانچ مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1۔تہذیب وتمدن 2۔اقتدار کا حصول 3۔ادب 4۔مذہبی 5۔علم

علوم کی فنون کی ترقی اور ترسیل و اشاعت میں سب سے اہم رول ترجمے کا رہا ہے۔ یہ سلسلہ تاریخ کے نامعلوم دور سے آج تک دراز ہے۔عہد حاضر میں سائنس وٹکنالوجی کی ترقی اور فروغ میں ترجمے کے کردار کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔اس وقت سائنسی علوم سمندر کی تہوں سے لامحدود فضاؤں تک بسیط ہو چکے ہیں ۔کل تک جہاں انسان کی عقل بی نہیں پہنچ سکتی تھی آج وہاں بہ نفس نفیس انسان کی پہنچ گیا ہے۔علمی ترقی کے زور پر انسان کائنات کو مسخر کرنے میں کاربند ہے۔اس نے مختلف علوم ایجاد کیے اور پھر ان علوم کی مدد سے ایجادات وانکشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا، ہر روز ایک نئی دریافت سامنے آرہی ہے۔اس عہد کی سب سے حیرت انگیز ایجاد کمپیوٹر ہے جس کی مدد سے سالوں میں مکمل ہوسکنے والے کام سکنڈوں میں انجام دیے جارہے ہیں۔ مختلف کاموں کے لیے الگ الگ سافٹ ویئر تیار ہورہے ہیں، اس سے معجز نما ایجاد انٹر نیٹ ہے جس نے دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے انسانوں کو باہم مربوط کر دیا ہے، انٹرنیٹ معلومات کا ایسا بحر بے کراں ہے جس میں عربوں اور کھربوں کی تعداد میں ویب گاہیں موجود ہیں، جس میں معلوماتی، علمی، ادبی اور تفریحی مواد موجود ہیں، صرف انگلیوں کے اشارے سے اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سائنسی ایجادات مختلف شعبہ حیات میں قدم رکھنے کا پہلا زینہ ہیں۔طب کے میدان میں مین ٹکنالوجی اس قدر

ترقی کرچکی ہے کہ زندگی کے لیے سب سے لازمی چیز دل بھی مصنوعی تیار کرلیا گیا ہے، انسانی ذہن کو پڑھنے والے آلات ایجاد ہو رہے ہیں، مادر زاد نابینا کو بینائی دینے کی بات ہو رہی ہے۔ ہمارا پورا مواصلاتی نظام سائنسی ترقی کا ہی تو مرہون منت ہے۔ پلک جھپکتے پوری دنیا کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔علوم کی مختلف شاخوں میں شاخ در شاخ کا اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ایک ایک شاخ اتنی گھنیری اور پر پیچ ہے کہ صرف شاخ واحد کی مکمل سیر مشکل ہو جاتی ہے۔

علوم وفنون کی ترقی اس وقت تک محدود رہتا ہے جب تک دوسری زبان میں ان کا ترجمہ نہ کیا جائے، ترجمے کے ذریعے علوم فنون کے دروازے سارے انسانوں کے لیے کھل جاتے ہیں۔مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں دنیا کے مختلف مما لک اور مختلف زبانوں مثلاً یونانی، سریانی، سنسکرت اور فارسی وغیرہ میں موجود علوم وفنون کو عربی زبان میں منتقل کیا، اپنی مادری زبان میں منتقلی کے بعد عربوں میں نہایت ہی بلند پایہ مفکرین اور سائنسداں پیدا ہوئے۔ اہل یورپ نے بھی عربوں کی علمی و سائنسی ترقی سے بھر پور فائدہ اٹھایا۔ راجر بیکن نے بغداد اور اسپین میں موجود سائنسی سرمایہ کو یورپ کے دیگر مقامات تک منتقل کیا اور سائنسی میدانوں میں مسلمانوں کی جانب سے پروان دی گئی تجربی فکر کو یورپی سائنس کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ترجمے کے ذریعے سرمایۂ علم ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے۔ تجربات کے باہمی لین دین کے نتیجے میں زبانیں جدید علوم وفنون سے مالا مال ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کی تحقیقات، ایجادات اور اختراعات سے واقفیت حاصل کرتی ہین۔ ترجمہ ہی وہ اہم ترین ذریعہ ہے جس کی مدد سے قوموں میں علمی چیلنجوں کو قبول کرنے کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے اور سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں مسابقتی ماحول کو فروغ دیا جاسکتا ہے جو بنی نوع انساں کے ارتقاء کے لیے نہایت ضروری ہے۔

بیسوی اور اکیسویں صدی میں سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں اتنی زبردست ترقی ہوئی ہے کہ پوری دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے؛ لیکن اس ترقی کا محور ومرکز دنیا کا مخصوص علاقہ ہے۔ اگر موجودہ ترقی سے متعلق بھرپور معلومات اور فہم وبصیرت حاصل کرنی ہے، اسے عام کرنا ہے اور ساری دنیا میں موجود انسانی صلاحیتوں کو علمی چیلنج سے مقابلے کے لیے تیار کرنا ہے تو نہایت ضروری ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں ہورہی ترقیات کو دیگر زبانوں میں منتقل کیا جائے، اگر سائنس وٹکنالوجی کے مواد کو دیگر زبانوں میں منتقل نہیں کیا جاتا رہا تو معلومات محدود دائرے میں ہی رہی گی، مثال کے طور پر کمپیوٹر کی زبان انگریزی ہے تو جو شخص انگریزی سے ناواقف ہوگا وہ اس کے استعمال سے معذور ہوگا، اس کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ شخص کمپیوٹر سے استفادے کے لیے انگریزی زبان سیکھے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کمپیوٹر کو اس کی زبان میں پیش کیا جائے، ظاہر ہے کہ دوسری صورت زیادہ فائدہ منداور قابل عمل ہے۔ اگر کوئی شخص انٹرنیٹ کی ویب گاہوں کی زبان سے واقف ہو تو اس کے لیے معلومات کا حصول نہ صرف یہ کہ آسان ہوگا بلکہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکے گا۔ جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے تو یہ بات مسلم ہے کہ انسان اپنی مادری زبان میں زیادہ آسانی سے باتوں کو سمجھتا ہے۔ لہذا اگر یہ علوم کسی مخصوص زبان کی میراث ہونے کے بجائے دیگر زبانوں میں بھی موجود ہوں تو ان سے استفادہ کرنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور جب وہ بھی ان علوم سے واقف ہوجائیں گے تو اس میں مزید تحقیقات وانکشافات ہوں گے، صلاحیتوں کا اشتراک بڑھے گا، علمی و سائنسی موضوعات پر کتابوں کی تیاری کے لیے ترقی پذیر قوموں کے افراد کو زبردست تحریک ملے گی۔ اس کے ذریعے علمی آگہی اور سائنسی بصیرت پروان چڑھے گی اور پژمردہ زبانوں میں حرارت پیدا ہوگی۔

ترقی یافتہ مما لک میں ترجمے کی سرگرمیاں پورے زوروشور کے ساتھ جاری ہیں،

یورپ اور امریکہ میں سائنس وٹکنالوجی کی بے انتہا ترقی کے باوجود دوسری زبانوں کے علوم و فنون خاص طور سے سائنس وٹکنالوجی کی ترقیات کو وہ اپنی زبانوں میں مستقل منتقل کر رہے ہیں۔ یورپ میں نہ صرف بڑے بڑے دارالترجمے قائم ہیں بلکہ ترقی یافتہ قوموں نے مشینی ترجمے کی موثر اور زودکار تکنیک کا بھرپور استعمال شروع کر دیا ہے۔ آج انٹرنیٹ پر کئی ایسی ویب گاہیں موجود ہیں جو خودترجمے کی مفت سہولت فراہم کر رہی ہیں، جن میں سب سے پہلا نام گوگل ٹرانسلیشن کا ہے۔ ترقی پذیر ممالک ان جدید ٹکنیکوں کا استعمال کر کے جدید علوم وفنون سے نہ صرف مالا مال ہو سکتے ہیں بلکہ س میدان میں انسانیت کو درپیش مسائل سے مقابلہ کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

علمی و سائنسی دریافتوں سے واقف ہونے کے بعد ہی کوئی قوم ان سے استفادہ کر سکتی ہے۔ بنی نوع انساں کو ان دریافتوں سے فیض پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف افراد مادی زبانوں میں سائنسی دریافتوں سے متعلق معلومات کو منتقل کریں۔ سائنسی ترقیات نے انسانیت کے لیے بعض قسم کے خطرات بھی پیدا کر دیے ہیں اور مختلف ممالک کے درمیان اس سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، ترجمے سے مختلف اقوام کے درمیان افہام وتفہیم کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو زبان میں سائنسی تراجم کی سخت ضرورت ہے۔ اگر سائنسی سرمایۂ علم بروقت منتقل نہیں کیا گیا تو ہم عالمی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے نظری سائنس اور اس کے مسائل کو اردو میں منتقل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ آج زمانہ نظری سائنس سے آگے بڑھ کر اطلاقی سائنس کے دائرے میں داخل ہو چکا ہے۔ نئی نئی دریافتوں کے باعث اصطلاحات کا ڈھیر لگتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں وقت کی ضرورت ہے کہ سائنسی علوم کو اردو زبان میں تیز رفتاری سے منتقلی کے لیے مناسب، موثر اور بروقت اقدامات کیے جائیں۔

محمد عابد۔ ریسرچ اسکالر: شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

احمد عبدالغفور عطار کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات

احمد عبدالغفور عطار اپنے دور کی ذہین ترین، حساس ترین اور متضاد ترین شخصیت کے حامل رہے ہیں وہ ایک اعلیٰ پایہ کے مفکر، سماج کے بے نظیر مصلح، صاحب طرز انشاء پرداز، یگانۂ عصر صحافی اور ان سب سے بڑھ کر معراجِ انسانیت کے شاہکار تھے۔ ان کی بے پناہ قابلیت، علمیت، ذہانت و فطانت اور مطالعہ کی کثرت ان کے وہ علمی و ادبی شاہکار ہیں جن کی شہرت عام اور بقائے دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکی ہے۔ احمد عبدالغفور عطار نے ہماری سیاسی، فکری، عملی، ادبی اور تعلیمی بقاء و استحکام کے لئے نہ صرف جد و جہد کی بلکہ ہمہ عمر مصروف عمل بھی رہے ان کی عبقری شخصیت کی جامعیت اور عظمت کا اعتراف ہر دور میں ہر طبقے کے مفکرین کی طرف سے کیا جا رہا ہے نیز ان کی تصنیفات ہر صاحب بصیرت کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی رہی ہیں۔ احمد عبدالغفور عطار ایک رنگا رنگ اور بوقلموں شخصیت کے مالک تھے اور جب کسی انسان کی شخصیت میں بوقلمونی اور رنگا رنگی ہو تو پھر اس کے کسی ایک رنگ کا صحیح مقام و مرتبہ کا تعین کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ ایک رنگ دوسرے رنگ پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ضرور ہوتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں احمد عبدالغفور عطار کی قد آور شخصیت اور ان کے ہمہ علمی و ادبی آثار کا پورا تعارف پیش کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ اس تحریر کا مقصد آپ کی شخصیت کی صرف چند جھلکیاں پیش کرنا ہے۔

احمد عبدالغفور عطار نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی وہ بہت ادیبانہ ماحول تھا خود ان کے والد ماجد مذہب حنفی کے معتمد فقیہ تھے اور اپنے عہد کے ایک بلند پایہ عالم تصور کئے جاتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ عطار اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرے والد ماجد اہل علم وفضل میں سے تھے اور انھیں لغت قرآن پر مکمل عبور حاصل تھا، چنانچہ میری پرورش اور نشو نما عربی زبان کی محبت پر کی اور مجھے اس میں ماہر بنا دیا اور پھر مجھے قرآن حفظ کروا کر اس کا اظہار کروایا''۔[۱]

عطار اپنے مطالعہ کی کثرت کے سبب بہت مشہور ہوئے اور اسی بنا پر ان کے علمی وادبی ذوق کو جلا ملی۔ مطالعہ کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ ہو:

''مطالعہ لازمی جز ہے جس طرح کھانا اور پینا، اور جب انسان کے نزدیک مطالعہ ایک ضرورت بن جائے گا تو وہ بذات خود عظیم ہو جائے گا۔۔۔''[۲]

اوپر جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ عطار ایک رنگا رنگ اور بوقلمون شخصیت کے مالک تھے، یہ ایک مسلم حقیقت ہے کیوں کہ انھوں نے ہمیں علوم کے ذخائر فراہم کئے ہیں اور ہر ایک موضوع چاہے وہ فقہ اللغہ ہو یا علم اللغہ، لغت ہو یا لغت کی تاریخ اور اس کے لکھنے کا طریقۂ کار ہو، نحو یا اصول النحو، صرف یا اصول الصرف یا نحوی قواعد کی تشریح ہو ہر ایک موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ مزید برآں عربی زبان کی حفاظت اور اس کو ترقی دینے، عامیہ زبان کی تاریخ اور اس کے پھیلنے کے اسباب اور قرآن کی لغت کے علاوہ بے شمار ایسی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو اسلام کا دفاع کرتی ہیں اور ہمارے عقائد کو مضبوط کرتی ہیں۔

عطار نے عملی زندگی کا آغاز اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی کر دیا تھا جب انھوں نے ''الشباب الناھض'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، بعد ازاں وہ صحافت کے میدان میں اپنے قدم کو آگے بڑھاتے رہے اور مصر کے اندر دو رسالوں ''البلاغ اور السیاسہ'' کے نکالنے کا کام بخوبی انجام دیتے رہے۔ پھر مصر سے لوٹ آئے اور مکہ آکر یہاں سے ۲۸ رمئی ۱۹۶۰ء طائف شہر میں روز نامہ عکاظ کا اجراء احمد عبد الغفور عطار نے بدست خود کیا، جو آپ کی ادبی، علمی اور شاہکار تحریروں کا اصل میدان بن گیا اور تا عمر آپ کا قلم پوری برق رفتاری کے ساتھ علم وتحقیق اور شعر وادب کے موتی بکھیرتا رہا نیز قومی، ملی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی حالات کا تجزیہ پیش کرتا رہا اور باذوق قارئین کی تسکین کا سامان بنا رہا۔ جس میں آپ

نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور بعد میں اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ روزنامہ بہت مقبول ہوا اور آج بھی بدستور جاری ہے۔ اس طرح صحافت عطار کی رگ و پے میں رچ بس گئی تھی جس نے انھیں ایک عظیم صحافی بنا دیا۔

عطار کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس میں لوگوں کی اکثریت تعلیم نسواں کے خلاف تھی۔ لوگوں کا ماننا تھا کہ مکمل حجاب کے ساتھ عورتوں کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے بنیادی دینی تعلیم کے سوا اعلیٰ تعلیم کا تصور بھی لوگوں کے خیال میں نہیں آتا تھا۔ چنانچہ عطار نے لوگوں کو خواب غفلت سے جگایا اور اپنی کتاب ''الحجاب والسفور'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

''مکہ اور مدینہ طلوع اسلام سے ہی عورتوں کی تعلیم میں سب سے آگے تھے جہاں پر عورتوں کی تعلیم اور دینی امور کے لئے چھوٹے چھوٹے مکتب قائم تھے یہاں تک کہ جب شیخ عمر بن جبار نے ایک عصری اسکول کی بنا ڈالی تو ہم لوگ وہ پہلے اشخاص ہیں جنھوں نے اپنی بیٹیوں کا داخلہ اس اسکول میں کروایا تھا۔

باوجود اس کے کہ ہماری بیٹیاں فقط نو سال کی تھیں وہ لمبے کپڑے پہنتی تھیں اس طریقہ پر کہ چہرے کے سوا کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اور جو بارہ سال کی ہوتی تھیں وہ مکمل حجاب کے ساتھ رہتی تھیں اس طریقہ پر کہ چہرہ کا بھی حجاب ہوتا تھا۔

اور سعودیہ عربیہ کے اندر لڑکیوں کی تعلیم اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ حجاب عورتوں کی تعلیم کے لئے مانع نہیں ہے، چنانچہ ہمارا شہر ہزاروں ایسی عورتوں سے بھرا پڑا ہے جنھوں نے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جنھوں نے ڈاکٹریٹ کیا ہوا ہے''[۳۱]

عطار تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے اور اس کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم کا وافر حصہ عطا کیا تھا جس کی بنا پر آپ نے تعلیم نسواں کے مخالفین کا بہترین اسلوب اور عمدہ دلائل و براہین کے ساتھ جواب دیا نیز ان لوگوں کی زبانیں بند کر دیں جن کا دعویٰ تھا کہ مکمل حجاب کے ساتھ تعلیم کا حصول ممکن نہیں ہے۔ مخالفین کا

اعتراف تھا کہ پردہ عورتوں کی آزادی کے لئے ایک رکاوٹ ہے جیسا کہ عورت کا گھر کے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنا اور ملازمت کرنا وغیرہ۔ جب کہ بے پردگی عورتوں کی انھیں ان امور پر مدد کرتی ہے۔

عطار نے اس کا جواب دیا کہ جو لوگ بے پردگی کے قائل ہیں ان کا دعوی حقیقت کے برعکس ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عورتیں تعلیم اور سوسائٹی میں نمایاں کردار ادا کرنے میں مردوں سے پیچھے نہیں رہی تھیں، اور نہ ہی حجاب ان کے لئے مانع تھا بلکہ حجاب ان کی تعظیم و تکریم کا سبب تھا۔ چنانچہ عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام سرفہرست رہے گا جنھیں علمی میدان میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انھیں قرآن کریم کی پہلی حافظہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ بلند پایہ محدثہ تھیں، اور ہزاروں صحابہ کرامؓ کی استاد بھی تھیں۔

اگر ہم یہ کہیں کہ احمد عبدالغفور عطار دور جدید کے سب سے بڑے اسلامی مصلح ہیں تو بے جا نہ ہوگا، کیوں کہ انھیں اسلامی تعلیمات میں بڑی بصیرت اور وسعت نظری حاصل تھی۔ عطار مختلف الجہات صفات کے مالک تھے ان کی چند کتابوں کا تذکرہ بطور نمونہ پیش خدمت ہے، انھوں نے لغت میں الصحاح و مدارس المعجمات العربیہ، الفصحی والعامیہ، آراء فی اللغہ، الزحف علی لغۃ القرآن وغیرہ، اور ادب میں کتابی، الھوی والشباب، اریدان اری اللہ، قطرۃ من یراع وغیرہ، اور تاریخ و تراجم میں محمد بن عبدالوہاب، صقر الجزیرہ، عشرون یوما فی الصین الوطنیہ، ابن سعود وقضیۃ فلسطین وغیرہ، اور اسلامیات میں الشریعۃ لا قانون، الاسلام طریقنا الی الحیاۃ، الاسلام خاتم الادیان، انسانیۃ الاسلام، الحجاب والسفور وغیرہ، اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھیں ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا قدر دشوار معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عطار کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات کا اعتراف اس زمانے کی عظیم شخصیات کو بھی تھا چنانچہ استاد ابراہیم ہاشم الفلالی عطار کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا شمار حجازی ادباء میں ہوتا ہے جب کوئی موجودہ حجازی ادب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو عربی ادب کی ترقی اور نشو نما میں عطار کو مؤثر پاتا ہے۔ بلکہ بے

مثال ادیب ہیں جنھوں نے خود کو عربی ادب کے لئے وقف کردیا اور اس کے لئے سب سے بڑا ابوجھ اٹھایا، حجازی ادب کی ایسی آواز بلند کی جو عرب کو ہر جگہ سنائی دی، چنانچہ وہ سمجھتے ہیں کہ حجاز میں ایک ایسا ادب ہے جس کا جھنڈا عطار کے ہاتھ میں ہے اسی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں اور اس کو پھیلا رہے ہیں۔'' ۴

استاد صالح محمد جمال عطار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ادبی میدان میں عطار کی کاوشوں اور عرب میں ان کی ادبی تحریک سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے تلامذہ کی تعداد سو سے زیادہ ہے، ان کی تمام مؤلفات میں بہت سے ادبی اور اسلامی مسائل کا حل ہے، اور انھوں نے منفی افکار و خیالات سے جنگ کی ہے'' ۵

ڈاکٹر صاح وشمی کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''استاد احمد عبدالغفور عطار سعودی ادب کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔۔۔'' ۶

احمد عبدالغفور عطار کے ہم عصر علماء و ادباء میں سے چند شخصیات کے اقوال یہاں پیش کرنے کا مقصد صرف اس بات سے باور کرانا تھا کہ ان کی علمی، تعلیمی اور ادبی خدمات کا اعتراف انھیں بخوبی تھا اور اس کا اظہار بھی انھوں نے اپنے اپنے الفاظ کے ذریعہ بحسن وخوبی کیا۔

منابع وماخذ

۱۔ احمد عبدالغفور عطار لغویاً: زہیر محمد جمیل کتبی، ص:۲،

۲۔ کلام فی الادب: احمد عبدالغفور عطار، ص۳۰،

۳۔ الحجاب والسفور: احمد عبدالغفور عطار، ص:۷ اور ۸،

۴۔ مقدمہ ابراہیم الفلالی، کتاب (الامیر منصور وزیر دفاع المملکۃ العربیۃ السعودیۃ) للعطار، ص:۴

۵۔ مجلّہ فیصل، عدد ۱۷۳، شوال ۱۴۱۱ھ، شمارہ اپریل/مئی، ۱۹۹۱ء، ملف خاص عن احمد عبدالغفور عطار منجانب اسامہ الفی، ص:۳۳

۶۔ مجلّہ فیصل، عدد ۱۷۳، شوال ۱۴۱۱ھ، شمارہ اپریل/مئی، ۱۹۹۱ء، ملف خاص عن احمد عبدالغفور عطار منجانب اسامہ الفی، ص۳۴،

محمد عدنان ۔(ریسرچ اسکالر،شعبہ ترجمہ) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،حیدرآباد

علوم کے فروغ اوراس کی ترویج واشاعت میں ترجمے کا کردار

ترجمہ دراصل جستجوئے علم کی تسکین کاایک وسیلہ ہےاوراس کے ذریعہ علم کے مختلف چشموں تک انسانوں کی رسائی ہوتی ہے۔اسلام نے مسلمانوں کے اندرعلم کی جوجستجو پیدا کی تھی وہی جستجوانہیں ترجمے کےعمل تک لےگئی اوران تراجم نے ان کے اندرایک مکمل علمی انقلاب کاآغازکیا۔

اسلام نے تحصیل علوم کو ایک تحریک کے طور پر اپنے متبعین پرلازم قراردیا، یہاں تک کہ سب سے پہلی آیت جوغارِحراء میں جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں قرأت،علم ،قلم کوبطورخاص ذکرفرمایاہے،بلکہ پڑھنے کوامرکوصیغہ''اِقرأ''(پڑھو) کے ذریعہ واجب کردیا۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق- خلق الانسان من علق- اقرأ وربك الاکرم- الذی علم بالقلم- علم الانسان مالم یعلم (سورہ علق:۵۔۱)

پڑھو(اے نبیؐ)اپنے رب کے نام کے ساتھ،جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔پڑھو،اورتمہارارب بڑا کریم ہے،جس نےقلم کے ذریعہ علم سکھایا،انسان کووہ علم دیاجسے وہ نہ جانتاتھا۔(تفہیم القرآن،جلدششم)

اس کے ساتھ ساتھ پیغمبرؐ نے حصولِ علم پرخاصی توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔اس میں دینی ودنیوی،قرآنی اورعصری تمام علوم شامل ہیں۔''اَثرالاسلام علی الثقافۃ الاسلامیہ'' کے مصنف محمودعلی شرقاوی رقم طراز ہیں:

’’یہاں علم سے مرادصرف حرام وحلال یعنی احکام شرعیہ کا علم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان تمام چیزوں سے واقفیت ہے ،جن کے ذریعہ انسان اپنے ان فرائض اورذمہ داریوں کو کماحقہ پورا کرسکے،جس کے لئے اسے زمین پرخلیفہ بنایا گیا ہے،یعنی زمین کی تعمیر،اس کے خزانوں کی دریافت اوراس میں چھپے ہوئے اسرارورموز کا انکشاف۔1

اس میں وہ علم بھی شامل ہیں ،جونباتات اور پیڑپودوں کی ترقی اورنشوونما میں مددگار ہواورزمین کی بہتر پیداوار،نیز اس کی زرخیزی میں معاونت کرے۔قرآن اس علم کی طرف بھی دعوت دیتا ہے ،جس کے ذریعہ حیوانات اور جانوروں کی بہتری ہوسکے، انہیں انسان کی خدمت کے لئے مسخر کیا جاسکے،اس میں اس علم کا حصول بھی ضروری ہے جس کے ذریعہ جائز طریقوں سے کسب معاش اور دولت کا حصول ممکن ہو۔

اس کے پیشِ نظر مسلمانوں نے علوم دینیہ پر پہلے توجہ دی، خاص کر عہدِ رسول اورعصر صحابہ میں قرآنی ودینی علوم کی تحصیل وترویج پرزوررہا،اس کے بعد اموی دور میں دیگر فنون پر توجہ مبذول ہوئی ،اورعباسی خلافت اوراندلس میں مسلمانوں کی حکومت سے ہمہ گیر پیمانہ پرعلوم وفنون کی تحصیل وترویج اورتحقیق وتجیث کا کام شروع ہوا،مسلمانوں نے مکاتب ،مدارس، جامعات،تحقیقاتی مراکز،تراجم کے ادارے قائم کیے،اداروں اورمدارس سے نابغہ روزگارعلماء،فضلاء،محققین،مؤرخین اورسائنسداں تیار ہوکر نکلے اوریہ مدارس ومکاتب برابر تعلیمی وتربیتی کردارادا کرتے رہے اورآج بھی ان کا اپنا کام جاری ہے۔

پیش نظر مقالے میں اس بات کوسامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علوم وفنون کے میدان میں وہ کون سے عوامل کارفرما تھے جن کی بدولت یہ دنیا مختلف علوم کے بیش بہاوبیش قیمت دریاؤں سے سیراب ہوئی،اس میں مختلف اقوام نے ایک دوسرے کے علوم وفنون سے اپنی قوم کے افراد کوآگاہ کیا۔ان تمام میں ترجمہ ہی وہ ذریعہ تھا جس نے مذکورہ بالا امور میں اپنا کلیدی رول ادا کیا۔چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں ہونے والی بیش بہا ترقی اورعلوم وفنون کے ارتقاء میں ترجمہ نے جس قدر مؤثر کارنامہ انجام دیا،تاریخ نے اسے سنہرے حروف میں محفوظ کررکھا ہے اوراسی کے باعث اس دورکوسنہرے دور سے موسوم کیا جاتا ہے ۔اس دور میں

عربی زبان کوایک خاص مقام حاصل رہا ہے جس نے اپنے اندر قدیم علوم کو اس قدر محفوظ رکھا ،شاید اس سے پہلے کسی اور زبان میں انجام دیا گیا ہو۔عربی کے حوالے سے عباسی دور (جو تقریباً پانچ سو سال) کو یہ خاص مقام حاصل رہا ہے کہ بیش قیمت علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل کرکے اسے اتنا ثروت مند بنادیا کہ دوسری زبانیں اس کے سامنے ہیچ نظر آنے لگیں۔

علم کی پیاس کو بجھانے اور نئے نئے علم ومعارف تک رسائی کے لئے مختلف زبانوں کی کتب کا حصول اور انہیں اپنی زبان میں منتقل کرنے کا کام ضروری تھا۔چنانچہ اہل اسلام نے ایک طرف کتب خانے بنائے اور دوسری طرف مراکز تراجم قائم کئے۔

محمود شرقاوی نے لکھا ہے:

''قاہرہ،بغداد،غرناطہ میں بہت عظیم الشان کتب خانے ،لائبریریاں تھیں۔جن میں ہزاروں نادرونایاب کتابیں ہوا کرتی تھی اور علمی مجالس قائم ہوتی تھیں۔ترجمہ،تحقیق وتصنیف کا کام اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا۔عام مطالعہ کے لئے بڑے بڑے ہال بنائے گئے تھے۔بیت الحکمۃ جیسے علمی مراکز میں ہزاروں علماء تحقیق میں مصروف رہتے تھے ،جن کی سرپرستی خلیفہ کرتے تھے،دوسری زبانوں کے اہم کتابوں کے تراجم ہوتے تھے۔مامون رشید نے قیصر روم کے پاس سے منطق ،فلسفہ کی اہم کتابوں کو منگوا کر ان کا ترجمہ کرایا اور عربی زبان میں منتقل کرایا''۔2

اندلس کے فرماں روا حکم بن ناصر نے قرطبہ میں اپنے محل کے اندر ایک عظیم الشان کتب خانہ بنایا تھا،جس میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں۔''اعلام العرب فی الکیمیا'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

''خالد بن ولید بن معاویہ نے سب سے پہلے یونانی علوم کو عربی زبان میں منتقل کرایا،اس سلسلہ میں ان کو اولیت حاصل ہے۔''3

ابتداء میں یونانی ،سریانی اور فارسی کتابوں کے عربی تراجم بہت گنجلک ہوا کرتے تھے۔خالص لفظی تراجم کا التزام تھا،مگر آٹھویں صدی ہجری میں حنین بن اسحٰق نے سلیس اور بامحاورہ عربی میں ترجمہ شروع کیا۔انہوں نے عربی زبان میں مہارت خلیل بن

احمد فراہیدی کے شاگردوں سے حاصل کی تھی۔ روم کا سفر کر کے وہاں یونانی زبان پر قدرت حاصل کی، اور ترجمے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا، بعد ازاں فصیح و بلیغ رواں اور دل کش تراجم کا رواج عام ہوتا گیا۔ عباسی خلفاء کے دربار میں حنین بن اسحٰق کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مامون رشید ان کے تراجم کو بہت عزیز رکھتا تھا اور سبھی مترجمین کو کتاب کے وزن کے بقدر چاندی اور سونا دیتا تھا۔ یہی وہ علماء و ماہرین تھے جنہوں نے نایاب امور میں اپنی کارکردگی دکھلائی۔

یہی مسلم علماء تھے کہ جنہوں نے حکمتِ یونان کے احیاء کے لئے شب و روز جگر سوزی سے کام نہ کیا ہوتا تو حکمائے یونان سے آج کی دنیا واقف نہ ہوتی۔ اُس وقت ہزاروں ایسی درس گاہیں قائم تھیں، جہاں ہر وقت طلباء کی بھیڑ رہتی تھی۔ ول ڈیوران لکھتا ہے:

''جغرافیہ دانوں، مؤرخوں، منجموں، فقیہوں، محدثوں، طبیبوں اور حکیموں کے ہجوم سے سڑکوں پر چلنا دشوار تھا۔4

جہاں بھی مسلمانوں کی چھوٹی سے چھوٹی آبادی ہوتی، وہاں ایک مسجد کا ہونا ناگزیر ہوتا۔ مسجد صرف عبادت گاہ ہی نہ ہوتی بلکہ اس کے ساتھ وہ درس گاہ بھی ہوتی تھی۔ دنیائے اسلام میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں چھوٹی بڑی تمام مساجد، مدارس کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں جہاں محلے اور بستی کے بچے اور بچیاں تحصیل علم کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ مساجد کے علاوہ ہر بڑے شہر میں بڑے بڑے دارالعلوم اور جامعات تھیں۔ بغداد میں شہرۂ آفاق جامعہ نظامیہ کے علاوہ تیس دیگر بڑے بڑے کالج تھے۔ جن میں ہزار طلباء بیک وقت تعلیم پاتے تھے۔ مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ:

''دارالعلوم نظامیہ پورا ایک شہر تھا۔ لاتعداد کمرے ایک وسیع ہال جس میں دس ہزار افراد سما سکتے تھے، یہاں قرآن و حدیث، فقہ، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم کی تدریس کا مکمل انتظام تھا۔ ایک شعبہ اجنبی زبانوں (غیر ملکی زبانوں) کا تھا، جہاں یونانی، عبرانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی وغیرہ پڑھائی جاتی تھی۔5

ماہرین کہتے ہے کہ جب کوئی ترقی پذیر یا ابھرتی قوم کسی علم کو اپنے ہاتھ میں لیتی

ہے ،تواس کی مدد سے کون کون سی چیزوں کو ایجاد کردیتی ہے ،اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔عربوں نے یونانی فلسفہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ایسی نقش ونگاری کی کہ چشم عالم اسے دیکھ کر خیرہ خیرہ ہوگئی ،اوراسے اتنا آگے بڑھایا کہ ایک مربوط فن بن گیا۔اس چیز کے پیش نظر کسی ماہر نے کہا ہے کہ اگر عربوں نے اس فن کے تئیں اپنی اس دوراندیشی سے کام نہ لیا ہوتا تو شاید یہ فن اپنی کمر توڑ چکا ہوتا۔

ایک یورپی ماہر گستاوَلیبان(Gustave le Bon)عربوں کے یورپ پر تہذیبی اثرات کے تئیں یوں رقم طراز ہے:

’’اسلامی تہذیب نے دنیا پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ یہ مسلمانوں کے ثقافتی اثرات کا ہی نتیجہ تھا کہ یورپ کے سامنے سائنسی ،ادبی اورفلسفیانہ علوم وفنون کے دروازے کھلے چنانچہ تقریباً چھ صدیوں تک علمی طور پروہ ہمارے محسن بھی رہے اور قائد بھی‘‘۔6

عربوں (بالخصوص مسلمانوں) کا قدم اس طرف نہ بڑھتا تو یونان ،مصر ،ہندوفارس کے تمام علمی ذخیرے برباد ہو چکے ہوتے ۔انہوں نے مختلف علوم طب ، کیمیا ، فلسفہ ، ہیئت ، ریاضی جیسے علوم کی طرف توجہ دی ، پہلے پہل طبی علوم کی شروعات ہوئی ،آگے چل کر بنی عباس کے زمانے میں باقاعدہ تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا،اس کے بعد یکے بعد دیگر خلفاء کے زمانے میں اس کام میں مزید تقویت آتی گئی اورمختلف قوموں کے علمی سرمائے کو ترجمہ کے ذریعہ عربی زبان میں منتقل کردیا گیا،اس طرح ہر قوم کے علمی سرمائے وذخیرے کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ان کی پانچ سوسالہ دورحکومت میں ہمہ گیر ترقی کافی پروان چڑھ گئی جس کی بنیاد نویں اوردسویں صدی میں قدیم علوم وفنون کے احیاء پر تھی جسے مشرق کا نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے۔

زمانہ گذرتا رہا اور ترقیوں کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا،قومیں علوم سے سیراب ہوتی رہیں اور ترقی کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتی رہیں۔ان تمام چیزوں میں ترجمہ ہی وہ کارگر ذریعہ ثابت ہوا جس نے علوم کے میدان میں بیش بہا ترقیات کے دہانے کھول دیے۔الغرض علوم وفنون کے فروغ اوراس کی ترویج واشاعت میں جس چیز نے نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ ترجمہ ہی ہے۔

مختصراً یہ کہ علوم وفنون کی سمت میں علمی سرگرمیوں، بالخصوص ترجموں کے باعث جو ترقیات وجود میں آئیں اور اس کے باعث جس نشأۃ الثانیہ کا وجود ہوا، اس نے علمی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ یورپ نے اپنی کوششوں اور جانفشانیوں سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آج بھی ہر علم سے شغف رکھنے والا اس کا اقرار کرتا ہے۔

اردو زبان کی اگر بات کی جائے تو جس طرح دوسری زبانوں نے ترجمہ کے ذریعہ ترقیات کی راہوں کو طے کیا، اسی طرح اردو زبان کو ترجمے سے کافی مدد ملی۔ اس کو ایک ترقی یافتہ زبان بنانے، قومی سطح پر مقبولیت بخشنے اور ملکی زبانوں میں درجہ دلانے میں جہاں دوسرے عوامل کا دخل رہا ہے، وہیں انگریزی، عربی اور فارسی وغیرہ زبانوں سے مختلف علوم وفنون کے تراجم نے اس میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ایسے ہی تراجم نے اردو زبان کے لئے ترقی کے دروازے وا کیے ہیں اور ان کے وسیلے سے تازہ افکار ونظریات بالخصوص آزادی، ترقی پسندی، روشن خیالی اور تحقیقی وسائنسی طرز فکر کے جو خوشگوار جھونکے آئے، اُن سے اردو زبان میں توانائی اور تازگی کی لہر پیدا ہوئی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اردو کو باقاعدہ ایک زبان کا درجہ دلانے میں تراجم کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے اس ضمن میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کی بدولت اردو زبان نے بولی سے زبان تک کا سفر بہ آسانی طے کیا۔ اس لیے مزید اس کی ترقی کے لئے ترجمہ کی جانب توجہ دینی ہوگی تا کہ اردو زبان آگے بڑھ سکے اور علوم وفنون کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو سکے۔

حوالہ جات:

1۔ عالمی تہذیب وثقافت پر اسلام کے اثرات، ص۔13

2۔ ایضاً، ص25

3۔ اعلام العرب فی الکمیاء، ص17

4۔ ایچ آف فیتھ (Each of Faith) ص337، مشمولہ: قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

5۔ حالاتِ سعدی، ص67

6۔ عالمی تہذیب وثقافت پر اسلام کے اثرات، ص۔138

محمد فیروز خان ۔ایم۔فل ریسرچ اسکالر، مانو حیدرآباد

سرسید احمد خاں کا نظریۂ تعلیم اور اس کی عصری معنویت

دولت علم سے بہرہ مند ہونا ہر مرد وزن کے لیے لازمی امر ہے۔ترقی صرف اس قوم کی میراث ہے جس کے افراد زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہوں۔علم کے بغیر انسان خدا کو بھی پہچاننے سے قاصر ہے۔کسی بھی عمل کے لیے علم ضروری ہے کیوں کہ جب علم نہ ہوگا تو اس پر عمل کیسے ہوگا۔دنیا میں کوئی بھی چیز بانٹنے سے گھٹتی ہے لیکن علم ایک ایسی دولت ہے جو بانٹنے سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے۔انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ بھی تعلیم کی وجہ سے میسر ہوا ہے۔تعلیم حاصل کرنا ہر مذہب کے لیے جائز ہے لیکن اسلام میں تعلیم حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے۔آج کے اس پر آشوب اور برق رفتار دور میں تعلیم کی ضرورت انتہائی اہمیت کی حامل ہے، چاہے زمانہ کتنا ہی ترقی کر لے وہ تعلیم کی اہمیت کو ماند نہیں دے سکتا۔تعلیم کا اولین مقصد ہمیشہ انسان کی ذہنی، جسمانی اور روحانی نشونما کرنا ہے تعلیم کے حصول کے لیے قابل اساتذہ بھی بے حد ضروری ہیں جو بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مدد فراہم کرتے ہیں استاد وہ نہیں جو محض چار کتابیں پڑھا کر اور کچھ کلاسز لے کر اپنے فرائض سے مبرا ہو جائے بلکہ استاد وہ ہے جو طلبہ و طالبات کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا اور انہیں شعور وادراک، علم وآگہی نیز فکر ونظر کی دولت سے اپنے شاگرد کو مالا مال کرتا ہے۔جن اساتذہ نے اپنی اس ذمہ داری کو بہتر طریقے سے پورا کیا، ان کے شاگرد آخری سانس تک ان کے احسان مند رہتے ہیں۔

ہندوستان میں تعلیم، زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بہت بڑے بڑے ادارے قائم تھے جہاں معیاری تعلیم دی جاتی تھی۔اگر چہ ہر زمانے میں ایک ایسی ہستی عالمِ روح میں جنم لیتی ہے جو اپنے کارناموں اور فکر ونظر سے سماج و معاشرے کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے۔ہندوستان میں بھی ہر عہد میں کچھ ایسی اعلیٰ اور باوقار ہستیاں منظر عام پر جلوہ گر ہوئیں جنھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے لوگوں کی سوچ

اور فکر کو بدل کے رکھ دیا انہی میں سے ایک نام سر سید احمد خاں کا بھی ہے۔ وہ 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ دستور زمانہ کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے حساب، طب اور تاریخ میں بھی مہارت حاصل کی۔ اور عدالتی امور سے بھی آگاہی حاصل کی جس کے نتیجہ میں 1837 میں آگرہ میں کمیشنر کے دفتر میں نائب منشی بنائے گئے۔ محنت اور ایمانداری سے ترقی کرتے ہوئے دہلی میں صدر امین مقرر ہوئے۔ جنگ آزادی کے دوران سر سید بجنور میں قیام پزیر تھے اس مشکل وقت میں انہوں نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں تھیں، یہ کام انہوں نے انسانی ہمدردی کے لیے کیا تھا۔ 1888 میں ان کے خدمات کے عوض میں سر کا خطاب دیا گیا۔

انہوں نے اگرچہ بے شمار خدمات انجام دی ہیں لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کا تعلیمی رجحان تھا۔ انہوں نے علم وحکمت کی ایسی قندیل جلائی جس سے تمام ملک اور بیرون ملک مستفید ہو رہے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سر سید کے حسین خوابوں کی تعبیر ہے اور قوم وملت کا قیمتی اثاثہ ہے۔ تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید نے قوم کی رہنمائی اور جدید علوم سے آراستہ کرنے کے لیے دینی اور عصری علوم میں توازن پیدا کیا اور ملت اسلامیہ کو ان سے متعارف کرانے کے لیے مدرستہ العلوم مسلمانان ہند قائم کیا جو پھل پھول کر الحمد اللہ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے اور پوری دنیا اس سے تعلیمی، معاشی، سیاسی، سماجی اور مذہبی تشنگی دور کر رہی ہے اور تا قیامت اس سے مستفید ہوتی رہے گی۔ سر سید کا ملک وقوم پر یہ احسان عظیم ہے اور ان کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ تعلیم ہی وہ شئے ہے جو نوع انسانیت کو فہم وفراست، عقل وشعور اور حکمت ودانائی کے جوہر سے مالا مال کرتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے جو قومیں، خاندان، سماج اور معاشرے تعلیمی زیورات سے مزین ہوتے ہیں وہ ہر دور میں کامیاب ترین اقوام کی فہرست میں شمار کئے جاتے ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں سر سید کا ایک ہی مشن تھا کہ علم کو اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ ان کو سچا خراج عقیدت بھی یہی ہے کہ قوم کا ہر فرد تعلیم وتربیت حاصل کر کے خود مستحکم ہو اور اپنی ملت کو بھی تقویت پہنچائے مگر افسوس آج سب سے

بنیادی خامی ہمارے درمیان تعلیم کا فقدان ہے اسی وجہ سے امت مسلمہ ہر محاض پر پسپا ہے۔سرسید نے قوم کو ذلت ورسوائی کے گہرے غار سے نکالنے کی پرزور سعی کی تھی۔ان کا نظریہ تعلیم ہر زمانے کے لیے اور ہر مسئلہ میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے دراصل سرسید احمد خاں کا شمار ایسی انقلاب آفریں شخصیت میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے فکر وعمل کے ذریعہ اپنی قوم کے فرسودہ خیالات اور جمود میں طغیانی پیدا کر دی،ان کا یہ کارنامہ صدیوں تک یاد کیا جائے گا۔ان کی دوررس نگاہوں نے شاہراہ زندگی پر مشعل کا کام انجام دیا۔

سرسید احمد خاں برصغیر میں مسلم نشاتِ ثانیہ کے بہت بڑے علمبردار تھے۔انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔وہ انیسویں صدی کے بہت بڑے مصلح اور رہبر تھے۔انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور انھیں با عزت قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی آپ ایک زبردست مفکر، بلند خیال مصنف اور جلیل القدر مصلح تھے۔سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔وہ توپوں سے اڑائے جاتے تھے،سولی پر لٹکائے جاتے تھے، کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔اُنکی جائدادیں ضبط کر لی گئیں تھیں۔نوکریوں کے دروازے اُن پر بند تھے اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح کی اگر جلد کوشش نہیں کی گئی تو مسلمان گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ اور نہ رہیں گے۔سرسید نے محسوس کرلیا تھا کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اُس وقت تک وہ بدستور ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔اُن کو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جد وجُہد کرتے رہے۔

سرسید کا نقطہ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں۔انہوں نے محض مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں

بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔انہوں نے سائنس,جدید ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا۔انہوں نے انگریزی کی تعلیم کو مسلمانوں کی کامیابی کے لیے زینہ قرار دیا تا کہ وہ ہندوؤں کے مساوی و معاشرتی درجہ حاصل کر سکیں۔1859ء میں سرسید نے مراد آباد اور 1862ء میں غازی پور میں مدرسے قائم کیے۔ان مدرسوں میں فارسی کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم پڑھانے کا بندوبست بھی کیا گیا۔

1875ء میں انہوں نے علی گڑھ میں ایک ہائی اسکول کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں ایم۔اے۔او کالج اور آپ کی وفات کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ اختیار کر گیا۔ان اداروں میں انہوں نے آرچ بولڈ آرنلڈ اور موریسن جیسے انگریز اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔1863ء میں غازی پور میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔اس ادارے کے قیام کا مقصد مغربی زبانوں میں لکھی گئیں کتب کے اردو تراجم کرانا تھا۔ بعد ازاں 1876ء میں سوسائٹی کے دفاتر علی گڑھ میں منتقل کر دیے گئے۔سرسید نے نئی نسل کو انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تا کہ وہ جدید مغربی علوم سے بہرہ ور ہو سکے۔یوں دیکھتے ہی دیکھتے مغربی ادب سائنس اور دیگر علوم کا بہت سا سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہو گیا۔ سوسائٹی کی خدمات کی بدولت اردو زبان کو بہت ترقی نصیب ہوئی۔1886ء میں سرسید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی۔مسلم قوم کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے افراد کی فراہمی میں اس ادارے نے بڑی مدد دی اور کانفرنس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر مختلف شخصیات نے اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی ثقافتی معاشی اور معاشرت حقوق کے تحفظ کے لیے بھی کوشاں رہی۔

سرسید کو سب سے زیادہ فکر یہی تھی کہ مسلمانوں کو کس طرح جدید علوم کی طرف راغب کیا جائے اور ان کی بھلائی کے لیے کون سے اقدامات اٹھائے جائیں۔اس سلسلے میں انہوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں جس میں بعض کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔بنارس میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا نام ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" منعقد ہو گئی اور اس کے سیکرٹری سرسید قرار پائے۔اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ ''وہ جہاں تک ہو سکے اس بات کے

دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالبِ علم کس لئے کم پڑھتے ہیں، علومِ قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علومِ جدیدہ ان میں کیوں نہیں رواج پاتے، اور جب یہ موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔'' انہوں نے جو بھی ادارے قائم کیے تھے اس کی ترقی کے لیے انہوں کئی سفر بھی کیے جس میں ہزار ہا روپیہ ان کا خرچ ہوا، لیکن انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

سرسید نے زیادہ زور جدید تعلیم پر دیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ جدید تعلیم کے بغیر مسلمانوں کا مستقبل بالکل تاریک ہے۔ سرسید کی دور بیں نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ زندگی نے جو رخ اختیار کر لیا ہے اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس میں رکاوٹ پیدا کر کے اس کی رفتار کو بھی روکا نہیں جا سکتا بلکہ ایسا کرنے والے خود تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لیے انہوں نے تمام تر توجہ جدید تعلیم کے فروغ پر مرکوز کر دی۔ سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد ہی اپنے ہم وطنوں کو جدید علوم سے روشناس کرانا تھا۔ اس سوسائٹی کے جلسوں میں جس میں نئے نئے سائنسی مضامین پر لیکچر ہوتے اور آلات کے ذریعہ تجربے بھی کیے جاتے، کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو بتایا جا سکے کہ بنا جدید علوم خاص طور پر سائنس کے میدان میں ترقی نہیں کی جا سکتی اور اسی لیے سائنٹفک سوسائٹی نے جن دو درجن کتابوں کا ترجمہ کرایا ان میں چند کو چھوڑ کر زیادہ تر ریاضی اور سائنس سے متعلق تھیں۔ سرسید احمد خاں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ یورپ جس راستے پر جا رہا ہے اور جو تعلیم حاصل کر رہا ہے وہی راستہ اور تعلیم مستقبل کی ترقی کی ضامن ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ درسگاہیں کیسی ہیں اور ان کا نظام تعلیم کیا ہے؟ اس لیے وہ خود انگلستان گئے، وہاں کے تعلیمی نظام کو دیکھا، تعلیمی اداروں میں رہے، اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ انگلستان کی ہر چیز نے ان کو متاثر کیا۔ انہوں نے کہا:

''میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں،

جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود، عیش وآرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں، جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرستہ العلوم قائم کیا جائے جس کی بنا پر آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی۔''

ان کے اس نقطۂ نظر سے اور ان کے نظریہ تعلیم کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگ ان کے خلاف بھی ہوئے اور ان کو کافر بھی کہا گیا لیکن انہوں نے اس چیز کی کبھی پرواہ نہیں کی اور وہ آگے بڑھتے رہے اور آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ علی گڑھ مسلم یونیورٹی کے روپ میں موجود ہے جو پوری دنیا کے لوگ اس سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ سرسید نے اپنی تحریک کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ ان کی نیک نیتی اور تعمیری سوچ کے پیش نظر بہت سے ہمدرد اور حامی و مددگار رفقاء اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ یہی نہیں سرسید کو ایسے رفقائے تحریک بھی ملے جن میں تخلیقی قوت کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اور جنھوں نے اپنی ذہانت سے ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو ملک وقوم کی پسماندگی دور کرنے اور تعمیری ترقی کی راہیں استوار کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہوا۔ علی گڑھ تحریک ایک سرگرم عمل تحریک تھی اور اس کا ایک نصب العین تعلیم وتربیت، فکر وشعور، قومی یکجہتی اور انسان دوستی تھا۔ اس لیے کچھ لوگوں کے لیے یہ تحریک کانٹا بن گئی۔ ایک بڑے حلقے نے اس کی موافقت کی تو ایک حلقے کی جانب سے شدید ردعمل بھی دیکھنے کو ملا۔ مخالفت کا یہ سلسلہ داخلی اور خارجی دونو ں سطحوں پر چلا۔ داخلی طور پر جو مخالفت کی گئی اس میں شائستگی اور تہذیب برقرار رہی لیکن خارجی سطح پر ہونے والی مخالفت میں متشدد رویہ اختیار کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، تعلیمی اور علمی نظریات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا سرسید نے اپنی دوررس نگاہوں سے مشاہدہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم وترقی حصول علم میں مضمر ہے انہوں نے ایک موقع پر کہا ہے:

''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال واسباب کے تلف ہونے کا کچھ رنج تھا، اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج

تھا۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اس خیال اور اس غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا۔''

بلا شبہ یہ ملک وقوم کا غم ہی تھا کہ سرسید 1857ء کے بعد انگریزی حکومت کے قریب ہوئے اور ان کے سیاسی تصورات میں قدرے تبدیلی واقع ہوئی لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ انگریزوں کی قربت کی وجہ سے سرسید کے تصورِ وطن، تصورِ قوم یا حب الوطنی میں کوئی کمی واقع ہوئی ہو۔ سچائی یہ ہے کہ انگریزوں سے دوستی کے پیچھے بھی قومی مفاد پوشیدہ تھے۔" اسبابِ بغاوتِ ہند" کے اوراق شواہد پیش کرتے ہیں کہ 1857ء کے بعد سرسید کے افکار ونظریات کے محور اور مرکز کیا تھے۔ سرسید نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اہلِ علم لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں انگریزوں کی سازشوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے جگہ بہ جگہ جلسوں سے بھی خطاب کیا اور لوگوں کو اپنی فکر سے آگاہ کیا۔ اکثر جلسوں میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں، ایک ہی گنگا جمنا کا پانی پیتے ہیں اور ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے ایک ہی خطہ یعنی ہندوستان میں جیتے اور مرتے ہیں پھر ہم دونوں کے درمیان یہ دوریاں کیوں کر ہیں؟ ہمارے درمیان نفرت کیوں ہے؟ سرسید کے اس طرح کے سوالوں نے ہندوستان کے دانشور طبقے کو سوچنے پر مجبور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی جماعت تیار ہوئی جو انگریزوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کی مہم میں لگ گئی۔ اس کے باوجود کچھ تنگ نظر لوگ سرسید احمد پر یہ الزام تراشتے ہیں کہ انہو ں نے صرف مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی بدحالی کا رونا رویا ہے اور انہیں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کی اور ان کے مخاطب صرف مسلمان رہے ہیں۔ ان کی تقاریر اور مضامین اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ ان کی فکر ونظر کا محور کبھی بھی صرف مسلمان نہیں رہے۔ ان کی سانسوں میں اس وقت کا ہندوستان بستا تھا اور وہ اپنے ملک وقوم کی دردناک صورتحال کو دیکھ کر مضطرب تھے اور اس دردمندی نے ان کی تقریروں اور تحریروں میں سوز وگداز بھر دیا تھا۔

''پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور میری قوم کے بچو اپنی قوم کی بھلائی

پر کوشش کرو تا کہ آخر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعاء ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے۔''

اس اقتباس میں "ہم وطنو" اور " قوم کے بچوں "صرف مسلمانوں کے لئے نہیں کہا گیا ہے مگر کیا کیجئے جب ذہن کسی تعصب کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ومسدود ہو جاتا ہے اور ویسے ہی محدود ذہنیت کے لوگ سرسید جیسے رہنمائے قوم کے افکار واعمال کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر وقت انصاف پسند ہوتا ہے وہ کسی ناانصافی کو کب قبول کرتا ہے۔ آج ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے بڑے سے بڑے دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر سرسید اس وقت ملک میں تعلیمی وسماجی تحریک کا آغاز نہیں کرتے تو آج ہندوستان تعلیمی شعبے میں سو سال اور پیچھے ہوتا۔ سرسید کے تصورِ تعلیم پر جب کبھی گفتگو ہوتی ہے تو بعض مبصرین یہ کہتے ہیں کہ سرسید کی تحریک تعلیمِ نسواں کی روح سے عاری نظر آتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اگر سرسید کی اصلاحی وتعلیمی تحریک کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود عیاں ہو جائے گی کہ سرسید کا ماننا تھا کہ عورت کی اصلاح اور تعلیم کے بغیر نہ گھر کا نظام درست ہو سکتا ہے اور نہ ہی انسانی معاشرے کا توازن برقرار رہ سکتا ہے۔ ہاں! یہ سچ ہے کہ سرسید نے لڑکیوں کی تعلیم کے مقابلے لڑکوں کی تعلیم کو اولیت دی اور ایسا انہوں نے کیوں کر کیا اس کی وضاحت بھی کی تھی۔ خواتین کے حوالے سے ایک جگہ وا پنا موقف یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اسے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لئے کرتا ہوں، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے ہیں"۔

دوسری جگہ انہوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''کوئی دنیا کی تاریخ اس وقت تک نہیں مل سکی کہ جس خاندان کے مردوں نے تعلیم پائی ہو، مردوں کے اخلاق درست ہو گئے ہوں، مردوں نے علم وفضل حاصل کر لئے ہوں اور عورتیں تعلیم سے محروم رہی ہوں۔ ہماری منشا یہی ہے کہ یہ تعلیم جو ہم دلا رہے ہیں لڑکوں کی نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کی ہے جن کے وہ باپ ہوں گے۔ ہم کو ولی ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، پیشنگوئی نہیں کر سکتے بلکہ ہم کو پچھلے

واقعات دیکھ کر نصیحت لینی چاہئے۔ اس وقت ہم تمام یوروپ کی اور تعلیم یافتہ ملکوں کی تاریخ دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہوجاتے ہیں، عورتیں لائق ہوجاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہو عورتیں بھی لائق نہیں ہوسکتیں۔ انہوں نے ایسی تعلیم کی وکالت کی تھی جو حسبِ احتیاجِ وقت ہو یعنی عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔ انہوں نے کہا تھا کہ: "جو تعلیم حسبِ احتیاجِ وقت نہ ہو، وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقل مند کا قول ہے کہ اگر حسبِ احتیاج لوگوں کی تعلیم وتربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل، اور پھر ذلیل وخوار اور پھر چور و بدمعاش ہوجاتے۔''

1869ء میں سرسید احمد خان کو انگلستان جانے کا موقع ملا یہاں پر وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ ہندوستان میں بھی کیمبرج کی طرز کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کریں گے۔ وہاں کے اخبارات اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر سے متاثر ہوئے۔ سرسید نے تعلیمی درسگاہ کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں انقلاب لانے کے لئے اسی قسم کا اخبار ہندوستان سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اور 1870 میں ''رسالہ تہذیب الاخلاق'' کا جاری کیا۔ اس رسالے نے سرسید کے نظریات کی تبلیغ اور مقاصد کی تکمیل میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے کہا: ''میں ہندوستانیوں کی ایسی تعلیم چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے حقوق حاصل ہونے کی قدرت ہوجائے، اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً وکرہاً ہم کو دلا دے گی۔'' آپ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ سیاست سے دور رہتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ تعلیم کے حصول اور معاشی ومعاشرتی ترقی کی راہ میں مبذول کریں تاکہ وہ ہندوؤں کے برابر مقام حاصل کرسکیں۔ سرسید ہندو مسلم اختلافات کو ختم کر کے تعاون اور اتحاد کی راہ پر گامزن کرنے کے حق میں بھی تھے۔ انہوں نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی مسلسل کوششیں کیں۔ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندو اساتذہ کی تقرری کے ساتھ ساتھ غیر مسلم طلباء کا داخلہ بھی کیا۔ ان کی تمام زندگی قوم و ادب کی خدمت میں گزری۔

محمد منتظم ۔ ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

امام احمد رضا خان کی علمی خدمات: ایک سرسری جائزہ

ہندوستان کے علماء، صوفیاء ومشائخ کی علمی خدمات اوران کا تذکرۂ حیات ہماری قومی وملی تاریخ کا قیمتی اثاثہ ہے۔ سلاطین وامراء اور عامۃ المسلمین کو دامن اسلام سے وابستہ رکھنے اوران کے درمیان ایمان کی روح زندہ رکھنے کی سعادت انھیں نفوس قدسیہ کے حصّہ میں آئی ہے۔ انھیں پاکباز وخوش نصیب ہستیوں میں ایک اہم نام امام احمد رضا خان فاضل بریلوی کا ہے۔ آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ عوام ہو یا خواص ہر کوئی اپنے اپنے طور پر آپ کے علمی، اصلاحی وتجدیدی کارناموں سے بحسن وخوبی واقف ہے۔

شاہ احمد رضا خان انقلاب 1857ء سے ایک سال قبل 10/ شوال المکرّم 1272ھ مطابق 14/ جون 1856ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش ایک ایسے علمی وفکری گھرانے میں ہوئی جہاں درس وتدریس، وعظ وتقریر، نعت نویسی ونعت خوانی، فقہ وافتاء اور تصنیف وتالیف خاندانی دستور تھا۔ اوراس علمی ماحول کا یہ اثر رہا کہ آٹھ سال ہی کی عمر میں درس نظامی میں شامل نصاب کتاب ''ہدایۃ النحو'' کی عربی شرح لکھ ڈالی۔ آپ مولانا نقی علی خان کے نامور فرزند تھے۔ ذہانت، وسعت مطالعہ اور سرعت تحریر میں اپنے دور کے قابل رشک صاحب علم وقلم تھے۔ ویسے تو پچاس سے زائد علوم وفنون پر آپ کو عبور تھا لیکن تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ میں خصوصی مہارت وتبحّر کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری میں انفرادی رنگ اور عشق رسول ﷺ میں آپ کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ اپنے خاندان کے مؤقر اور جلیل القدر پیش روعلماء کی بہ نسبت آپ نے تن تنہا وہ حیرت انگیز، تاریخ ساز اور علمی خدمات انجام دیئے جو سیکڑوں علماء کی اجتماعی علمی خدمات پر بھاری پڑ گئیں۔ چھوٹی بڑی تقریباً ایک ہزار کتابیں تصنیف فرما کر امت مسلمہ کو ایک عظیم علمی سرمایہ عطا کیا جو کہ آپ کی ناقابل فراموش یادگار ہے۔

علم وفن کا جوتصوّر اسلام نے دیا ہے اس کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ علم وفن کی بہاریں ہیں وہ مسلم علماء، محققین اور اصحاب علم وفن ہی کی بدولت ہیں۔شاہ احمد رضا خان کی علمی خدمات میں کافی وسعت وگہرائی کے ساتھ تحقیق وتدقیق اور فکر وشعور کی بالیدگی پائی جاتی ہے۔آپ کی علمی تحقیقات سے استفادہ کر کے قوم وملت کی ترقی کا فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے۔آپ نے مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی اور اعتمادی وفکری رہنمائی کی غرض سے 1912ء میں دس نکاتی منصوبہ پیش کیا جس کا مقصد مسلمانوں میں اسلامی بصیرت کے ساتھ ساتھ تعلیمی استعداد ولیاقت پیدا کرنا تھا۔ان نکات میں قومی لحاظ سے رہنمائی کا وہ ضابطہ موجود ہے جس میں آفاقیت کے ساتھ ساتھ قوت عمل کی تحریک بھی ہے۔ان نکات کے تعلق سے برطانوری دانشور ڈاکٹر محمد ہارون لکھتے ہیں:

’’یہ تعلیمی پالیسی خواہ وہ ہمارے اپنے اداروں کا نظام تعلیم ہو یا دیگر لوگوں کا مقرر کردہ نظام تعلیم ہو، ہرایک کے لئے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔اگرچہ امام احمد رضا نے یہ نکات تقریباً ایک صدی قبل پیش فرمائے تھے، لیکن ان کی اہمیت اوافادیت سے آج کے موجودہ نظام تعلیم میں بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

(امام احمد رضا کے جدید اصلاحی اسلامی تعلیمی نظریات۔ص19، رضا اکیڈمی یو، کے 2005ء)

پچاس سے زائد علوم وفنون پر آپ کی تقریباً ایک ہزار کتابوں کو تصنیف کی نوعیت کے اعتبار سے ہم چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔(۱) مستقل تصنیف: جو باضابطہ پروگرام اور اہتمام کے ساتھ لکھی گئی۔(۲) مستقل تصنیف: جو فوری ضرورت کے تحت مفصل اور مبسوط لکھی گئی۔(۳) مفصل رسائل یا کتابچے: جو کسی خاص موضوع کے تحت کسی سوال یا استفتاء کے جواب میں اہتمام کے ساتھ لکھے گئے۔(۴) ضمنی رسائل: جو کسی سوال یا استفتاء کے جواب میں لکھے گئے مگر ان کی افادیت وضرورت کے پیش نظر انھیں مستقل رسائل یا کتابچوں کی شکل میں شائع کردیئے گئے۔بہت سے رسائل فتاویٰ رضویہ میں موضوع کی مناسبت سے منسلک کر کے شائع ہو چکے ہیں۔

امام احمد رضا خان کے شاگرد وخلیفہ ملک العلماء علامہ ظفر الدین بہاری رحمۃ اللہ

علیہ (1303-1382) نے اپنی کتاب 'حیات اعلیٰ حضرت حصہ دوم' میں بہت ہی محتاط تحقیق کے بعد چھ سو سے زائد کتابوں کا ذکر کیا ہے۔اس کی کچھ تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے تا کہ مختلف علوم وفنون سے متعلق آپ کی تصنیفات کا علم ہو سکے۔سب سے پہلے ان علوم وفنون کا ذکر کیا جاتا ہے جن پر امام احمد رضا خان کو کامل دسترس حاصل تھی۔

ترتیب نمبر	علوم وفنون	اردو	عربی	فارسی	کل تعداد	ترتیب نمبر	علوم وفنون	اردو	عربی	ف
1	علم فقہ	101	41	8	150	18	علم الحساب	...	...	1
2	علم اصول فقہ	5	3	2	10	19	علم ارثماطیقی	...	1	2
3	علم عقائد	19	13	9	41	20	علم ریاضی	...	2	1
4	علم کلام	11	4	2	17	21	علم الہندسہ	...	1	2
5	علم تفسیر	3	3	...	6	22	علم جبر ومقالہ	...	...	1
6	علم حدیث	9	2	...	11	23	علم زیجات	...	...	1
7	علم اصول حدیث	5	3	1	9	24	علم الجفر	2	1	.
8	علم الفرائض	3	1	1	5	25	علم النجوم	...	1	.
9	علم تجوید	2	...	1	3	26	علم الادب العربی	5	3	1

10	علم رسم خط قرآن	...	1	...	1	27	علم سیر	3	...	.
11	علم تاریخ	...	3	...	3	28	علم تصوف	2	...	.
12	علم لغت	...	3	...	3	29	علم سلوک	2	...	.
13	علم مناظرہ	1	8	...	9	30	علم اخلاق	2	...	.
14	علم تکسیر	...	1	...	1	31	علم المناقب	11	5	3
15	علم الوفق	...	1	1	2	32	علم الفضائل	21	9	.
16	علم التوقیت	5	1	1	7	33	علم ترغیب وترہیب	21	...	.
17	علم ہیئت	...	2	1	3	34	علم اذکار	...	2	3

34 علوم وفنون پر مشتمل یہ 390 کتابیں ہوئیں۔علامہ ظفر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس تعلق سے قابل ذکر ہے:

’’یہ علوم فنون مروجہ وغیر مروجہ، درسیہ وغیر درسیہ، مشہورہ وغیر مشہورہ جن میں اکثر نہیں تو بعض کے نام سے بھی علمائے زمانہ واقف نہیں، اس علم وفن سے واقفیت تو کجا۔اور اعلیٰ حضرت کے اعلیٰ درجہ کمال کی دلیل ہے کہ اتنے علوم وفنون سے نہ صرف واقف بلکہ اس میں ماہر وکامل بلکہ صاحب تصنیف۔ان کے علاوہ پانچ تصنیفات وتالیفات ایسی ہیں جن کا کسی خاص فن یا علم سے تعلق نہیں بلکہ وہ عام اموراور دیگر ضروریات زندگی سے متعلق ہیں۔‘‘

(حیات اعلیٰ حضرت حصہ دوم ص،۱۰۴۔مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی)

اس کے علاوہ عیسائیت ویہودیت کے بشمول دیگر باطل مذاہب ،فاسد افکار ونظریات،اسلام مخالف تنظیمات اور اہل سنت والجماعت مخالف نظریات کی حامل شخصیات

کی تردید میں لکھی گئی کتابوں کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ ان کی مجموعی تعداد 233 ہوتی ہے۔اس الحاظ سے آپ کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد 823 ہو جاتی ہے۔اور بہت سی کتابیں ورثاء کی عدم توجہی کی وجہ سے غیر مطبوعہ ہیں۔تقسیم ہند کے وقت افراتفری کی وجہ سے کچھ کتابیں ضائع ہو گئیں۔کچھ کتابیں بعض ناواقفوں کی لاعلمی کے سبب ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئیں۔آپ کی کل تصنیف شدہ کتابوں کی تعداد کا تعین مشکل ہے البتہ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً ایک ہزار ہے۔اس تعلق سے علامہ عبدالمبین نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

'' یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے کل کتنی کتابیں تصنیف کیں ،ایک اندازہ ہے کہ تعلیقات وحواشی کو لے کر کل کتابوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہوگی۔''

(المصنفات الرضویہ۔ص،۱۲مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی)

آپ کی تمام تصنیفات میں سب سے زیادہ شہرت فتاویٰ رضویہ اور کنزالایمان کو ملی۔آپ کی تمام کتابوں کے بجائے صرف آپ کے فتاویٰ کا ہی اگر کوئی مطالعہ کرلے تو مختلف علوم وفنون پر امام احمد رضا کی مہارت کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔فتاویٰ رضویہ علم وفن کا ایک انسائکلو پیڈیا ہے جس کی گہرائی وگیرائی سے متعلق مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:

''فقہ حنفی میں ہندوستان میں دو کتابیں مستند ترین ہیں۔ان میں سے ایک 'فتاویٰ عالم گیریہ' ہے جو دراصل چالیس علماء کی مشترکہ خدمت ہے۔دوسرا 'فتاویٰ رضویہ' ہے جس کی انفرادیت یہ ہے کہ جو کام چالیس علماء نے مل کر انجام دیا وہ اس مرد مجاہد نے تنہا کر کے دکھا دیا اور یہ مجموعہ'' فتاویٰ رضویہ'' فتاویٰ عالم گیریہ سے زیادہ جامع ہے۔اور میں نے جو آپ کو امام ابوحنیفہ ثانی کہا ہے وہ صرف محبت یا عقیدت میں نہیں کہا بلکہ فتاویٰ رضویہ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ اس دور کے ابوحنیفہ ہیں۔آپ کے فتاویٰ میں مختلف علوم وفنون پر جو بحثیں کی گئی ہیں ان کو پڑھ کر بڑے بڑے علماء کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔کاش کہ اعلیٰ حضرت کی حیات اس دور کو میسر آجاتی تاکہ آج کل کے پیچیدہ مسائل حل ہو سکتے۔کیوں کہ آپ کی تحقیق حتمی ہوتی۔مزید کی گنجائش نہ ہوتی۔''

(امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت۔ص،۳۰۔مطبوعہ رضا اسلامک مشن، بنارس)

آپ کی تصنیفات وتحقیقات کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں موجودہ عہد کے مسائل کا حل موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک صدی گزر جانے کے باوجود ان کے تصانیف کی افادیت کم نہ ہوئی۔اس لئے کہ ان میں اسلاف کرام کی صدیوں کی کاوشات کا نچوڑ موجود ہے اور زمانے کو ان کی ضرورت ہے۔

شعر وشاعری میں بھی آپ کو انتہائی درجہ کا کمال حاصل تھا۔آپ کا نعتیہ دیوان 'حدائق بخشش' اردو شاعری کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا جس نے اپنے بعد آنے والے تمام نعت گوؤں کو ادب کا جامہ پہنا دیا ورنہ اس سے قبل اردو نعت صرف عقیدت کے طور پر دیوان کے شروع میں شامل نظر آتی۔مگر حدائق بخشش کے بعد اردو نعت ادب کا ایک حصہ بنا۔آپ کے نعتیہ کلام کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اردو میں نعتیہ شاعری اس معیار کی کسی نے کی ہی نہیں۔اور سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ان کے ایک ایک شعر میں جو عشق رسول ﷺ کی جھلک نظر آتی ہے وہ موجودہ دور کے کسی شاعر کے کلام میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ان کی عظیم شاعری کے تعلق سے مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:

''بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو معلوم نہیں کہ شاہ احمد رضا کتنے بڑے شاعر تھے۔آج تک دو شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے تین زبانوں میں شعر کہا ہے،امیر خسرو ہیں یا جامی۔مگر اعلیٰ حضرت نے چار زبانوں میں شعر کہا ہے۔اس میں فارسی بھی ہے،عربی بھی ہے،اردو بھی ہے،ہندی بھی ہے۔اور چاروں زبانوں میں یکساں قدرت ومہارت حاصل تھی۔''

(امام احمد رضا خان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو۔ص،۳)

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔دور جدید کے مروجہ سائنسی علوم کی جھلک بھی شاہ احمد رضا خان کی تصنیفات میں نظر آتی ہے۔اس ترقی یافتہ دور میں ایسے سائنسی آلات معرض وجود میں آگئے ہیں کہ ہم لمحوں میں دور کی آوازیں سن سکتے ہیں،دور کی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ ایک جگہ بیٹھ کر تمام دنیا کا نظارہ بھی کر سکتے ہیں۔یہ سب مادی سائنس کے کرشمے ہیں اور مادی سائنس علم صوتیات سے متعلق ہے۔

علم صوتیات (لہروں کا نظام) کی اہمیت وافادیت کو یورپین مفکرین کی طرح مسلم مفکرین نے بھی اجاگر کیا ہے۔ بیسوں صدی میں آواز کی لہروں (Sound Waves) اور نظریۂ تموج (Wave Theory) پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ ان مسلم مفکرین میں امام احمد رضا خان کا نام بھی سرفہرست ہے۔ سائنسی شعبہ جات میں آپ نے اپنی خداداد صلاحیت سے بہت ہی جامع بحث فرمائی ہے۔ چنانچہ ان بحثوں سے متاثر ہو کر ایشیاء کے عظیم سائنس داں ڈاکٹر عبدالقدیر نے بھی آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

sound waves اور Wave Theory سے متعلق تفصیلی بحث ''الکشف شافیا فی حکم فونو جرافیا (۱۹۰۹ء)'' رسالہ میں موجود ہے جو کہ فتاویٰ رضویہ جلد دہم میں منسلک ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالے میں آپ نے تقریباً ۲۷ محققین و مفکرین اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے بعض مفکرین کا رد اور تعاقب بھی کیا ہے اور بعض محققین و مفکرین کے نظریات کی تائید بھی کی ہے۔

بہرحال! امام احمد رضا کی دینی، علمی و قلمی خدمات کو پوری دنیا میں خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کی خدمات پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ان پر ریسرچ ہو رہا ہے۔ آپ کی زندگی، دینی خدمات اور مکتوبات و تصانیف پر ملک و بیرون ملک کے بہت سے محققین نے پی، ایچ، ڈی کی ہے۔ 1979ء سے اب تک تقریباً 20 سے زائد تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اور آج مولانا احمد رضا خان کے علمی کارناموں سے عوام و خواص دونوں طبقے مستفیض ہو رہے ہیں۔

25/ صفر 1340ھ مطابق 28/ اکتوبر 1921ء بروز جمعہ ادھر مؤذن نے اذان جمعہ میں 'حی علی الفلاح' کہا اور ادھر آپ نے کلمۂ طیبہ پڑھا اور اپنے فرزند مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب سے فرمایا سورۂ یٰسین اور سورۂ رعد کی تلاوت کرو اور پھر چند ہی لمحے بعد 65 سال کی عمر میں آپ اس دنیائے فانی سے کوچ فرما گئے۔ اللہ عز وجل انھیں غریق رحمت فرمائے۔ آمین۔

مہتاب عالم فیضانی۔ احمد آباد گجرات اسکالر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

علم ایسی دولت ہے جو چرائی نہیں جاسکتی ،مٹائی نہیں جاسکتی اور نہ برباد کی سکتی ہے۔علم حاصل کرنے کی اہمیت ہر زمانہ، ہر دور اور مذہب وقوم میں مسلم رہی ہے۔علم حاصل کرنے والے ہمیشہ کامیاب رہے ہیں اور معلموں کوصدا عزت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔علم کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ پاک نے اس دنیا میں اور اپنے محبوب پر پہلی وحی علم سے متعلق نازل کی ،جس میں نبی کے توسط سے پوری انسانیت سے کہا گیا ''پڑھو''،اور قرآن میں اللہ پاک نے جابجا علم کی اہمیت وافادیت کا احساس دلایا ہے۔سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۱ میں اللہ فرماتے ہیں ''ہم نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتادیے''،اسی علم کی بنیاد پر انسان تمام مخلوقات میں بہتر اور اعلی ہے۔اور اسی علم کی وجہ سے انسان کو فرشتوں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔قرآن اور فرمانِ نبوی پوری دنیا کے لیے ہے اس لیے مذکورہ دونوں چیزوں میں جو بھی علم کی اہمیت وافادیت کی بات کی گئ ہے وہ ساری انسانیت کے لیے ہے۔ ہر مذہب، ہر قوم وملت میں علم وتعلیم کی اتنی اہمیت کے بعد بھی لوگ تعلیم سے کوسوں دور اور ہراساں نظر آتے ہیں۔یا یہ کہیے تعلیم کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن پیسوں کی قدر ان کے نزدیک تعلیم کی اہمیت سے زیادہ ہے۔تعلیم نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہرانسان کے لیے سانس کے مانند ہے۔اگر میں یہ کہوں کہ تعلیم کے بغیر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں ہے تو بیجا نہ ہوگا۔یہاں میں عموماً پوری دنیا کے لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم کے حوالے سے کچھ بات کروں گا۔

پوری دنیا میں مسلمانوں پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو مسلمان تعلیم اعتبار سے کمزور نظر آتے ہیں اور ہندستان میں خاص طور پر جب ہم مسلمانوں کی تعلیم وایجوکیشن کی طرف نظر کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ کی طرح ہمیں پیچھے اور پسماندہ ہی نظر آتے ہیں،اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ روز اول

سے ہی یہ قوم پچھڑی ہے بلکہ علم کا ایسا سرچشمہ اس قوم سے پھوٹا جس نے نہ صرف عرب کے ریگستانوں بلکہ یونان ومصر وروماں کے ساتھ پورے عجم کو سیراب کیا اور پوری دنیا میں علم وحکمت کو اس قدر عام کیا کہ آج بھی اس سرچشمے سے پوری دنیا کے لوگ سیرابی حاصل کر رہے ہیں۔لیکن ان تمام کے باوجود آج مسلمان تعلیمی میدان میں پیچھے نظر آتے ہیں۔مسلمانوں کا تعلیمی میدان میں پیچھے نظر آنا کوئی نئی بات نہیں بلکہ کئی دہائیاں گذر گئیں اور ان کی حالت جوں کی توں ہے۔سچ فرمایا ہے کہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو پاس خود اپنی حالت بدلنے کا۔

ماضی پہ نظر ڈالتے ہیں تو بڑے بڑے مسلم دانشور اور سائنس داں نظر آتے ہیں۔نویں صدی عیسوی کے مسلم سائنس داں ''محمد بن موسیٰ الخوارزمی'' کو کون بھول سکتا ہے جس نے ہندسہ (حساب) اور الجبرا کو ایجاد کیا اور اس نے جغرافیہ دانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے دنیا کا پہلا مکمل نقشہ ترتیب دی۔اور کولمبس جس نقشے کی مدد سے امریکہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تھا وہ بھی ایک عرب مسلم اسکالر نے بنای تھا جس کا نام ''محمد الادریسی'' تھا۔دسویں صدی کا مسلم دانشور ''ابن الہیثم '' کسے یاد نہیں جس نے پہلی بار دنیا کو اس بات سے واقف کرایا کی انسانی آنکھیں کس طرح کام کرتی ہے۔اور یہی وہ شخص ہے جس نے ''کیمرے'' کی ایجاد کی۔اسی صدی میں ''بوعلی سینا'' نامی ایک مسلم سائنس داں پیدا ہوا جس نے میڈکل سائنس پر ایک ایسی کتاب لکھی جو ہزاروں سال گزرنے کے بعد آج بھی پڑھائی جاتی ہے۔جس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میڈکل سائنس کی ہر ایجاد کا منبع وہی کتاب ہے۔اور آگے بڑھتے ہیں تو نیشاپور میں ''عمر خیام'' نامی ایک ایسے مسلم سائنس داں کا وجود ملتا ہے جس نے دنیا کو پہلی بار ''کیلینڈر'' سے متعارف کرایا اور ساتھ ہی ریاضی کے ایسے مسائل کیے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہو سکے تھے۔

ناسا (NASA) اور امریکہ کے سائنس دانوں نے تو بہت بات میں اس بات کا پتہ لگایا کہ سورج گردش کرتا ہے یا کرۂ ارض؟ جبکہ گیارہویں صدی میں مسلم سائنس داں ''ابوریحان البیرونی '' نے یہ بتادیا تھا کہ سوردج اور کرۂ ارض دونوں اپنے اپنے حدود میں گردش کرتے ہیں۔اس نے یہ بھی بتایا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز اور سریع ہے۔مسلمانوں میں ایسے ایسے اشخاص گزرے جنھوں نے قوموں کے ہاتھ سے خنجر چھڑا کر قلم تھمادیا۔خراسان کے ''نصیر الدین

طوسی'، وہ مسلم دانشور ہے جس نے ''منگلوں'' جیسی خونخوار قوم کے ہاتھ میں قلم تھما کر انہیں قتل وغارت کرنے روکر پڑھنا لکھنا سکھایا۔ لیکن ان تمام کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے:

حیرت ہے تعلیم و ترقی میں ہے پیچھے
جس قوم کا آغاز ہی اقراء سے ہوا تھا

پہلے یہ بات تھی کہ مسلم اکثریت غریب ہے اور اب یہ بات ہے کہ ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے ان دونوں باتوں کی صداقت سے صرف نظر کرتے ہوئے ذیل میں کچھ ایسے نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی جس سے مسلم تعلیمی پسماندگی دور کرنے میں مدد ملے گی۔

جب ہم مسلم معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس معاشرے کی اکثریت اور خاص کر متوسط طبقہ اپنی آل واولاد کی تعلیم کے تئیں اتنا سنجیدہ اور فکر مند نہیں ہے جتنا کہ اسے ہونا چاہیے، اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ خود ناخواندہ ہیں یا پھر وہ طبقہ آج کے دور میں بھی تعلیم کی اہمیت سے نا واقف اور نابلد ہے، یا پھر فارغ البالی کی زندگی نے اسے سست و بے پرواہ بنادیا ہے، جس کے نتیجے میں اس طبقہ کے بچے تعلیم کو سنجیدگی سے نہیں لیتے ہیں اور بس صرف نام کا اسکول آتے جاتے ہیں، ان کی اس روش سے نہ تو ان کے والدین کو کچھ فرق پڑتا ہے اور نہ ہی گھر کے کسی بہی خواہ کو۔

بچے کا اسکول میں داخل ہو گیا بس یہی کافی ہے، اکثر گارجین یہی سوچ کر اپنے بچوں کا داخلہ اسکول میں کراتے ہیں کہ فلاں نے بھی اپنے بچے کا داخلہ کرایا ہے، ان کا بچہ کیا پڑھتا ہے، کتنا پڑھتا ہے، پڑھنے میں کیسا ہے، اس کی دلچسپی کس صنف یا فن میں ہے، اس سے نہ تو والدین کو کچھ سروکار ہوتا ہے اور نہ ہی اسکول کے ارباب مجاز کو، بس ہر کوئی اپنی اپنی فارمیلٹی پوری کر رہا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ مسلم معاشرہ روز بروز زبوحالی اور تعلیمی پسماندگی کی گہری گھاٹی میں گرتا چلا جارہا ہے۔ اگر کچھ بچے تعلیم کے تئیں سنجیدہ ہوتے بھی ہیں تو ان کو مکمل طور سے گائڈ لائن اور رہنمائی صرف اس وجہ سے نہیں مل پاتی ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے جس سے، یا جہاں سے وہ رہنمائی حاصل کرسکیں یا پھر بعض مجبوریوں کی بنا پر رہنمائی حاصل کرنا نہیں چاہتے ہیں، حالانکہ ان کو تو اس جذبے کے ساتھ آگے بڑھ چڑھ کر آنا چاہیے کہ 'ہم نے دنیا کی رہنمائی کی' اور ایک بار پھر کریں گے مگر افسوس ان کے ذہن میں یہ بات گھر کرگئی ہے کہ 'اب ہمیں راستہ نہیں ملتا'۔

زیادہ تر مسلم والیان کی نظر کمائی اور مال و دولت پر ہوتی ہے کہ کب بچہ بڑا کمانا شروع کرے گا، جلدی سے بڑا ہو جائے اور ہم اسے کمانے کے لیے سعود، دبئ، قطر، امریکہ ،لندن، کویت یا کسی اور جگہ باہر بھیج دیں تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ روپیا ہمیں کما کر دے اور ہم راتوں رات پیسے والے ہو جائیں۔ اسی طرح کے خیال رکھنے والے لوگوں کے بارے میں ''نوائے وقت کے کالم نگار، عبدالقیوم لکھتے ہیں'' ہم عمر بھر اپنی ساری توانائی اپنی معاشی آسودگی کے حصول میں صرف کرتے رہتے ہیں اور جب بہت ساری دولت، لامحدود جائیداد اور بے پناہ وسائل ہمارے ہاتھ میں آجاتے ہیں تو ہم اپنی زندگی کو کامیاب کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں''۔ تعلیمی تعلق سے اگر آپ آج کے معاشرے پر نظر ڈالیں گے تو یہی بات نظر آئے گی۔

اولاً تو زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ملتی ہے اور اگر ملتی ہے اور بچے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کے خواہاں ہوتے ہیں تو اکثر ان کے اہل خانہ یا پھر کوئی اور بہی خواہ یہ کہتا ہے کہ ارے باہر جا کر پڑھنے سے کیا ہوگا یہیں پڑھو ،اگر وہ بچہ آرٹس کا ہو اور گریجویشن کے لیے باہر جانا چاہتا ہے تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بی ۔اے۔ کر کے کیا کرو گے اور اگر کرنا ہی ہے تو باہر جا کر کرنے سے کیا فائدہ یہیں سے کرلو ساتھ میں گھر کا کام کاج بھی دیکھنا، اس طرح سے کہہ کر لوگ اس طالب علم اور بچے کے حوصلے کو پست کر دیتے ہیں، ایسے لوگوں سے میرا ایک سوال ہے کہ جب اس بچے کو باہر بھیج کر کر کمانے کی بات آتی ہے تو تب وہی لوگ شب و روز اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ بس کسی طرح پاسپورٹ بن جائے اور لڑکا باہر چلا جائے۔ ایسے موقع سے وہ دوگنا پیسے بھی خرچ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جب لڑکے والیان یہ کہتے ہیں کہ باہر جا کر پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تو اس وقت یہ لوگ آخر یہ کیوں نہیں کہتے باہر جا کر کمانے سے کیا ہوگا یہاں بھی تو کمایا جا سکتا ہے، لیکن اس لالچی اور حرصی دنیا کے لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل اور آسائش کی خاطر تب اس بات پر غور نہیں کرتے ہیں کہ جب وہ بچہ باہر جا کر زیادہ کما سکتا ہے تو باہر پڑھ کر زیادہ علم بھی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر ان حرصی لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی، جن کی کتاب میں علم پر زور دیا گیا جس کے نبی نے علم کی تاکید کی اور اس حد تک کہ اپنے صحابہ کرام کے قاتلوں

کوان کے بچوں کو علم سکھانے کی شرط پر معاف کر کے آزاد کر دیا۔ وہی قوم اور اسی نبی کی امت اس کے تعلق سے بے پرواہ مال و دولت کی حرص میں ڈوبی ہے بقول شاعر۔

حرص و ہوا سے جس کو بچایا رسول نے
بھٹکی ہوئی ہے قوم وہ اب خواہشات میں

مسلم معاشرہ تعلیم کے میدان میں اس لیے بھی پیچھے ہے کہ جن گھرانوں میں تعلیم یافتہ افراد ہیں ان کے اندر دوسروں کی رہنمائی کرنے کے جذبے کا فقدان ہے وہ زیادہ تر اپنی تعلیمی صلاحیت کی دھونس جمانے اور شیخی بگھارنے میں رہتے ہیں اور ساتھ ہی ایسے افراد کی بھی کمی ہے جو کہ تعلیم حاصل کر رہے بچوں کی کچھ نہیں تو حوصلہ افزائی ہی کریں، اگر یہ بات مان بھی لی جائے کی مسلم سماج میں خواندہ افراد کی کمی کی وجہ سے مسلم طلبا کو تعلیم کے تئیں راہ دکھانے والا کوئی نہیں مل پاتا تو حوصلہ افزائی کرنے میں کون سی ڈگری کی کمی ہے آخر کیوں لوگ حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں، جنگ میں جس طرح سے ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح سے تعلیم میں بھی، اگر لوگ اپنے بچوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے تو کم سے کم ان کی ہمت اور حوصلے کو پروان چڑھائیں نہ یہ کہ اسے اور پست کریں۔

جب سے خلیجی ممالک جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے مسلم معاشرے کی غربت کی شرح میں تھوڑی سی کمی آئی ہے مگر پھر بھی تعلیم کی اہمیت کے تئیں ناقص بیداری کی وجہ سے لوگ اعلی تعلیم سے راہ فرار اختیار کرنا بہتر سمجھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ بچوں کو زیادہ پڑھانے سے کیا فائدہ جب اپنا ہی کام کرنا ہے تو پھر پیسہ کیوں خرچ کریں اور وقت کیوں برباد کریں، مگر وہ انجانے میں یہ دونوں چیزیں برباد کر رہے ہوتے ہیں مثلاً آج کوئی بھی گھر ایسا نہیں ہوگا کہ جس گھر کا ایک فرد بھی فارن میں ہے تو اس کے گھر کے بچوں کے پاس اسمارٹ فون نہ ہو، ان میں سے اکثر لوگوں کے گھروں میں فون کے ساتھ ساتھ بائک بھی ہے چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، نتیجتاً ان کے گھر کے بچے جو ابھی عنفوان شباب میں ہوتے ہیں جن کی عمر ابھی اسکول اور مدرسے جانے کی ہوتی ہے زیادہ تر وقت موبائل اور شو آف میں صرف کرنے لگتے ہیں اور ان کا ذہن تعلیم سے دور ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی تعلیم ہونے کی وجہ سے اور اوباش لوگوں کی سنگت اختیار کرنے کی وجہ سے بے

ادب اور بداخلاق ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کا انجام انہیں کو بھگتنا پڑتا ہے جنہوں نے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے ان کے ہات میں قسم قسم کی آوارہ گردی کی چیزیں تھمادی تھیں۔

پہلے کی بہ نسبت اب کچھ علاقوں میں یہ سوچ بدلی ہے اور لوگ تعلیم کی طرف مائل ہو رہے ہیں مگر آج بھی گار جیں پہلے کمانے کے بارے میں سوچتے ہیں اور اس کے بعد پڑھائی لکھائی۔ یعنی پڑھائی لکھائی کو بہر صورت اولیت نہیں دیتے ہیں۔ کمانے کے بارے میں سوچیں مگر اس حد تک نہیں کہ گذر بسر ہونے کے باوجود ذخیرہ اندوزی کے لیے بچوں کی تعلیم کا سودا کرلیں اور اسے پڑھانے کے بجائے کام پر لگا دیں۔ ایک دہائی گذر گئی اور اب بھی یہ سلسلہ زوروں پر ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو کمانے کے لیے خلیجی ممالک بھیجتے ہیں اور اس کے لیے گارجین اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ کب ان کا بچہ بالغ ہو اور اسے بدیس بھیجیں، بعض مرتبہ تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عمر بڑھوا کر پاسپورٹ بنوا دیا جاتا ہے اور عمر سے پہلے ہی بچے کو بالغ کر کے فارن بھیج دیا جاتا ہے، تاکہ بچہ جلدی سے کمائی کر کے پیسہ بھیجے جس سے گھر دوار بنے اور آرام ملے، گویا زندگی کا یہی نصب العین ہو کہ اچھا گھر ہو اور تمام آسائشوں سے بھری زندگی ہو، اس طرح سے عارضی آسائش، دولت کی خاطر تعلیم بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے اور مسلم معاشرے کے نونہالوں کا مستقبل تاریکی میں چلا جاتا ہے، اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خود بچوں کا بھی اب یہی ذہن بن گیا ہے کہ بڑے ہو کر باہر جانا ہے جس کی وجہ سے ان کا ذہن تعلیم میں نہیں لگتا۔ تعلیم حاصل کرنے کی فکر تو ہے ہی نہیں لیکن عجب ہے باہر ملکوں میں جانے والوں کو محنت ومشقت کی روداد سن کر بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔

آج مسلم معاشرہ اتنی غربت کا شکار نہیں ہے جتنا کہ پہلے تھا اور یہی وجہ ہے کہ بہت سارے مسلم بچے اعلی تعلیم حاصل کر رہے ہیں کچھ گھر پر ہی اور کچھ گھر سے دور، مگر جو طلبا گھر سے دور ہیں ان کے والیان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ میرا بیٹا باہر پڑھ رہا ہے اسے وقت پر پیسہ بھیج دیا جائے بس وہی کافی ہے، جس کے پس پردہ وہی اسکول والی سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ بس اسکول میں نام درج ہو گیا کافی ہے اس کے بعد بچہ کیا کر رہا ہے، کتنا پڑھ رہا ہے، کتنی کامیابی حاصل کر رہا ہے ان سب سے والدین کو کوئی فکر نہیں ہوتی، اس عدم دلچسپی کی وجہ سے طلبا اپنی تعلیم کی طرف کما حقہ توجہ مرکوز نہیں کر پاتے، کیوں کہ ان کے اندر باز پرس کا کچھ خوف ہی نہیں

ہوتا اور نہ جواب دہی کا کوئی ڈر ہوتا ہے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ گھر والوں کو ان سب کے بارے میں کیا پتا، اور یہ طلبا جیسے تیسے کر کے کسی طرح سے امتحان پاس کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر صلاحیت و قابلیت کا فقدان ہوتا ہے اور نتیجتاً انہیں نوکری ملنا دشوار ہو جاتا ہے، جس سے معاشرے میں غلط پیغام جاتا ہے اور لوگ کہتے ہیں زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ دیکھو فلاں کا لڑکا اتنا پڑھنے کے باوجود بھی در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے اور نوکری نہیں مل رہی ہے، کوئی بھی شخص اس بات پر غور نہیں کرے گا کہ اتنا پڑھنے کے بعد بھی اس کے اندر کتنی صلاحیت ہے، آخر کیوں اسے نوکری نہیں مل رہی ہے، اس بات پر غور کرنے کے بجائے لوگ پڑھائی ترک کر کے کمانے کے لیے قائل کرنے کی خاطر سیدھے یہی کہیں گے کہ پڑھنے سے کیا فائدہ آخر پھر بعد میں اپنا ہی کام کرنا ہے تو پھر ابھی سے کیوں نہیں اور یہی سوچ اس معاشرے کو اندھیرے میں ڈھکیل رہی ہے۔

کچھ طلبا اپنے کورس کے تئیں یہ سوچتے ہیں کہ ان کے کورس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اگر وہ فلاں کورس کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا، ان کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہر میدان، ہر شعبے کے ماہر و نسبتاً باصلاحیت لوگوں کو منتخب کر لیا جاتا ہے اور ان کے لیے روزگار اور جاب زیادہ مسئلہ نہیں ہوتی ہے، اس بات کے پیش نظر ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ چاہے جس شعبے میں ہم رہیں اتنی محنت سے پڑھیں کہ ہمارا شمار ماہرین اور باصلاحیت لوگوں میں ہو اور پھر اچھا مقام حاصل کر کے اپنے معاشرے کو ایک مثبت پیغام دیں تاکہ دوسرے گارجین کو ترغیب ملے اور وہ لوگ بھی اپنے بچوں کو پڑھانے اور تعلیم دینے کے لیے سینہ سپر ہوں۔ مگر اس ذیل میں سب سے پہلی ذمے داری ہمارے والدین اور گارجین کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا داخلہ کرا کے ایسے ہی نہ چھوڑ دیں بلکہ ان میں اور ان کی تعلیم میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہیں اور ساتھ ہی ان کی رہنمائی بھی کرتے رہیں تاکہ وہ بھٹکنے نہ پائیں، اور طلبا بھی پوری ایمانداری کے ساتھ محنت و لگن سے پڑھائی کریں اور اپنی ذمے داری کا حق ادا کر کے یہ ثابت کر دیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کوئی نااہل نہیں ہوتا ہے، اس طرح سے ہم اپنے معاشرے کی تعلیمی پسماندگی دور کر تعلیم کی روشنی سے پوری دنیا کو راستہ دکھا سکتے ہیں۔

نغمہ تبسّم ۔ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ہندوستان میں تعلیمِ نسواں: ایک جائزہ!!!

ہر قوم کی تعمیر و ترقی کا انحصار اس کی تعلیم پر ہوتا ہے۔ تعلیم کی روشنی نہ صرف قوم کے احساس و شعور کو نکھارتی ہے بلکہ انھیں صحیح راستہ دکھانے اور بہتر زندگی عطا کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ آج تعلیم کے بغیر انسان چاہے مرد ہو یا عورت ادھورا ہے۔ وہ حقیقتاً نہ خود شناس ہے اور نہ خدا شناس۔ تعلیم اللہ تبارک و تعالیٰ کی عطا کی ہوئی وہ دولت ہے جس کے زیور سے انسان جب آراستہ ہوتا ہے تو وہ واقعی انسان ہوتا ہے اور اس کی زندگی نہ صرف کامیاب اور خوشگوار ہوتی بلکہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں ہی سنورتی ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ کسی بھی قوم میں ہمیشہ ہی سے باکردار، باصلاحیت اور روشن خیال شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جنھوں نے ایسے خیالات و تصورات کو تشکیل دیا جس کے زیرِ اثر ایک صالح معاشرہ وجود میں آیا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس جہانِ فانی میں بنی نوع کا وجود دو صنف یعنی مرد اور عورت سے مل کر ہوا ہے جیسا کہ اسلام نے دنیا کو بتایا ہے کہ اس کائنات میں جس طرح مرد اپنا وجود رکھتا ہے اسی طرح عورت کی تخلیق بھی ایک غائیت ہے اور معاشرے کی تشکیل صرف مرد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عورت بھی اس میں برابر کی حقدار ہے۔

عورت کو اللہ رب العزت نے اس کائنات میں ایک شاہکار اور دلکش وجود کی حیثیت بخشی ہے جس کے دم خم سے زندگی قائم ہے۔ عورت کے بغیر نسلِ انسانی کا استحکام اور نشو نما ناممکن ہے۔ لہٰذا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کو مجموعی طور پر دین سے روشناس کرانے اسے تہذیب و ثقافت سے مزین کرنے، قوم کے نونہالوں کی صحیح و صالح تربیت میں ان کی ماؤں کا اہم رول ہوتا ہے۔ اس لیے ماں کی گود بچے کی اولین درسگاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے افرینش ہی سے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو

بھی ضروری قرار دیا گیا کیونکہ طبقہ نسواں معاشرے کا نصف حصّہ ہے اور اس کی تعلیم و تربیت معاشرے کی صلاح وفلاح کے لیے از بس ضروری اور ناگزیر ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں راقمۃ الحروف کی ہندوستانی تناظر میں مختلف ادوار و اقوام میں تعلیم نسواں کی کیا صورتِ حالی رہی اس پر گفتگو مقصود ہے تا کہ ہندوستان میں خواتین کی تعلیمی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

ہندوستان ہمیشہ ہی سے علم و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس ملک کی سب سے اہم خوبی کثرت میں وحدت ہے۔ اس نے مختلف زبانوں، مذاہب اور تہذیبوں کو اپنے آغوش میں جگہ دے کر گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہوئے تاریخ انسانیت کو ایک نئی معنویت سے آشنا کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ویدک تہذیب کو سب سے قدیم تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس تہذیب کے لوگ ماں سرسوتی کی وندنا کرتے ہوئے سرسوتی کو علم کی دیوی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دور کے عورتوں کی معاشرتی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر راحت ابرار قمطراز ہیں:

''ویدک دور میں عورتوں کا سماجی مرتبہ بہت بلند تھا۔ زندگی کے تمام میدانوں میں انھیں مردوں کی طرح برابری کا حق حاصل تھا مگر لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو زیادہ فوقیت حاصل تھی۔'' (مسلم تعلیم نسواں کے سو سال، ڈاکٹر ابرار راحت، صفحہ نمبر 101)

ہندوستانی تہذیب میں ہندوؤں کی مقدس کتاب اتھروید کو خاص اہمیت حاصل ہے جس میں اس بات کی تعلیم دی جاتی تھی کہ عورت تبھی ایک کامیاب زندگی بسر کر سکتی ہے جب کی طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ پوری طرح تربیت یافتہ ہو۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض مذاہب کی طرح ہندو مذہب بھی ابتدا ہی سے عورتوں کی تعلیم و تربیت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس دور میں عورتوں کو نہ صرف مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنے کی آزادی تھی بلکہ چند ایسی خواتین کی مثالیں بھی ملتی ہیں جنھیں نہ صرف ویدک ادب پر پوری طرح دسترس حاصل تھی بلکہ وہ مذہبی مباحثوں میں حصّہ لینے کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتی تھیں۔ اس بات کے شواہد ہمیں رگ وید کے مجموعے میں شامل بیس مختلف شاعرات کی دعاؤں کی

صورت میں ملتے ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ویدک دور کی عورتیں بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھیں ہیں جن میں وسوارا، سِکتا، نیواوری، گھوشا، رومسا، اَپالا، اُروسی، لُوپا ،مُدرا وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ میتری، پراتھیسٹی اور گارکی کے نام بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے علمی دنیا میں اپنی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس دور میں آشرم میں مخلوط تعلیم کا بھی انتظام تھا جس کے تحت بہت سی لڑکیاں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرتیں تھیں۔

ویدک دور میں چوتھی صدی کے آنے تک تعلیم نسواں میں تھوڑی گراوٹ آئی اور تعلیم محض اعلیٰ ذات کے ہندوؤں تک محدود کر دی گئی نتیجتاً نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد بطور خاص لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول پر پابندی عائد کر دی گئی۔ انھیں صرف یہاں تک اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے خاندان ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کی انھیں اجازت نہیں تھی۔ ویدک دور کے آخری ایام میں رفتہ رفتہ عورتوں کی تعلیم کا رواج کم ہونے لگا جس کے زیرِ اثر ان کی تہذیبی و معاشرتی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور مذہب ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری کے طور پر پروان چڑھنے لگا جو آگے چل کر برہمنی نظام کے طور پر متعارف ہوا اور اس برہمنی نظام کے خلاف بودھ مذہب ایک تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ س نے نہ صرف براہِ راست تعلیم نسواں کو آگے بڑھایا بلکہ جنس کی بنیاد پر روا رکھے جانے والے امتیازات کو بھی ختم کیا جس کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ ایک بار پھر مساوی سلوک کیا جانے لگا۔ لہٰذا بودھ مذہب کے اس دور میں عورتوں نے علوم وفنون اور دیگر شعبۂ ہائے زندگی میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئیں۔ لیکن ڈاکٹر اے۔ ایس الٹیکر اس دور میں بودھ تحریک کے زیرِ اثر تعلیم نسواں کو کمزور قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''شروع کے زمانے میں بدھ مت کی تحریک نے بلواسطہ طور پر تعلیم نسواں کو آگے بڑھایا اور بہت سی راہبہ شاعرات پیدا کیں۔ مگر اس دور میں ہمیں قطعی طور پر کسی عالم راہبہ سے واسطہ نہیں پڑتا ہے۔ راہباؤں کی خانقاہیں چوتھی صدی میں ختم ہو چکی تھیں۔۔۔ یہ بات

قابل توجہ ہے کہ جدید لنکا اور برما میں جس طرح خانقاہیں لڑکوں کو تعلیم دیتی تھیں لڑکیوں کو تعلیم نہیں دیتی ہیں۔لہٰذا ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ تعلیم نسواں اس دور میں کمزور ہورہی تھی۔
(قدیم ہندوستان میں تعلیم،ڈاکٹر اے۔ایس الٹیکر ،مترجم ابو یوسف،صفحہ نمبر 218)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں بودھ تحریک کے زیرِ اثر عورتوں کے ساتھ مساوی سلوک تو کیا جانے لگا لیکن اس تحریک نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے میں کوئی خاص رول ادانہیں کیا۔باوجود اس کے اس عہد میں چند ایسی خواتین کی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جنھوں نے اپنے سماجی وسیاسی اور معاشی و تعلیمی حقوق کی حصولیابی کے لیے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر راحت ابرار قمطراز ہیں:

''مہابھارت کے زمانے کی چیترا شاید وہ پہلی عورت تھی جس نے اپنی آزادی اور اختیارات کو مطابات کی صورت میں مردوں کے سامنے پیش کیا۔اپنیشد عہد کی گارگی علم و دانش میں اس وقت کے مردوں سے بھی آگے تھی۔سمراٹ اشوک کی بیٹی سنگھ مترا پہلی مبلغ خاتون تھیں جنھوں نے بودھ مت کی تعلیمات کی اشاعت کی غرض سے خشکی اور سمندر کا سفر طے کرکے شری لنکا تک گئی۔جین مت کے 24 گرومانے گئے ہیں ویدیا کی راجکماری ملّی ان میں سے ایک تھی ریاضی داں بھاسکرآچاریہ کی بیٹی لیلاوتی اپنے باپ کو تحقیقی کاموں میں مدد دیتی تھی۔''
(مسلم تعلیم نسواں کے سوسال،ڈاکٹر راحت ابرار،صفحہ نمبر 102)

مذکورہ بالا امور و اقتباس کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ویدک دور میں بھلے ہی تعلیم نسواں کا کوئی منظّم و مستقل انتظام نہیں تھا یا بودھ تحریک نے اس کو پروان چڑھانے میں کوئی خاص رول ادانہیں کیا لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہاں کی عورتوں کی تعلیم کے مختلف شعبے میں مہارت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس عہد میں بھی تعلیم نسواں کسی نہ کسی صورت میں رائج تھی۔جس کے زیرِ اثر اس دور کی خواتین اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے میں موثر کردار ادا کرنے میں پیش پیش تھیں۔
جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ ہندوستان ایک گنگا جمنی تہذیب والا ملک ہے۔لہٰذا

جب مسلمانوں کی اس ملک میں آمد ہوئی تو وہ اپنے علمی سرمائے کو بھی ساتھ لائے اور ہندو مسلم تہذیب کے میل جول اور باہمی اشتراک سے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ حاصل ہوا اور ہندوستان علم وتہذیب کا گہوارہ بن گیا۔ یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اسلام میں بھی تعلیم پر کافی زور دیا گیا ہے اور جہاں بھی علم کی طرف راغب کیا گیا ہے وہاں مرداور خواتین کے درمیان کسی تفریق کے بغیر دونوں ہی کو یکساں طور سے اس کی جانب ترغیب دی گئی ہے۔ معروف روایت ہے ''کہ علم حاصل کرنا ہر مرداور عورت پر فرض ہے۔'' مولانا مودودی عورتوں کے تعلیم سے متعلق اسلام کے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''عورتوں کو دینی اور دینوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ ان کی تعلیم وتربیت اسی قدر ضروری قرار دیا گیا جس قدر مرد کی تعلیم وتربیت ضروری ہے۔ نبی ﷺ سے دین واخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی حاصل کرتیں تھیں۔ آپؐ نے ان کے لیے اوقات متعین فرما دیئے تھے۔ جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپؐ کی ازواج مطہرات اور خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں کی بلکہ مردوں کی بھی معلّمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ تابعین ان سے حدیث تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو درکنار نبی ﷺ نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سیکھانے کا حکم دیا تھا۔'' (پردہ، مولانا مودودی، صفحہ نمبر 9-210)

چنانچہ عہد وسطیٰ کا ہندوستان بھی اس بات سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ مسلم معاشرے میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کا ہمیشہ ہی سے نظم رہا ہے۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے تو یہ عموماً شہزادیوں اور امراء واعلیٰ عہدیداروں کی صاحبزادیوں تک ہی محدود تھی کیونکہ اس عہد میں تعلیم نسواں کے حوالے سے اب تک جتنے بھی مواد دستیاب ہوئے ہیں وہ اسی خاص طبقے کی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عام لڑکیاں اعلیٰ تعلیم میں کس حد تک داخلہ لیتی تھیں اس کے قطعی قرائن ناپید ہیں۔ البتہ کچھ نامور خواتین کے نام میں یہاں ضرور پیش کروں گی جنھوں نے اپنی علمی دانشمندی سے ہندوستانی تاریخ میں اپنا پرچم بلند کرنے میں اہم

رول ادا کیا۔ جن میں شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ جنھیں ملکۂ ہند کے خطاب سے نوازا گیا۔ دوسرا نام چاند بی بی کا ہے جس کی جرات وہمت کے افسانے پورے ہندوستان کی تاریخ میں قابلِ فخر ہیں۔ یہ بیک وقت عربی، فارسی، تیلگو، تمل اور مراٹھی زبانوں پر عبور رکھتی تھیں۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ مغل بادشاہوں نے تعلیم نسواں کے ضمن میں غیر معمولی دلچسپی لینی شروع کی۔ جس کے زیرِ اثر اکبر نے فتح پور سیکری میں لڑکیوں کی تعلیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علاحدہ جگہیں مختص کیں اور کچھ استانیوں کو درس وتدریس کے پیشے کے لیے مقرر کیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ اورنگ زیب جنھیں زندہ پیر کے نام سے جانا جاتا ہے انھوں نے بھی مذہبی ہدایات کے پیشِ نظر تعلیم پر زور دیا اور تعلیم نسواں کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ مغلیہ دور کی اہم تعلیم یافتہ خواتین میں گلبدن بیگم جنھوں نے جلال الدین محمد اکبر کی فرمائش پر ہمایوں نامہ تصنیف کیا، نور جہاں بیگم، ممتاز محل، جہاں آرا بیگم اور زینب النساء وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جب انگریز ہندوستان آئے اور ایک فاتح قوم کی صورت میں ملک کے تمام شعبوں پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو دھیرے دھیرے انھوں نے تعلیم سے بھی اپنا رشتہ جوڑا۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی تعلیمی ڈھانچے میں متعدد نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے تحت لڑکیوں کے اسکول کی بات کریں تو 1811ء میں کلکتہ میں پہلا اسکول قائم کیا گیا۔ اس کے بعد پے در پے متعدد گرلس اسکول کا قیام عمل میں لایا گیا اور تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لیے کئی انگریز خواتین ہندوستان آئیں جن میں میری این کوک، میری کارپینٹر اور صفیہ ڈوبسن کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے اور ایشور چند ودیا ساگر کا شمار اصلاح قوم کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ جو معاشرے کی بہتری کے لیے کوشاں تھے کیونکہ اس وقت ہندو معاشرے میں خواتین کے تعلق سے دو بڑے مسائل درپیش تھے۔ ایک کم عمری میں شادی اور دوسرا بیواؤں کو دوسری شادی کی اجازت نہ دینا۔ ان اصلاح قوم نے ان دونوں مسائل کے حل کے لیے کئی بار سرکار سے رجوع کیا لیکن ان کو کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ لہٰذا راجہ رام

موہن رائے نے محسوس کیا کہ محض قانون بنانا مسئلے کا حل نہیں، اس کا سب سے بڑا حل لڑکیوں کو تعلیم کے لیے بیدار کرنا اور تعلیم نسواں کو فروغ دینا ہے کیونکہ ان کا تصور تھا کہ اصلاح کی تمام کوششیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتیں جب تک کہ خواتین تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ لہٰذا ان کی کاوشوں اور اس تحریک کے زیرِ اثر 1858-1857ء کے دوران لڑکیوں کے تقریباً 35 اسکول تعمیر کئے گئے جو آگے چل کر کالج کی شکل اختیار کر گئے۔

1857ء میں پہلی بار کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں یونیورسیٹیاں قائم کی گئیں لیکن اس وقت عورتوں کو ان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اجازت نہیں تھی۔ مگر رفتہ رفتہ تعلیم نسواں کی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کے رجحان نے ایک امید کی کرن دکھائی اور 1870ء میں ہندوستان میں مس میری کارپینٹر کی کوششوں کے نتیجے میں خواتین کا پہلا Teachers Training School قائم کیا گیا اور پھر 1877ء میں پہلی بار خواتین امیدوار کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت بھی دی گئی۔

ان تمام کوششوں کے باوجود اگر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دوران تعلیم نسواں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو خواتین کی خواندگی کی شرح میں اضافہ کی بجائے کمی نظر آتی ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ عیسائی مشنری اسکولوں کے بارے میں ہندو مسلم ہمیشہ شک وشبہ کا شکار رہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کا ماننا تھا کہ یہ لوگ اپنی تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان طبقوں نے اپنی قوم کو بڑی حد تک انگریزی تعلیم سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ جس کے سبب انیسویں صدی کے شروع میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد میں کمی واقع ہونے لگی۔ لیکن جب لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر کیے گئے تو انھوں نے برٹش پالیسی میں ایک خوش آئند تبدیلی کی اور کہا کہ ہندوستان کے رسم ورواج میں تبدیلی نہیں کی جائے گی اور جو لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں انھیں حکومت کی طرف سے امداد فراہم کی جائے گی اور ان احکامات کو 1854ء میں منظوری بھی مل گئی۔ اس کے بعد لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مختلف

بڑے شہروں میں متعدد تعلیمی دانسگا ہیں وجود میں آئیں ۔1882ء میں قائم شدہ انڈین ایجوکیشنل کمیشن (ولیم ہنٹر) نے تعلیم نسواں کے لیے اسکول، ہاسٹل اوراشکالرشپ سے متعلق شفارشات پیش کیں ۔لہٰذاان شفارشات کی روشنی میں مختلف علاقوں میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیااوراس سلسلے میں مہاراشٹر، بنگال حیدرآباد، بھوپال اورعلی گڑھ نے ابتداً پیش رفت کی ۔اس کے بعد پورے ہندوستان میں تعلیم نسواں کے حصولیابی کومدِ نظر رکھتے ہوئے پرائمری اسکول،سکنڈری اسکول اور کالج وغیرہ تعمیر کیے گئے ۔

سیاسی اصطلاحات اور آزادی کے لیے ضروری تھا کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی حق رائے دہندگی دیا جائے چنانچہ 1926ء میں پہلی بار ہندوستانی خواتین کو ووٹ دینے اور 1931ء میں انتخابات میں حصّہ لینے کا حق حاصل ہوا ۔جس کے زیرِ اثر خواتین تحریک آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگیں ۔ 1931ء میں کراچی میں منعقد انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں عورتوں کومتعدد بنیادی حقوق دیئے گئے اور یہ اعلان کیا گیا کہ اب عورتوں کے ساتھ جنس کی بنیاد پر کوئی تخصیص نہیں برتی جائے گی ۔اس طرح لڑکیوں کے تعلیمی نصاب میں تبدیلیاں ہونے لگیں ۔نئے طرز کے کالج کا قیام عمل میں لایا جانے لگااور 1932ء میں نئی دہلی میں لیڈی ارون ہوم سائنس کالج قائم ہوا ۔لڑکیوں کوبھی قانون ،میڈیسن ،کامرس ،انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی تعلیم کے مواقع فراہم کیے جانے لگے ۔بقول راحت ابرار:

’’آزادی سے قبل ہی ہندوستان کی مسلم خواتین کی حالت میں تبدیلیاں آنا شروع ہوگئی تھیں ۔ مشہور سماجی مصلح جیسے سید احمد خاں جنھوں نے 1875ء میں علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیااور خواتین جیسے آمنہ طیب جی اور شیخ محمد عبداللہ کی بیگم نے ایک سے زیادہ شادیوں کی مخالفت کی اور تعلیم نسواں کوفروغ دیا ۔(مسلم تعلیم نسواں کے سو سال ،ڈاکٹر راحت ابرار،صفحہ نمبر 128)

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان کے آئین میں تمام شہریوں سے مساوی سلوک

کرنے کی ضامنت دی گئی اور دفعہ 45 کے تحت 6 سے 14 سال کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم مہیا کرانے کا تہیا بھی کیا گیا جس کے نتیجے میں آزادی کے بعد سے تعلیم نسواں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جس کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں مختلف کمیشن نے نمایاں کردار ادا کیا جن میں پلاننگ کمیشن ، رادھا کرشنن کمیشن ،سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن نیشنل کمیٹی آن ویمینز ایجوکیشن کی سفارشات اور کاوشوں کے نتیجے میں لڑکیوں کے تعلیمی اندراج کو آج ہزاروں کی بجائے لاکھوں کی تعداد پر پہنچانے میں ان کمیشن کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔سروشکھشا ابھیان کے تحت لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان تعلیمی خلیج کو مٹایا جا سکے۔ نیز عورتوں کو تعلیم کے لیے بیدار کرنے ،انھیں باعزت زندگی بسر کرنے اور معاشرے میں مساوی مقام و مرتبہ دلانے میں ہمارے مصلح قوم کی خدمات بھی قابلِ تحسین ہیں جن میں سر سید احمد خاں ، راجہ رام موہن رائے ،سوامی وویکانند ،نظام حیدرآباد ،جسٹس بدرالدین طیب جی ،جسٹس کرامت حسین اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔دورِ حاضر میں اس وقت کئی ایسی یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں جو صرف لڑکیوں کی ہی تعلیم کے لیے مخصوص ہیں جو تعلیم نسواں کو فروغ دینے میں اپنا موثر کردار ادا کر رہی ہیں ۔تا کی ایک صالح معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکے اور نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت اور ان کے کردار سازی میں عالمانہ رول ادا کیا جا سکے۔

علاوہ ازیں عصر حاضر کے اس ترقی یافتہ دور میں چلمن کے پیچھے رہنے والی صنف نازک جس کے ساتھ ہر دور میں جنس و تعلیم کی بنیاد پر تخصیص کی گئی ۔لیکن آج وہی عورت تعلیم کے میدان میں اتنی آگے نکل چکی ہیں کہ اپنی گھریلو ذمہداریوں کو پورا کرنے کے بعد اپنے ذوق ور جحان کے لحاظ سے ادبی اور اصلاحی کاموں میں پیش پیش رہنے کے ساتھ ساتھ شاعر ،ادیبہ ،عالم ،مورخ ،محقق ،پروفیسر اور انجینئر جیسے مختلف عہدوں پر فائز ہو کر نہ صرف معاشرے کی ترقی میں موثر کردار ادا کر رہی ہیں بلکہ اپنی تعلیمی کاوشوں محنت اور لگن کی بدولت چاند پر پہنچنے کا دعویٰ بھی کر چکی ہے۔

نورافشاں پروین۔ایم فیل۔یونیورسٹی آف حیدرآباد

فروغ تعلیم میں مدارس کا کردار

مدارس عربیہ کی حیثیت دینی قلعہ کی سی ہے،جو ہمارے دین وایمان ،ہماری تہذیب وثقافت اور اخلاق معاشرت کی نگہداشت کرتے ہیں،جہاں نونہالان ملت اپنے مقصدحیات سے آگاہ ہوتے ہیں اور جہاں صحیح خطوط پران کی علمی وعملی تربیت ہوتی ہے۔

یہ مدارس فرد کے فکر ونظر کو درست سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور ملک وملت کی تعمیر میں نمایاں اور مثبت کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ ہمیشہ ان مدارس کے قیام کا یہی نصب العین رہا ہے۔مدارس کی اہمیت اور حیثیت کی وجہ سے ملت کے درمندں نے شدت سے محسوس کیا اور اس برصغیر میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے بہت سے مدارس قائم کئے اوران مدارس عربیہ سے ملت الاسلامیہ ہندکوایک نئی زندگی اورنئی توانائی ملتی ہے۔یہ اس کی بلنداور پاکیزہ اقداروروایات کے امین اور محافظ ہیں ۔یہ مردم گری اور افرادسازی کے ایسے کارنامے ہیں جوملت کو برابر کرداراور بلندسیرت علما،ذی علم اورصاحب بصیرت ائمہ سے مالا مال کرتے رہیں گےاور یہ اسے کبھی قحط الرجال کے جان لیوامرض سے دوچارنہیں ہونے دیں گے۔بلاشبہ جن محسنین نے یہ دینی اورعربی مدارس قائم کئے ہیں،ان کی یہی آرزوئیں اوریہی تمنائیں ہیں۔

مگر کیایہ تمنائیں پوری ہوتی ہیں؟ کیاان مدارس نے وہ توقعات پوری کیں،جوان سے وابستہ ہیں؟ کیاان مدارس نے ملک وملت کی تعمیر میں وہ رول ادا کیا،جوان سے مطلوب ہے؟

بڑے رنج وافسوس اوراحساس ندامت کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ایسانہیں ہوا۔

ان مدارس سے جو کچھ ہوا،وہ بس اتنا ہے کہ دینی اورشرعی وضع قطع کی کچھ صورتیں بازاروں میں چلتی پھرتی نظرآتی رہیں،علمی،دینی اوراخلاقی موضوعات پرکچھ کتابیں چھپتی چھپاتی رہیں۔کبھی کبھی تحفظ دین اور تحفظ شریعت کے نام پر کچھ مظاہرے اور جلسے جلوس ہوتے

رہے۔مساجد کے لئے کچھ امام، مدارس کے لئے کچھ مدرسین اور مجالس کے لئے کچھ واعظین تیار ہوتے رہے۔البتہ وہ اصل کام جس کے لئے مدارس وجود میں آئے تھے، وہ کام نہیں ہوا ان مدارس سے ایسے حوصلہ مند مبلغین نہیں نکلے، جو صنم کدوں میں توحید کی اذاں دیتے اور باطل کا خود اس کے گھر میں تعاقب کرنے کا جذبہ بڑے تاب رکھتے ہوں۔ان مدارس سے ایسے قائدین نہیں نکلے جو اس شکستہ و پراگندہ امت کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو سکتے ہوں اور اس کے اندر اپنے مقام و منصب کا شعور پیدا کر کے اسے باطل طاقتوں سے ٹکرا سکتے ہوں۔

یہ صورت حال ہمیں دعوت دیتی ہے کہ ہم تمام ارباب مدارس پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنی ناکامی کا اعتراف کریں اور نہایت سنجیدگی سے غور کریں کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں جو ہماری راہ کا روڑا ثابت ہوئے؟ آخر وہ کیا موانع ہیں، جن کی وجہ سے ہمارے دینی مدارس مردم گری اور کردار سازی کے سلسلے میں اپنا واجبی رول یا اپنا متوقع کردار ادا کرنے میں ناکام رہے؟

یقیناً ہم میں سے بہت سے لوگوں نے معاملے کے اس پہلو پر غور کیا ہوگا اور ان اسباب و موانع کا سراغ لگایا ہوگا۔ہم نے بھی اس مسئلے پر غور کیا اور طویل غور و خوض کے نتیجے میں ناکامی کے جن اسباب تک ہم پہنچ سکے ہیں۔وہ آپ کے سامنے پیش ہیں۔

ان مدارس کی ناکامی کا سب سے پہلا اور بنیادی سبب خود وہ نظام تعلیم ہے، جو ان مدارس میں رائج ہے۔پہلی چیز جو بلا استثناء تمام عربی درسگاہوں میں پائی جاتی ہے اور قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ان درسگاہوں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے، اس میں نہ زمانے کی رعایت کی جاتی ہے اور نہ طلباء کے احوال و معیار کی۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں وقت تو زیادہ صرف ہوتا ہے اور حاصل کم ہوتا ہے۔وہ نصاب یا تو ایسے فنون پر مشتمل ہوتا ہے، جن کا دور گزر چکا اور یا پھر ایسی کتابوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو پڑھنے اور پڑھانے والوں کو بور کر دیتی ہیں۔تعلیم و تدریس کا اہم طریقہ یہ ہے کہ نصاب میں وہ کتابیں رکھی جائیں جو زبان و اسلوب کے لحاظ سے آسان ہو، واضح اور قریب الفہم ہوں، طلبہ کو ان کے اندر دلچسپی محسوس ہو۔ان سے بوریت اور گھبراہٹ نہ ہو۔

ہماری درسگاہوں کی ناکامی کا دوسرا اہم اور بنیادی سبب طلبہ کی اخلاقی تربیت سے مکمل غفلت ہے یا وہ بے روح نظام تربیت ہے، جو آج بہت سی درسگاہوں میں رائج

ہے۔آج کتنے ہی مدارس اور کتنی درسگاہیں ایسی ہیں جہاں خالص دین وشریعت کی تعلیم ہوتی ہے،لیکن وہاں طلبہ کی اخلاقی وروحانی تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔طلبہ بالکل بے قید اور آزاد ہوتے ہیں۔کوئی انہیں یہ بتلانے والا نہیں ہوتا کہ انہیں کس طرح رہنا چاہئے۔کس طرح اپنے شب وروز گزارنے چاہئیں۔ان کی زندگی کا سب سے اہم مقصد کیا ہے؟ اور اس اہم تر اور عظیم تر مقصد کے لئے انہیں کس طرح اور کیا تیاریاں کرنی چاہئیں؟

یہی وجہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام آج بری طرح ناکام ہے اور ہماری درس گاہیں ایسی شخصیتیں تیار کرنے سے عاجز ہیں، جو نہ صرف اس ملت بلکہ پوری انسانیت کے درد کا درماں ثابت ہوسکیں۔آج ضرورت ہے کہ ایسا نظام تعلیم رائج کیا جائے،جس پر مکمل طور سے قرآن پاک کی گرفت ہو یعنی ہمارے یہاں جتنے بھی علوم پڑھائے جائیں وہ قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوں۔ یا قرآن وحدیث کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ہمارے یہاں کتب حدیث پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں،ہمارے یہاں فقہ پڑھائی جائے تو وہ قرآن پاک کی روشنی میں۔یہاں اگر علم سیاست پڑھایا جائے تو وہ بھی قرآن پاک کی روشنی میں ،اس لئے کہ یہ تمام علوم قرآن پاک سے ماخوذ ہیں۔

ملت اسلامیہ ہند کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔سب سے پہلا اور بنیادی کام یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا تعلیمی سروے کیا جائے کہ مسلمانوں میں خواندگی کا تناسب کیا ہے؟

مردوں عورتوں میں دیہی علاقوں اور شہری علاقوں میں اس کا تناسب کیا ہے؟ ناخواندگی کے اسباب کیا ہیں؟ ناخواندگی بالغوں اور نوجوانوں کی ضروریات کیا ہیں؟ عورتوں میں ناخواندگی کے اسباب کیا ہیں؟ تحصیل علم کی راہ میں کیا کیا روکاوٹیں ہیں؟ اس طرح کا وسیع سروے وقت کی اہم ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس اس کام میں نہایت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔اگر یہ اپنے اپنے مقام یا اپنی درسگاہ کے آس پاس کی بستیوں کی تعلیمی سروے کریں تو ان علاقوں کی پسماندگی اور جہالت کو دور کرنے کے لئے لائحہ عمل بنانے میں بڑی آسانی ہوگی۔ملک وملت کی تعمیر میں دینی مدارس کا یہ کارنامہ تاریخ کا جزبن جائے گا اور اسے کبھی فراموش نہ کیا جائے گا۔